جواہر شریعت

مجموعہ رسائل

جلدِ سوم

مؤلّف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : **جواہر شریعت** جلد سوم

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور

و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۶۱۴

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

جواہرِ شریعت (جلدِ سوم)
پر ایک اجمالی نظر

- ☆ حقوق القرآن
- ☆ اسلام میں عورت کا کردار
- ☆ شفاء القلوب
- ☆ تحفۃ السالک
- ☆ احکامِ شعبان وشبِ برأت - تحقیق کے آئینے میں
- ☆ دیوبندیت وبریلویت - دلائل کے آئینے میں
- ☆ منکراتِ رمضان
- ☆ نفحاتِ رمضان

فہرس

تحفۃ السالک

حقوق القرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اول

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم. اما بعد :

گذشتہ چند ماہ سے احقر کے مضامین کا ایک سلسلہ بنگلور کے کثیر الاشاعت و مؤقر اخبار ''روزنامہ سالار'' میں ہر بدھ کو جاری ہے جو دراصل خطبائے کرام کو خطبات جمعہ میں تعاون کے لیے محترم ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب زید لطفہ اور جناب محترم ابراہیم خلیل اللہ خان صاحب زیدت عنایتہٗ، کی تحریک و فرمائش پر شروع کیا گیا تھا اوراب تک الحمدللہ جاری ہے۔

انہی مضامین میں سے ایک مضمون ''قرآن مجید کے حقوق اور ہماری کوتاہیاں'' کے عنوان پر چار قسطوں میں شائع ہوا تھا، مضمون کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر خفیف ترمیمات اور معمولی اضافوں کے ساتھ الگ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔اورنام میں بھی لفظی ترمیم کرکے ''حقوق القرآن'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

مرشدی حضرت اقدس مولانا شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئی دامت برکاتہم کا خاص موضوع حقوقِ قرآن ہے۔ ہر جگہ حضرت والا اس پر توجہ دلاتے ہیں۔ گویا یہ میرا مضمون حضرت والا کے افادات وبسلسلۂ حقوق قرآن کی ایک شرح ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی حضرت کے افادات سے امت کو فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اوراس شرح کو بھی امت کے لئے مفید اور میرے لئے ذریعہ

وتقرب بنائے۔

میں عزیزی مولوی محسن صدیقی چامراج نگری کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے ان متفرق چار مضامین کی ترتیب کا کام بہ حسن وخوبی انجام دیا۔فقط

محمد شعیب اللہ خان
(مہتمم جامعہ مسیح العلوم بیدواڑی، بنگلور)
۲۱؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التمہید

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان کلام ہے، جو انسانوں کی ہدایت وراہ نمائی کے لئے نازل فرمایا گیا ہے، وہ ان کی ہدایت کا سامان بھی پیش کرتا ہے اور ہدایت کا پروگرام ونظام بھی بتاتا ہے۔اسی قرآن مجید کے ذریعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی جاہل ووحشی قوم کو دنیا کا ہادی ورہبر بنادیا۔ان میں کسی کو صدیقیت کے مقام پر اور کسی کو فاروقیت کے مقام پر فائز فرمایا۔کسی کو حیا سے ممتاز فرمایا، کسی کو قضا سے امتیاز بخشا۔غرض قرآن مجید ہمارا ہادی ورہبر ہے جو ہمیں دنیا میں جینے کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے اور آخرت میں کام یابی ونجات پانے کا بھی طریقہ بتاتا ہے۔

اس عظیم الشان خدا کی کتاب کا ہم پر کوئی حق بھی ہے یا نہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔قرآن مجید کے ہم پر کئی حق ہیں۔

عظمت قرآن

سب سے پہلا حق قرآن مجید کا یہ ہے کہ اس کی عظمت وبڑائی کا احساس ہو، اس لئے کہ یہ دراصل حضرت حق جل مجدہ کا کلام ہے اور کلام، اللہ کی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح قدیم ہے، ازلی ہے، ابدی ہے۔جس طرح اللہ کی ذات قابلِ تعظیم ہے، اسی طرح اس کی صفت بھی قابلِ تعظیم ہے، لہذا قرآن مجید کی عظمت بھی ضروری ہے۔

علما نے فرمایا ہے کہ اس پوری کائنات میں سوائے قرآن مجید کے کوئی چیز ایسی

نہیں جس کا تعلق بہ راہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہو، کیوں کہ جتنی چیزیں بھی اس دنیا میں ہیں حتیٰ کہ کعبۃ اللہ بھی وہ سب کی سب اللہ کی مخلوق ہیں؛ لیکن قرآن مجید اللہ کی مخلوق نہیں؛ بل کہ اللہ کی صفت ہے۔ مخلوق تو حادث وفانی ہوتی ہے؛ لیکن اللہ کی صفت ازلی وقدیم ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی جیسے اللہ کی ذات کبھی فنا نہ ہوگی۔

فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد رحمہ اللہ کا ابتلا

یہاں تاریخ کا ایک ورق سامنے آ گیا جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہارون رشید کا بیٹا مامون رشید تھا، اس کے دورِ خلافت میں ایک عظیم فتنہ نے قرآن مجید کی عظمت کو چیلنج کر دیا، جس کے جواب کے لیے علمائے حق پوری تندہی کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور ان علمائے حق کے سردار حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تھے۔ یہ فتنہ کیا تھا؟ اس زمانے میں ایک گم راہ فرقہ معتزلہ نے یہ کہا کہ قرآن مجید نعوذ باللہ مخلوق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عظمتِ قرآن کو چیلنج تھا۔ اس لئے علما اور خصوصاً امام احمد رحمہ اللہ نے کھل کر اس نظریہ کی تردید ومخالفت کی اور بتایا کہ قرآن مجید مخلوق نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفت مخلوق نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

معتزلی علما اس دور میں حکومت سے قرب وتعلق کی وجہ سے مامون رشد پر اپنا اثر ڈالنے لگے اور اس نے ان کی گم راہی کو قبول کر کے اسی گم راہ عقیدوں کو حکومت وطاقت کی بنیاد پر پھیلایا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ اس کو قبول کرو۔ علمائے حق کو سزائیں دی گئیں اور خصوصاً امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے لیے بہت بڑا ابتلا وآزمائش کا موقع تھا۔ آپ کو قید خانے کے حوالے کر دیا گیا اور روزانہ ستر ستر کوڑے پشت پر مارے جاتے تھے اور مجبور کیا جاتا تھا کہ قرآن کو مخلوق مان لو اور عوام میں اسی بات کا فتویٰ دو؛ مگر

آپ نے عظمتِ قرآن کی حفاظت کے لیے جان دینا گوارا کیا، قرآن کو مخلوق کہہ کر اس کی عظمت کو داغ دار کرنا گوارا نہ کیا۔ غرض یہ کہ قرآن مجید اللہ کی عظیم الشان صفت ہے جس کی عظمت کرنا فرض ہے۔

قولِ ثقیل کی تفسیر

اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ﴾ (المزمل: ۵)

(ہم ڈالنے والے ہیں تجھ پر ایک بات وزن دار)

اس سے مراد یہی قرآن مجید ہے اور وزنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہایت ہی عظمت والا کلام ہے جیسے ہم لوگ بھی کسی کی عمدہ اور اچھی بات کو سن کر کہتے ہیں کیا بھاری بات انھوں نے کہی ہے۔ یہاں بھاری سے مراد عظیم و عمدہ ہے۔ یہی معنی یہاں آیت میں ہیں۔

قرآن کی عظمت کا اثر مخلوقات پر

اور اسی عظمت و بھاری پن نے تمام مخلوقات کو قرآن کے سامنے عاجز کر دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں جیسی بڑی اور بھاری و عظیم مخلوقات پر پیش کیا تو وہ سب گھبرا گئے اور اس کو سنبھالنے سے عذر کر دیا۔ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے:

﴿ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡأَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَأَبَيۡنَ أَن يَّحۡمِلۡنَهَا وَأَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ﴾ (الأحزاب: ۷۲)

(یعنی ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر

کسی نے قبول نہ کیا، کہ اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھا لیا اس
کو انسان نے، یہ ہے بڑا بے ترس نادان)

اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ (الحشر: ۲۱)

(کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو تو دیکھتا کہ وہ
اللہ کی خشیت اور خوف سے دب گیا ہے اور پھٹ گیا ہے)

اللہ اکبر! پہاڑ کتنی عظیم اور ثقیل چیز ہے؛ مگر اس کے باوجود اللہ کے کلام کی عظمت
وثقل نے اس کو دب جانے اور پھٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

نزولِ قرآن کے موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت

قرآن کی عظمت وجلالت اور اس کی بڑائی وبزرگی کا اندازہ اس بات سے لگایئے
کہ حدیث میں آتا ہے کہ:

«قَالَتْ عَائِشَةُ رضي الله عنها وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ
الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا »(۱)

(حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول کو
دیکھا کہ سخت سردی کے دنوں میں آپ پر جب وحی نازل ہوتی تو وحی
کے ختم ہونے کے بعد آپ کی پیشانی پر سے پسینہ بہنے لگتا)

حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
جعرانہ مقام پر تھے، ایک صاحب نے عمرہ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ پر اسی

(۱) بخاری: ۱/۲، ترمذی: ۲/ ۲۰۵، نسائی: ۱/ ۱۴۹

دوران وحی نازل ہوئی آپ کو کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اشارہ کیا کہ آپ پر وحی نازل ہورہی ہے۔ میں نے کپڑے میں جھانک کر دیکھا تو آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور آپ خراٹے لے رہے تھے۔(۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ پر یہ کیفیت وحی کی شدت کی وجہ سے تھی۔

« عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ :كَانَ النَّبِیُّ اِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْیُ كُرِبَ لِذَالِکَ وَتَرَ بَّدَلَهُ وَجْهُهُ »(۲)

(حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ پر وحی نازل ہوتی تو اس کی وجہ سے آپ کو بوجھ معلوم ہوتا اور تکلیف معلوم ہوتی اور چہرے کا رنگ بدل جاتا۔)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ

« عَنْ زَيْدِبْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ قَالَ :كُنْتُ اِلٰی جَنْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَغَشِيَتْهُ السَّكِيْنَةُ فَوَقَعَتْ فَخِذُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلٰی فَخِذِیْ فَمَا وَجَدْتُ ثِقْلَ شَیْءٍ أَثْقَلَ مِنْ فَخِذِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم »(۳)

(حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو تھا کہ آپ کو(نزول وحی کے وقت)سکینہ نے ڈھانپ لیا،اور آپ کی ران مبارک میری ران پر پڑ گئی تو میں نے

(۱) مسلم:۱/۳۷۳

(۲) مسلم::۲/۶۵

(۳) ابوداود:۱/۳۳۹

محسوس کیا کہ اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ران سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہیں ہے)

غور کیجئے کہ اللہ کی وحی اور اللہ کا کلام کس قدر عظیم وثقیل چیز ہے کہ حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کی وجہ سے سخت سردی میں پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں اور آپ کا بدن مبارک اس کے وزن سے وزنی ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آپ کے وزن کو محسوس فرماتے ہیں۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور خراٹے جیسی آواز زبان مبارک سے نکلتی ہے۔

یہ ہے اللہ کا کلامِ اس کی عظمت و بڑائی کو دیکھو، اس کی شان وجلالت کا اندازہ کرو، اس کی بزرگی و بلندی کا احساس کرو۔

ہماری غفلت شعاری

اسی کے ساتھ ہماری غفلت شعاری کی طرف بھی ایک نظر کیجئے کہ ایسے عظیم کلام کی ہمارے دلوں میں کتنی عظمت پائی جاتی ہے۔ کیا آج ہم لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو اسکولوں کی تعلیم کو دیتے ہیں۔ عام حالت کے اعتبار سے اس کا جواب یہی ہے کہ نہیں۔ دیکھئے آج اسکولوں کی عصری تعلیم کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، اس کے لئے رشوت دے کر سیٹ لی جاتی ہے؛ مگر کیا قرآن پاک کی تعلیم کا بھی ایسا اور اتنا اہتمام ہم لوگ کرتے ہیں؟ بل کہ بعض تو نعوذ باللہ قرآن کی تعلیم کو فضول خیال کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں قرآن کی کوئی عظمت نہیں ہے۔ خیر ایسے تو بہت کم لوگ ہیں؛ مگر قرآن کی تعلیم کا اہتمام نہ کرنے والے تو لاکھوں کی تعداد میں ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیوی وعصری علوم کی جتنی اہمیت

لوگوں کو ہے قرآن کی اتنی نہیں ہے۔ لہذا قرآن کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کی تعلیم کی اہمیت اپنے دلوں میں پیدا کی جائے۔

عظمت قرآن کے تقاضے

بہ ہر حال ہمیں قرآن مجید کی عظمت کو محسوس کرنا چاہیے۔ یہ اس کا پہلا حق ہے اور اس حق کے کچھ تقاضے بھی ہیں جس کو پورا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی عظمت دل میں ہے۔ وہ تقاضے کیا ہیں۔ ایک تقاضا یہ ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس لیے کہ جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کو ماننا ایک فطری بات ہے۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانا عظمتِ قرآن کا لازمی تقاضا ہے۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیم خود بھی حاصل کی جائے اور اپنے بچوں اور ماتحتوں کو بھی اس کی تعلیم دی جائے۔ اسی طرح ایک تقاضا اس کا یہ ہے کہ قرآن مجید کا احترام کیا جائے، اس کی ادنیٰ سی بھی بے ادبی نہ کی جائے۔ ان تینوں تقاضوں کو ذرا تفصیل سے عرض کروں گا۔

عظمت قرآن کا پہلا تقاضا- ایمان بالقرآن

عظمت قرآن کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام سمجھا جائے اور یقین رکھا جائے کہ اس میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اور جو احکامات نازل کیے گئے ہیں وہ سب صداقت وحقانیت پر مبنی اور ہدایت پر مشتمل ہیں۔ اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی، خلاف واقعہ نہیں ہوسکتی اور کوئی حکم خلاف حکمت نہیں ہوسکتا۔

قرآن پر ایمان لانے کا حکم صاف طور پر قرآن میں دیا گیا ہے:

﴿ وَآمِنُوا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ (البَقَرَة :۴۱)

(جومیں نے نازل کیا ہے (قرآن) جوتمہارے پاس کی کتابوں (توریت، انجیل) کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ۔)

ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ (النساء: ۱۳۶)

(اے ایمان والوں! ایمان رکھو اللہ پر اور اسکے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے۔)

غرض یہ کہ قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان بھی نہیں ہوسکتا۔

دوسرا تقاضا-تعلیم القرآن

عظمت قرآن کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی فکر کی جائے اور اپنے بچوں اور ماتحتوں کو بھی تعلیمِ قرآن سے آراستہ کرے، کیوں کہ جب اس کی عظمت دل میں ہے اور اس کے نتیجہ میں قرآن پر ایمان بھی ہے کہ یہ ساری صداقتوں کا جامع اور تمام ہدایتوں کا منبع ہے اور یہ معلوم ہے کہ اس پر چلنے میں نجات مضمر ہے تو اس کے علوم کو جاننا اور اپنے بچوں کو بھی ان کی تعلیم دینا لازم ہوا۔ ورنہ یہ کیسی عظمت اور کیسا ایمان ہے کہ قرآن کو پڑھنا اور اس کے علوم کو جاننا نہیں چاہتا۔

اس لیے ہمیں قرآن کو سیکھنے اور اس کے احکام کو معلوم کرنے کی ترغیب وتاکید فرمائی گئی ہے۔

چناں چہ فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

«خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ »(۱)

(یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے)

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے:

«عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلِّمُوْا النَّاسَ فَاِنِّیْ مَقْبُوْضٌ هٰذَا.»(۲)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرائض (میراث کے مسائل) کا اور قرآن کا علم حاصل کرلو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیوں کہ میں دنیا سے جانے والا ہوں۔)

قرآنِ مجید و حدیث کا تلازم

اور قرآن کے ساتھ احادیث کا علم بھی ضروری ہے، کیوں کہ قرآن و حدیث میں تلازم اور حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

«أَلاَاِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَایُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانَ عَلٰی عَرِیْكَتِهٖ یَقُوْلُ عَلَیْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنَ فَمَاوَجَدْتُمْ فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَاوَجَدْتُمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ.وَاِنَّ مَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ » الخ (۳)

(۱) بخاری:۱/۷۵۲،ابو داود:۱/۲۰۵،ترمذی:۲/۱۱۹

(۲) ترمذی:۲/۲۹

(۳) ابو داود:۲/۶۳۲،ابن ماجہ:۳

(خبردار ہو کہ مجھے قرآن اور اس جیسی ایک اور چیز دی گئی ہے، خبردار ہو کہ عن قریب شکم سیر انسان اپنے تخت پر بیٹھے کہے گا کہ تم پر لازم ہے کہ قرآن کو پکڑلو، بس جو تم اس میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس کو اس میں حرام دیکھو اس کو حرام سمجھو۔ (اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) فرماتے ہیں کہ بلاشبہ اللہ کا رسول جس کو حرام قرار دے وہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر ایک اور چیز بھی نازل ہوئی، وہی حدیث وسنت کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر ایمان اور اس کی عظمت ومحبت بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسے قرآن کی عظمت ومحبت اور اس پر ایمان ضروری ہے۔

الغرض قرآن کے ساتھ حدیث کا علم حاصل کرنا بھی لازم ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس کو ضروری قرار دیا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے بھی کہ بغیر حدیث کے قرآن کا نہ فہم حاصل ہوسکتا ہے اور نہ اس پر عمل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ بہت سی آیات میں اجمال ہے، جس کی تفصیل حدیثوں میں آئی ہے اور بہت سی آیات میں ابہام ہے جس کا بیان حدیثوں میں ہے۔ اب حدیثوں کے بغیر ان آیات کو کس طرح سمجھا جاسکتا ہے اور کس طرح ان پر عمل کیا جاسکتا ہے؟

مثلاً قرآن میں نماز کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ مگر نماز کے ارکان، آداب، اس کی کیفیت وطریقہ، اس کی تعداد واوقات وغیرہ کا ذکر قرآن میں نہیں ہے؛ بل کہ احادیث میں ہے۔ تو نماز کا حکم بغیر حدیث کے کیسے سمجھا جائے گا اور کس طرح عمل میں لایا جائے گا؟

الغرض قرآن کے ساتھ حدیث کا علم بھی ضروری ہے اور یہ جس طرح اپنے لیے ضروری ہے اسی طرح اپنے ماتحتوں اور بچوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

دوزخ سے بچو اور بچاؤ

چنان چہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ (التحریم:٦)

(اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ مراد یہ کہ اپنے اہل وعیال کو دین کا علم سکھاؤ اور ادب کی تعلیم دو۔

بہ ہر حال یہ ضروری ہے کہ خود کو اور اپنے ماتحتوں کو علم دین سے آراستہ کیا جائے اور قرآن پاک اور حدیث شریف کا علم سیکھا اور سکھایا جائے۔ یہ بھی قرآن کی عظمت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

ایک ضروری بات پر تنبیہ

یہاں ایک ضروری بات کی طرف ذہن منتقل ہو گیا وہ یہ کہ قرآن وحدیث اور دین کا علم ماہر استادوں سے حاصل کرنا چاہیے۔ آج لوگ دین کا علم جاہلوں سے حاصل کرتے ہیں کس قدر حیرت وافسوس کا مقام ہے۔ کیا ہم ڈاکٹری کی یا انجینئری کی تعلیم کسی اناڑی سے حاصل کرتے ہیں؟ نہیں! تو پھر دین کی تعلیم کے لیے جاہلوں پر کیوں اکتفا کیا جاتا ہے؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی اور دین کی عظمت نہیں ہے۔ اگر عظمت ہوتی

تو اس کے لئے جاہلوں اور ناقصوں کو نہ چنا جاتا۔ پھر یہاں ایک اور بات بھی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سستا آدمی مل جائے اور سستا جو ہوگا وہ ایسا ہی ہوگا۔ حالاں کہ یہ لوگ دنیوی تعلیم کے لیے ہزاروں سے گذر کر لاکھوں بھی خرچ کر دیتے ہیں۔ صرف سیٹ حاصل کرنے کے لیے ہزاروں روپئے ڈونیشن دیتے ہیں؛ مگر علم دین کے لیے سستا آدمی تلاش کرتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے اور عظمتِ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کی عظمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے لیے سب کچھ قربان کر کے صحیح علم حاصل کیا جائے۔

عظمت قرآن کا ایک واقعہ

اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک بادشاہ کا لڑکا ایک استاذ کے پاس علم حاصل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ استاذ سے ملنے آئے اور قرآن کی تعلیم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور استاذ کو دس ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی دی۔ استاذ نے بادشاہ سے کہا یہ تو بہت ہیں ہم نے کیا ہی کیا ہے، جو اتنا بڑا انعام ملے؟ بادشاہ واپس ہو گئے اور جا کر حکم بھیجا کہ کل سے آپ میرے بچے کو تعلیم نہ دیں۔ استاذ حیرت میں پڑ گئے کہ کیا قصہ ہے۔ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ کیا خطا ہو گئی کہ آپ نے آپ کے صاحب زادے کو پڑھانے سے منع فرما دیا؟ بادشاہ نے کہا کہ جب آپ نے قرآن کی تعلیم کے مقابلہ میں دس ہزار اشرفیوں کو بھاری سمجھا تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ قرآن سے زیادہ اشرفیوں کے قائل ہیں اس لیے میں نے یہ حکم دیا۔

پہلے تو ایسے لوگ ہوتے تھے اور آج سب سے کم تن خواہ ان کی ہوتی ہے جو قرآن پڑھاتے ہیں اس لیے اچھا پڑھانے والے بھی میسر نہیں آتے اور جاہلوں سے پڑھنا پڑتا ہے، لہذا یہ بات قابلِ اصلاح ہے اس پر توجہ دینا چاہئے۔

قرآن مجید کا احترام کیجئے

عظمت قرآن کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ مثلاً قرآن کو نیچے رکھ دینا، اس کی بے حرمتی اور بے ادبی ہے۔ لہذا قرآن مجید کو نیچے نہ رکھا جائے یا مثال کے طور پر قرآنِ مجید کی طرف پیر کرنا بے ادبی و بے حرمتی ہے۔ لہذا اس سے بھی احتیاط کرنا چاہیئے۔ یہاں ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کی طرف حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ متوجہ فرمایا کرتے تھے، وہ یہ ہے کہ آج عام طور پر مساجد و مدارس اور گھروں سب جگہ پر قرآنِ مجید کو بغیر جزدان کے کھلے رکھنے کا رواج ہوگیا ہے، حالاں کہ چند سال قبل ہر جگہ پورے اہتمام واحترام سے قرآن کو جزدان میں رکھا جاتا تھا؛ مگر آج اس کو لوگوں نے تقریباً ختم کر دیا ہے، جو دلیل ہے اس کی کہ قرآن کا احترام اور عظمت کم ہونے لگی ہے۔ بزرگوں نے دو وجہ سے جزدان کا رواج ڈالا تھا، ایک یہ کہ دھول وغبار سے حفاظت ہو، دوسرے یہ کہ کبھی بے خبری میں ایسا نہ ہو کہ بے وضو کوئی قرآن مجید کو ہاتھ لگا دے۔

بہ ہر حال قرآن کی عظمت واحترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو جزدان میں رکھا جائے اور جہاں رکھا جائے وہاں نیچے بھی کوئی کپڑا ڈالا جائے۔

میرے شیخ حضرت اقدس شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مساجد میں امام کے لیے الگ مصلّیٰ ہوتا ہے؛ بل کہ بعض جگہ دو دو تین تین مصلّے ہوتے ہیں۔ یہ کیوں؟ امام کی عظمت کے لیے، اب سوچئے کہ امام کی عظمت زیادہ ہے یا قرآن کی؟ ہر کوئی یہی کہے گا کہ قرآن کی عظمت امام سے زیادہ ہے، تو جب قرآن کی عظمت زیادہ ہے تو امام کی طرح قرآن کے نیچے بھی کپڑا ڈالنا چاہئے۔

ایک جگہ حضرت والا تشریف لے گئے۔ بیان فرمایا، بیان کے بعد ایک قرآن جو

الماری پر رکھا تھا اس پر جا کر ہاتھ رکھا تو ہاتھ پر قرآن پر جمی ہوئی دھول لگ گئی تو کچھ لوگوں نے حضرت کا ہاتھ صاف کرنا چاہا، تو فرمایا کہ افسوس کہ میرے ہاتھ پر دھول لگنے کی فکر ہے؛ مگر قرآن دھول میں اتنا ڈوبا ہوا ہے؛ مگر کسی کو اس کی عظمت کا خیال نہیں ۔غرض قرآن کی عظمت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ قرآن مجید پڑھنے کے لیے بزرگوں نے رحل کو تجویز فرمایا تھا؛ مگر آج اس کی جگہ تپائی کا رواج ہوگیا ہے، حتیٰ کہ مدارس میں بھی اسی کا رواج ہوگیا ہے۔ حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کے لیے مخصوص کرسی ہونا چاہئے جیسے بادشاہ کی کرسی مخصوص ہوتی ہے۔ اور قرآن کی مخصوص کرسی رحل ہے۔ رہی تپائی تو وہ ایک عام چیز ہے اس پر کتاب بھی رکھ سکتے ہیں ،کھانا بھی رکھ سکتے ہیں اور چیزیں بھی رکھی جاسکتی ہیں ،تو قرآن کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی کرسی مخصوص ہو۔لہذا تپائی پر قرآن رکھنا اگر چہ جائز ہے؛ مگر افضل یہ ہے کہ رحل پر رکھا جائے۔ بہ ہر حال یہ چند باتیں عظمتِ قرآن کے سلسلے میں عرض کی گئی ہیں ۔

محبت قرآن

قرآن مجید کا دوسرا حق یہ ہے کہ قرآن مجید سے محبت ہو، کیوں کہ قرآن اللہ تعالی کا کلام ہے اور کلام صاحب کلام کی معرفت کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی محبت ضروری ہے تو اس کی معرفت کے لیے اس کے کلام کی محبت بھی ضروری ہے، اسی طرح کلام ذریعۂ تقرب بنتا ہے اور اللہ کی قربت مطلوب ہے، تو اس کا ذریعہ بھی محبوب ومطلوب ہونا چاہئے۔لہذا کلام اللہ وقرآن مجید سے محبت ضروری ہے۔

کلامِ خداوندی آئینۂ جمالِ خداوندی ہے

اور یہ جو میں نے کہا کہ کلام صاحبِ کلام کی معرفت کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ یہ بات نہایت واضح ہے، کیوں کہ عام طور پر کلام ہی کے ذریعہ کسی کے کمالاتِ باطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔علم و فضل، تقویٰ و پرہیز گاری، عقل و بصیرت وغیرہ جاننا ہوتو کلام اس کا بڑا ذریعہ ہے۔اسی طرح کلام ہی سے لوگوں کی جہالت وخباثت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔تو کلام ایک آئینہ ہے جس سے صاحبِ کلام کو جانا جاسکتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کلام اللہ کے کمال و جمال کا آئینہ ہے،تو جس کو یہ خواہش ہو کہ وہ اللہ کو دیکھے،اس کو چاہئے کہ وہ اللہ کے کلام کو پڑھے اور اس کے معانی ومضامین، اس کے اسلوب و انداز، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی حلاوت و لطافت سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔یہی ہے اللہ کے کلام کی محبت۔

عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ کی صاحب زادی کا واقعہ

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا وہ یہ ہے کہ حضرت عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ کے زمانہ میں ایک مرتبہ شاہِ ایران کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرعہ بن گیا جو بے تکا سا تھا۔شاہِ ایران نے درباری شعرا سے مطالبہ کیا کہ اس مصرعہ کا جوڑ لگا کر شعر پورا کرو۔شعرا حیران ہوئے کہ بے جوڑ اور بے تکے مصرعہ کا کیا جوڑ لگائیں۔جب ان سے نہ بن سکا تو شاہِ ایران نے عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ کو لکھا کہ ہندوستان کے شعرا اس مصرعہ کا جوڑ بنائیں اور اس پر اس نے انعام بھی رکھا؛ مگر کوئی ہندوستانی شاعر بھی اس کا جوڑ نہ بنا سکا۔ایک دفعہ اتفاق سے عالمگیر رَحِمَہُ اللہُ کی شاہ زادی زینب سے اس کے مناسب ایک مصرعہ بن گیا اور اس مصرعہ نے اس بے معنیٰ مصرعہ کو بھی بامعنیٰ بنادیا۔حضرت

عالمگیر رحمۃ اللہ نے نام بتائے بغیر یہ مصرعہ شاہِ ایران کولکھ بھیجا کہ ایک ہندوستانی شاعر نے آپ کے مصرعہ کا یہ جوڑ بنایا ہے۔شاہِ ایران بہت خوش ہوا اور وہاں کے شعرا کو بھی سنایا تو وہ بھی خوش ہوئے اور مطالبہ کیا کہ آپ اس ہندوستانی شاعر کو ایران بلائیے کہ ہم اس کی زیارت کریں اور اس سے استفادہ کریں، چنان چہ شاہِ ایران نے عالمگیر رحمۃ اللہ کو لکھا کہ اپنے شاعر کو یہاں بھیجیں کہ ہم اس کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔عالمگیر رحمۃ اللہ کو پریشانی ہوئی کہ اپنی لڑکی کو وہاں کیسے بھیجیں؟انہوں نے اپنی لڑکی سے اس کا ذکر کیا۔لڑکی نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں اس کے جواب میں ایک شعر بناتی ہوں وہ شعر آپ ایران کو روانہ کردیں۔جس کا ترجمہ یہ ہے

”یعنی میں میرے کلام میں اس طرح مخفی و پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول کے پتوں میں مخفی ہوتی ہے۔لہذا جو مجھے دیکھنا چاہتا ہے وہ میرا کلام دیکھ لے“۔

اسی طرح اللہ کی محبت رکھنے والا اگر اللہ کو دیکھنا چاہے تو وہ اللہ کے کلام کو دیکھے اور اس میں اس کو اللہ تعالیٰ کا جمال اور اس کا کمال نظر آئے گا۔غرض اللہ کے کلام کی محبت بھی اس کا ایک حق ہے۔

قرآن سے محبت پر جنت کی بشارت

«عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّیْ اُحِبُّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ (قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ) قَالَ اِنَّ حُبَّکَ اِیَّاهَا یُدْخِلُ الْجَنَّةَ.» (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ

(۱) ترمذی:۱/۱۱۸

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں سورہ **قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ** سے محبت کرتا ہوں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ تیرا اس سورہ کو محبوب رکھنا تجھے جنت میں داخل کرے گا۔

اللہ اکبر! جب ایک سورت سے محبت پر یہ بشارت ہے تو فرمائیے کہ پورے قرآن سے محبت اور تمام سورتوں سے محبت پر کیا کچھ نہ ملے گا؟ معلوم ہوا کہ قرآن سے محبت جنت میں داخلے کا سبب ہے۔

قرآن سے محبت اللہ کی محبت کا ذریعہ

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن سے محبت ذریعہ ہے اس بات کا کہ اللہ تعالی کی محبت حاصل ہو جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

« عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بَعَثَ رَجُلاً عَلٰی سَرِيَّةٍوَ كَانَ يَقْرَأُ لِاَصْحَابِهٖ فِي صَلاتِهِمْ فَيَخْتِمُ بِقُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ فَلَمَّا رَجَعُوْا ذَكَرُوا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فَقَالَ سَلُوْهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ فَسَأَلُوْهُ فَقَالَ لِاَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَقْرَأَ بِهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اَخْبِرُوْهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهٗ » (۱)

(نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر جہاد میں بھیجا۔ ان صحابی کی عادت تھی کہ ہر نماز کی دوسری رکعت کے آخر میں یا ہر رکعت کے آخر میں سورہ قل هو الله احد پڑھتے۔ جب یہ فوج واپس

(۱) مسلم: ۱/ ۲۷۱

ہوئی تو صحابہ نے ان صحابی کے اس عمل کا ذکر اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ان صحابی نے بتایا کہ اس صورت میں رحمٰن یعنی اللہ تعالی کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس لئے مجھے اس سے محبت ہے۔ آپ نے فرمایا ان صحابی کو بتا دو کہ اللہ تعالی بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ یعنی اس سورت سے محبت کی وجہ سے اللہ تعالی تم سے محبت کرتا ہے۔)

اور جو پورے قرآن سے محبت کرتا ہے اس کا تو کیا ٹھکانہ ہے؟ مگر یہاں یاد رکھئے کہ ان صحابی کو صرف ایک سورت سے محبت نہیں تھی؛ بل کہ محبت تو پورے قرآن سے تھی، ہاں زیادہ محبت اس سورت سے تھی۔ غرض یہ کہ قرآن مجید سے محبت رکھنا اس کا حق ہے اور لازم وضروری ہے۔

ہماری حالت کا جائزہ

اب ہماری حالت کا جائزہ لیجئے کہ کیا ہم اللہ تعالیٰ کے کلام سے محبت رکھتے ہیں اور اس کا یہ حق ہم سے ادا ہو رہا ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو کلام مجید سے محبت نہ رکھتا ہو؛ بل کہ بات اکثر کی ہو رہی ہے۔ بعض اللہ کے بندے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جو دین پر چلیں گے؛ مگر اکثر کی حالت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ ہم میں قرآن مجید کی محبت نہیں۔ نوجوانوں کو جتنا شوق وذوق اور جتنی محبت فحش لٹریچر، عریاں ناول اور گندے رسائل سے ہے۔ سوچئے کہ کیا قرآن مجید کا ایسا شوق ہے، ذوق ہے، محبت ہے؟

ٹی وی کا جتنا شوق ہے کیا قرآن کا اس قدر ذوق وشوق ہے؟ فلمی گانوں اور فلمی کہانیوں سے تو محبت ہے؛ مگر قرآن سے ایسی الفت ومحبت نہیں ہے۔ اس لیے مشاہدہ

ہے کہ فحش باتیں، گالیاں اور فلمی گانے وکہانیاں، عشقیہ اشعار ونظمیں تو نوجوانوں؛ بل کہ بچوں کو بھی یاد ہیں؛ مگر صحیح قرآن نہیں پڑھ سکتے اور دو چار سورتیں بھی ڈھنگ سے یاد نہیں۔ کیا یہ بات اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم میں قرآن مجید کا شوق و ذوق اور اس کی محبت نہیں ہے؟

اگر محبت ہوتی تو ہم اس کو پڑھتے یاد کرتے اور ہماری زبانیں اس سے تروتازہ رہتیں اور دوسروں کو بھی سناتے اور خود بھی متأثر ہوتے اور دوسروں کو بھی متأثر کرتے۔

ایک بڑھیا کا قرآن سے عشق

اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ حضرت امام عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ جو جلیل القدر محدث اور رفیع الشان فقیہ اور اکابر صوفیا میں سے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ حج کو گئے، حج کے بعد کسی جگہ جارہے تھے، راستہ میں ایک جگہ محسوس ہوا کہ کوئی چیز کپڑے میں لپٹی ہوئی ہے۔ قریب جا کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ کوئی انسان ہے، انہوں نے سلام کیا تو اس کپڑے کے اندر سے ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا، امام ابن مبارک رحمۃ اللہ نے اس سے مختلف سوالات کئے تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب کہ اس نے ہر سوال کے جواب میں قرآنی آیات پڑھیں، جن سے ان سوالات کا جواب نکلتا تھا۔ واقعہ بہت تفصیلی اور لمبا ہے۔ یہاں چند سوالات اور ان کے جوابات جو ان دونوں کے مابین ہوئے وہ نقل کرتا ہوں۔

امام صاحب رحمۃ اللہ : تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

وہ کہنے لگی: ”وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلاَ هَادِىَ لَهُ“

(اللہ جس کو گم راہ کر دے اس کا کوئی رہنما نہیں)

امام صاحب رحمۃ اللہ نے سمجھ لیا کہ یہ راستہ بھٹک گئی ہے۔ اس لئے پوچھا

کہاں جانا چاہتی ہو؟

اس عورت نے قرآن کی آیت پڑھی:

﴿ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلٰی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی ﴾

(پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی)

آپ سمجھ گئے کہ یہ مکہ سے بیت المقدس جارہی ہے اور راستہ بھٹک گئی ہے۔

عبداللہ ابن مبارک رَحِمَہُ اللہُ نے پوچھا کہ کتنے دن سے یہاں بیٹھی ہو؟

کہنے لگی: "ثَلاثَ لَیَالٍ سَوِیًّا" (پورے تین راتوں سے)

آپ نے پوچھا: کیا کچھ کھاؤ گی؟

کہنے لگی: "اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّلیلِ" (کہ روزوں کو رات تک پورا کرو)

حضرت ابن مبارک رَحِمَہُ اللہُ فرماتے ہیں کہ میں راستہ میں ترنم سے شعر پڑھنے لگا تو اس بوڑھیا نے کہا:

"فَاقْرَؤُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنَ" (قرآن میں سے جو ہو سکے پڑھو)

اس طرح جتنے سوالات حضرت عبداللہ ابن مبارک رَحِمَہُ اللہُ نے کیے وہ عورت ہر سوال کا جواب قرآن کی آیات ہی سے دیتی۔ جب وہ اس کے بیٹوں کے پاس اس کو پہنچا چکے، تو ان سے پوچھا کہ تمہاری ماں کیا قرآن کے سوا کچھ نہیں بولتی؟ تو اس کے بیٹوں نے بتایا کہ ہماری ماں نے عہد کیا ہے کہ قرآن کے سوا کچھ نہیں بولوں گی اور یہی حالت ان کی چالیس سال سے ہے۔ اللہ اکبر! کیا عشق و محبت ہے قرآن سے اس طرح قرآن سے محبت ہو۔ یہ قرآن کا دوسرا حق ہے۔

تلاوتِ قرآن

اور تیسرا حق یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یعنی اس کو پڑھا جائے، کیوں کہ قرآن مجید ایک طرف قانونی کتاب ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے نام ایک خط ہے۔ بادشاہ کی طرف سے قانون نامہ یا حکم نامہ آئے یا محبوب کی طرف سے کوئی خط ملے، تو اس کو نہ پڑھنا اور اٹھا کر ایک طرف ڈال دینا کتنا بڑا جرم ہے یا کس قدر بے وفائی ہے؟ اس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کا نہ پڑھنا ایک طرف قانونی جرم ہے تو دوسری طرف اپنے محبوب حقیقی سے بے وفائی بھی ہے۔ اس لئے ہمیں تلاوتِ قرآن کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

ایک جگہ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ﴾ (الکہف: ۲۷)

(اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے)

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ قرآن مجید کی تلاوت کیجئے، جب آپ کو حکم ہے تو آپ کے واسطے سے تمام امت کو بھی حکم ہوگا۔

تلاوت کے فضائل وفوائد

پھر تلاوت کے بڑے فضائل ہیں اور کتب حدیث میں مستقل عنوان کے تحت ان کو جمع کردیا گیا ہے۔ یہاں ایک دو فضائل وفوائد ذکر کرتا ہوں۔

ایک حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

«عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

يَقُوْلُ اِقْرَؤُا الْقُرْآنَ فَاِنَّهُ يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيْعًا » (۱)

(یعنی قرآن پڑھو، بلاشبہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والے کا سفارشی بن کرآئے گا۔)

دیکھئے قرآن پڑھنے کی کتنی فضیلت ہے کہ قیامت کے دن قرآن سفارشی بن کرآئے گا اور پڑھنے والے کی سفارش کرے گا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

« عَنْ اَبِیْ مُوسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْآن وَیَعْمَلُ بِہٖ کَالْاُتْرُجَّۃِ وَالْمُؤْمِنُ الَّذِیْ لَایَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَیَعْمَلُ بِہٖ کَالتَّمْرَۃِ » (۲)

(قرآن پڑھنے والے مومن کی مثال ترنج کی سی ہے، جس کی بُو بھی خوش گوار ہے اور مزہ بھی خوش گوار ہے اور قرآن نہ پڑھنے والے مومن کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور، کہ اس کا مزہ میٹھا ہے؛ مگر خوش بو نہیں ہے۔)

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

''جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا اس کو ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی دس کے برابر ہوگی (یعنی ایک حرف پر دس نیکیاں ملیں گی) پھر فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے؛ بل کہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے''۔ (۳)

(۱) مشکوٰۃ:۱۸۴

(۲) مشکوٰۃ:۱۸۴

(۳) ریاض الصالحین:۳۲۴

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔غور فرمائیے کہ جب ایک ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو مستقل قرآن مجید کی تلاوت پر کتنا ثواب اور کتنی نیکیاں ملتی ہوں گی؟

تلاوت قرآن پر نزول سکینہ

نیز تلاوتِ قرآن مجید کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تلاوت کے وقت اللہ کی طرف سے سکینہ اور فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ بخاری وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ قرآن پڑھ رہے تھے، رات کا وقت تھا اور سورۂ بقرہ کی تلاوت کررہے تھے اوران کا گھوڑا ان کے قریب بندھا ہوا تھا، اچانک وہ اچھل کود کرنے لگا، تو صحابی خاموش ہوگئے تو وہ بھی ٹھہر گیا، پھر انہوں نے پڑھنا شروع کیا تو وہ بھی اچھلنے لگا، ایسے ہی تین دفعہ ہوا۔ان کا بچہ گھوڑے کے قریب تھا، جس کا نام یحیٰ تھا۔ان صحابی کوخوف ہوا کہ کہیں یہ گھوڑا اس بچہ کو روند نہ ڈالے، اس لیے انہوں نے بچہ کو وہاں سے ہٹالیا۔پھر آسمان کی طرف دیکھا تو عجیب منظر نظر آیا کہ ایک بادل ہے اس میں چراغ کے مانند بہت سی روشنیاں ہیں ۔انھوں نے یہ قصہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ نے فرمایا کہ اسید!تم پڑھتے رہتے تو اچھا ہوتا، جانتے ہو وہ کیا تھا؟ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں،تو آپ نے بتایا کہ یہ اللہ کی طرف سے فرشتے آئے تھے جو تمہاری تلاوت کی آواز کی وجہ سے قریب ہو گئے تھے۔اگر آپ پڑھتے ہی رہتے تو فرشتے لوگوں کو دکھائی دیتے۔(۱)

تلاوت کے دنیوی فوائد

حضرات!یہ جو کچھ عرض کیا گیا یہ قرآن مجید کے اخروی فوائد و برکات اور روحانی

---

(۱) بخاری:۲/ ۲۵۰،مسلم:۱/ ۲۶۹

فضائل وثمرات ہیں اور مؤمن کے لیے یہی اصل سرمایا ہیں؛ لیکن اسی کے ساتھ اس کی برکات سے دنیوی فوائد وثمرات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اخروی فوائد کے لیے کرنا نہ چاہتا ہو، تو کم ازکم دنیوی فوائد کے لیے ہی سہی تلاوت کا معمول بنا لے۔ یہاں چند فوائد کی طرف اشارہ کروں گا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس کو قرآن کی تلاوت نے میرے ذکر اور میرے سے سوال کرنے سے مشغول کردیا، میں اس کو مانگنے والوں سے بہتر عنایت کروں گا''۔(۱)

کتنا بڑا فائدہ ہے کہ تلاوت میں مشغول رہنے والے کو مانگنے والوں سے زیادہ اور بہتر ملے گا اور اس میں دین ودنیا کی سب چیزیں آگئیں۔

ایک مرسل روایت میں ہے کہ:

''رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ جس نے دن کے اول حصہ میں سورۂ یٰسٓ کی تلاوت کرلی، اس کی تمام حاجتیں پوری کی جاتی ہیں''۔(۲)

اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے رویت ہے کہ:

''اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ جو ہر رات سورۂ واقعہ پڑھتا ہے، اسے کبھی فاقہ نہ ہوگا''۔(۳)

---

(۱) مشکوٰۃ:۱۸۶

(۲) مشکوٰۃ:۱۸۹

(۳) شکوٰۃ:۱۸۹

بعض روایات میں ہے کہ:

''سورۂ فاتحہ ہر بیماری کے لیے شفا ہے''۔(۱)

اور بعض روایات میں ہے کہ:

''قرآن اور شہد دو شفاؤں کو پکڑلو''۔(۲)

غرض قرآن شفا ہے۔ حاجت وضرورت کی تکمیل کا باعث ہے۔ فاقہ ومصیبت سے نجات کا ذریعہ ہے۔ تو اس میں اخروی فوائد بھی ہیں اور دنیوی فوائد بھی ہیں۔

عاملوں کے چکر میں نہ پھنسیں

بہت سے لوگ قرآن کو چھوڑ کر جوگیوں، سادھوؤں اور غلط کار عاملوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ قرآن پڑھنا شروع کردیں تو اس سے ان کی بہت سی پریشانیاں دور ہوجائیں اور دنیوی نعمتیں اور راحتیں بھی حاصل ہوجائیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بعض مسلمان برقعہ پوش عورتیں اللہ کو چھوڑ کر مندروں میں سادھوؤں کے پاس اور چرچوں میں عیسائی پادریوں کے پاس جاتی ہیں اور اپنی ضروریات وحاجات کے لیے کہتی ہیں، اور وہ لوگ کفریہ وشرکیہ اعمال بتاتے ہیں اور بعض لوگ جاہل قسم کے عاملوں کے چکر میں پڑ کر کفریہ وشرکیہ اعمال اختیار کرتے ہیں۔

مسلمانو! ایک خدا کے پرستارو! تم تو دنیا کو دینے کے لیے آئے تھے۔ یہ کیا غضب ہے کہ تم ان کے دروں پر لینے جاتے ہو۔ تمہارے پاس قرآن جیسی عظیم الشان چیز ہے، اس کو پڑھو اور اس پر عمل کرو۔ اس میں تمہاری آخرت ودنیا کا نفع پوشیدہ ہے، گھروں میں روزانہ تلاوت کا معمول بناؤ، گھر میں ہر قسم کی برکتیں ورحمتیں نازل ہوں گی۔

---

(۱) تفسیر قرطبی:۱/۱۱۲

(۲) ابن ماجہ:۳۴۴۶

ایک غلطی کی اصلاح

مگر یہاں ایک بات ضرور یاد رہنا چاہئے کہ قرآن کے نزول کا مقصد محض جسمانی بیماریوں سے شفا دینا، مرادوں کو پورا کرنا اور پریشانیوں کو دور کرنا نہیں ہے۔ وہ تو روحانی امراض (کفر وشرک، معصیت وبدعت) کو ختم کرنے آیا اور آخرت کی پریشانیوں کے ازالے کے لیے نازل ہوا۔ ہاں! ضمناً دنیوی پریشانیوں اور جسمانی بیماریوں کے لیے بھی شفا وحل کا کام دیتا ہے؛ مگر اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی مصلحت سے کبھی ظاہری بیماری اور پریشانی سے قرآن کو پڑھنے کے باوجود شفا نہ عطا کیا تو نعوذ باللہ قرآن غلط ہے یا بے اثر ہے۔ یاد رکھو! قرآن سے شفا کا حاصل ہونا اللہ کی مشیت و ارداہ پر موقوف ہے۔ جیسے دواؤں سے شفا بھی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن سے ضرور شفا ملے گی اور پھر قرآن کی صداقت کے لئے اس کو دلیل ٹھہرانا غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

بنگلور اور اطراف میں ایک صاحب نے عملیاتِ قرآنیہ کا سلسلہ شروع کیا۔ سنا ہے وہ نومسلم ہیں اور پیشہ سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی طرف سے لوگوں نے بتایا کہ وہ علاج کرتے ہیں اور شفا کی گیارنٹی دیتے ہیں اور پھر غیر مسلموں کے سامنے اس کو بہ طور دلیلِ صداقت پیش کرتے ہیں۔ میں نے اس پر مفصل فتویٰ لکھا اور اس میں بتایا کہ یہ دعویٰ بے دلیل بھی ہے اور خطرناک بھی، کیوں کہ اگر خدا کی مصلحت کے تقاضے سے کسی کو شفا نہ ہوئی، تو لوگ پھر قرآن کو نعوذ باللہ غلط قرار دیں گے اور صداقتِ قرآن پر حرف گیری کریں گے۔ اس لیے قرآن کو امراضِ جسمانیہ کے لیے بہ ایں معنی ماننا چاہئے کہ اگر خدا چاہے تو اس کے ذریعہ سے شفا دے گا؛ مگر اس کو صداقتِ قرآن کا معیار قرار دینا غلط ہے۔ قرآن کی صداقت وحقانیت تو اس کے روشن دلائل و براہین

اور دل میں اترنے والے اور عقلوں کو اپیل کرنے والے معانی ومضامین اور اس کی معجزانہ فصاحت وبلاغت اور سحر انگیز اسلوبِ بیان سے ظاہر ہے۔

قرآن سے فال نکالنے کا حکم

یہاں ایک بات کی وضاحت بھی کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ عامل، قرآن سے فال نکالتے ہیں اور لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ قسمت کی بات قرآن نے بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں اولاً تو یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن تو قسمت کا حال معلوم کرنے فال نکالنے ہی کو ناجائز اور شیطانی عمل قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ علم غیب صرف اللہ کو ہے اور حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ غیب کی باتیں بتانے والوں کے پاس جانا بھی گناہ کی بات ہے اور ایسے لوگوں کے پاس جانے سے چالیس دن تک نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ (۱)

تو سوچئے کہ خود قرآن کو قسمت کا حال اور غیب کی خبر جاننے کے لیے بہ طور فال استعمال کرنا کیسے جائز ہوگا؟ دوسرے یہ کہ اگر کوئی بات اس فال سے نکل آئے تو وہ ایک اتفاقی بات ہے جو صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اس بات کو قرآن کی طرف منسوب کرنا سراسر قرآن پر ظلم ہے۔ بس یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں نے قرآن کا اصل مقصد نہیں سمجھا، ورنہ ایسے لغو حرکات نہ کرتے۔ بہ ہر حال ان لغویات کو چھوڑ کر مقصد کی طرف آنا چاہیے۔ ہاں! اس سے ضمناً دیگر فوائد حاصل ہوں تو اللہ کا شکر کرنا چاہئے۔ تو بحث قرآن کی تلاوت پر چلی تھی کہ اس کے دنیوی واخروی فوائد ہیں۔

قرآن کی فضیلت

پھر اگر اس کو حفظ کر کے دل میں اتار لیا جائے تو کیا پوچھنا؟ حدیث میں فرمایا

---

(۱) مسلم:۲/۲۳۳، حاکم:۱/۸، مسند احمد:۲/۴۲۹

گیا ہے کہ حافظِ قرآن سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور جنت کے درجات چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں پڑھتا تھا۔ بس تیرا درجہ وہی ہے جہاں تو آخری آیت پر پہونچے۔ (۱)

اور ایک حدیث غریب میں ہے کہ حافظِ قرآن کی اس کے خاندان کے دس ایسے آدمیوں کے بارے میں شفاعت قبول کی جائے گی جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی۔ (۲)

اللہ اکبر! کس قدر اونچا مقام و مرتبہ ہے۔ اس لیے اس کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے۔ اگر پورا نہ ہو سکے تو تھوڑا بہت جتنا ہو سکے یاد کر لینا چاہئے۔ کیوں کہ ایک حدیث میں ہے:

''جس سینے میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہیں وہ ویران گھر کی طرح ہے''

یہ حدیث صحیح ہے۔ (۳)

غرض قرآن کی تلاوت بھی قرآن پاک کا ایک حق ہے۔

تجوید و ترتیل کی ضرورت

مگر یاد رہے کہ تلاوت جس کی تاکید و ترغیب آئی ہے وہ ایسی تلاوت ہے جس میں تجوید و ترتیل کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

قرآن کریم میں حکم فرمایا گیا:

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ (المزمل: ۴)

(قرآن کو ترتیل سے پڑھو)

---

(۱) ترمذي: ۲/ ۱۱۹

(۲) ترمذي: ۲/ ۱۱۸

(۳) ترمذي: ۲/ ۱۱۹

یعنی ٹھہر ٹھہر کر اس طرح پڑھو کہ حروف صاف صاف ان کے مخارج سے ادا ہوں اور اس کا لحاظ ہو کہ کہاں ٹھہریں اور کہاں نہ ٹھہریں۔

علما نے فرمایا ہے کہ حروف کو ان کے مخارج سے ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ لفظ کے معنیٰ میں فساد کا اندیشہ ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے زکوٰۃ اور ایک ہے ذکوۃ۔ پہلا زا سے ہے اور دوسرا ذال سے ہے۔ زا سے زکوۃ کے معنی تو ہیں کہ مال کی زکوۃ ادا کرنا جو صدقہ کی ایک قسم ہے۔ اور ذال سے ذکوۃ کے معنی ہیں ذبح کرنا۔ اب غور کیجئے کہ کوئی شخص قرآن میں جہاں زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس کو ذال سے پڑھے گا تو کس قدر معنی بگڑ جائیں گے؟ اسی طرح کسی حرف کو اس قدر کھینچنا کہ ایک اور حرف زائد ہو گیا تو یہ حرام ہے، مثلاً ''الحمد'' کو ''الحمدو'' کہنا حرام و ناجائز ہے۔ اسی طرح اور بھی چیزیں ہیں جس سے یا تو معنیٰ میں خرابی آتی ہے یا لفظ عربیت سے نکل جاتا ہے۔ یہ سب باتیں سیکھنا، قرآن کو صحیح طور پر پڑھنا واجب و ضروری ہے۔

تجوید کے غلط معنیٰ اور ایک لطیفہ

اب لوگ تجوید و قرأت کے معنیٰ یہ سمجھتے ہیں کہ خوب کھینچ تان کر اور آواز بنا کر گایا جائے۔ خواہ اس آواز بنانے اور کھینچ تان کرنے سے معنی ہی بگڑ جائیں اور وہ قرآن قرآن نہ رہے۔ بس لوگوں کو آواز چاہیے اور کھینچ تان چاہیے۔ اور اگر کوئی صحیح قرآن پڑھے؛ مگر بناوٹ نہ ہو اور سادہ انداز سے پڑھے، تو لوگ پسند نہیں کرتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک قاری صاحب مدینہ سے آئے اور کسی علاقے میں قیام فرمایا۔ ان کی تلاوت اور قرأت سے لوگ متأثر ہوئے۔ اس گاؤں کا ایک لڑکا شوق میں آ کر ان کی نقل اتارنے لگا اور نقل کرتے کرتے ان کا لب ولہجہ سیکھ لیا؛ مگر نہ اس کو احساس ہوا اور نہ گاؤں والوں کو کہ صرف لب ولہجہ اور آواز کا نام تجوید نہیں

ہے؛ بل کہ اس کو مستقل سیکھنا پڑھتا ہے۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ ان کے گاؤں کا لڑکا قاری صاحب کی طرح پڑھتا ہے تو خوش ہو کر اس لڑکے کو قاری صاحب کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ قاری صاحب یہ لڑکا بھی آپ ہی کی طرح قرآن پڑھتا ہے، سن لیجئے۔ لڑکے نے پڑھا تو قاری صاحب نے لاحول پڑھی کہ کوئی حرف بھی ٹھیک نہیں پڑھتا۔ سن کر خاموش بیٹھ گئے۔ تو لوگوں نے پوچھا کہ حضرت ہمارا لڑکا کیسا پڑھتا ہے؟ تو قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ ایسا ہی قرآن پڑھتا ہے جیسے ہم عرب کے لوگ اردو بولتے ہیں، مکری، لکری، ککری۔ یہ مکڑی لکڑی ککڑی کی گت بنائی ہے۔ عرب کے لوگ ''ڑ'' نہیں بول سکتے ''ڑ'' کی جگہ 'را' بولتے ہیں۔

واقعی قاری صاحب نے حقیقت کھول کر رکھ دی کہ جس طرح ڑ کی جگہ ر بولنے سے لفظ بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عربی کے حرفوں کو غلط پڑھنے سے معنیٰ میں فساد آتا ہے۔ اسی کو سیکھنے کا نام تجوید ہے، نہ کہ آواز بنانے اور الفاظ کو بگاڑنے کا نام۔

تجوید کے دو درجہ ہیں

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ تجوید کے دو درجہ ہیں: ایک درجہ فرض ہے۔ دوسرا مستحب۔ فرض کا درجہ یہ ہے کہ حروف کے مخارج اور ان کی صفات لازمہ کا لحاظ رکھے اور اوقاف کی رعایت کرے۔ اور دوسرا درجہ مستحب ہے اور وہ یہ ہے اخفاء، اظہار ادغام کا اہتمام کرے اور معروف ومجہول کے فرق کی رعایت کرے۔ یہ سب باتیں یوں بیان کرنے سے سمجھ میں نہیں آتیں؛ بل کہ کسی جاننے والے سے سیکھنا پڑھے گا۔

چند مثالیں

البتہ ان کی اہمیت کی وضاحت کے لیے چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

اردو میں ایک لفظ ہے جنگ۔اس کا نون ناک میں چھپا کر پڑھتے ہیں۔اسی طرح پلنگ کا نون بھی ناک میں پڑھتے ہیں۔اس کو ظاہر کرنے سے لفظ کی خوب صورتی میں فرق آجاتا ہے۔اسی طرح عربی میں بعض جگہ نون کی آواز کو ناک میں چھپا کر پڑھتے ہیں،اس کو اخفاء کہتے ہیں جیسے اَنْتَ ،اس کو ظاہر کرنے سے خوب صورتی ختم ہوجاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور بات بھی سمجھ سکتے ہیں،وہ یہ کہ قرآن میں حرکات کو معروف آواز سے پڑھنا چاہیے نہ کہ مجہول آواز سے۔اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ انگریزی میں ایک لفظ ہے شُو (shoe) جس کے معنی ہیں جوتا۔دوسرا لفظ ہے شَو (show) جس کے معنی ہیں نمائش اور دکھاوا۔جب پہلا لفظ پڑھا جائے گا،تو جو آواز نکلتی ہے وہ معروف ہے اور جب دوسرا لفظ پڑھا جائے گا،تو جو آواز نکلتی ہے وہ مجہول ہے۔اب غور کیجیے کہ کوئی جوتے کے لئے (show) شَو کی آواز نکالے تو لوگ کیا کہیں گے؟اسی طرح (lift)اور(left) کی آواز کا فرق ہے. پہلے کی آواز معروف ہے اور دوسرے کی مجہول؛مگر غور فرمائیے کہ اس ذرا سے فرق سے معنیٰ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں؟اسی طرح قرآن میں معروف آواز پڑھنا چاہیے،جیسے اَلْمَغْضُوْبِ میں ضُوْ کو معروف پڑھنا چاہیے۔اگرچہ عربی میں معروف کی جگہ مجہول پڑھنے سے معنیٰ نہیں بدلتے ؛مگر لفظ کا حُسن ختم ہوجاتا ہے۔غرض یہ درجہ مستحب کا ہے؛مگر اس کے بغیر قرآن پڑھنے کا لطف نہیں آتا۔آخر سوچئے کہ ہم انگریزی زبان اور اس کے لب ولہجہ کو سیکھنے کی جب فکر کرتے ہیں تو قرآن کو بہتر سے بہتر انداز سے پڑھنے کی کیوں فکر نہیں کرتے؟

کیا قرآن کی تلاوت بغیر سمجھے درست ہے؟

بعض لوگ قرآن کی تلاوت اور تجوید کی رعایت کو فضول سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل مقصد قرآن کے معانی ومضامین ہیں اور اگر مضمون سمجھ میں آجائے تو کافی ہے، تلاوت کرنا اور بنا کر قرآن پڑھنا فضول ہے۔

مگر یہ بات غلط ہے۔ ان لوگوں نے قرآن کو عام کتابوں پر قیاس کرلیا ہے کہ جیسے عام کتابوں کے مضامین کو سمجھ لیا جائے تو کافی ہے۔ الفاظ کی رعایت کی ضرورت نہیں ۔ یہ لوگ قرآن کو بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں ؛ مگر معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کے الفاظ بہ جائے خود مقصود ومطلوب ہیں، جیسے اس کے معنی اور مضامین مقصود ہیں۔ اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی کسی کو معلوم نہیں جیسے کہ الم ،المر ، ص ، ق، حم وغیرہ حروفِ مقطعات، کہ ان کے معنی ہم نہیں جانتے ہیں؛ مگر ان کے پڑھنے پر ثواب ملتا ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن کے الفاظ بھی بہ جائے خود مقصود ہیں۔ ہاں صرف تلاوت پر اکتفا نہ کرنا چاہیے؛ بل کہ اس کے ساتھ قرآن کے معانی ومضامین کو بھی سمجھنا چاہئے : مگر اس سے یہ مطلب لینا بھی درست نہیں کہ بغیر سمجھے قرآن پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہ گم راہی کی بات ہے۔ افسوس کہ آج اس ذہنیت کے بہت سے لوگ ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ لوگ نہ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور نہ بے سمجھے پڑھتے ہیں، حالاں کہ ان کے نزدیک جب قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی اہمیت ہے تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے تھا؛ مگر یہ دونوں باتوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت بھی مستقل ایک عبادت ہے، اس کو تجوید و ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

تدبرِ قرآن

قرآن پاک کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس میں غور وفکر کرے اور اس کے معانی اور مضامین کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کلام کا مقصودِ اصلی یہی ہوتا ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ لہذا قرآن جو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاب فرمایا ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ اور یہ کلام اللہ کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اور اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

چناں چہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ أَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَا لُهَا ﴾

(یعنی اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ) یہ لوگ قرآن میں غور فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔ (محمد :۲۴)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں تدبر نہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہوں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ قرآن میں تدبر و تفکر واجب ہے۔ (۱)

اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ الاکلیل میں فرماتے ہیں کہ آیت " افلا يتدبرون القرآن"، قرآن میں تدبر کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ (۲)

---

(۱) تفسیر قرطبی:۵/۲۹۰
(۲) الاکلیل:۸۸

غرض یہ کہ قرآن میں غور وفکر کرنا، اس کے معانی و مطالب کو معلوم کرنا ضروری اور لازم ہے۔

دو انتہا پسندانہ نظریات

یہاں ایک بات بہ طور تنبیہ عرض کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ عوام میں آج دو قسم کی انتہا پسندانہ نظریات رائج ہیں: ایک یہ کہ بعض لوگ بغیر سمجھے قرآن مجید پڑھنے کو فضول اور لغو کہتے ہیں، یہ ایک انتہا ہے۔ اکثر عوامی طبقہ اس کے بالکل برعکس قرآن مجید میں غور وفکر اور تدبر کو غیر اہم خیال کرتا ہے؛ بل کہ بعض جاہلوں کا عقیدہ یہاں تک فاسد ہو گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن عام لوگوں کو سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ دونوں خیالات و نظریات غلط و انتہا پسندانہ ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ بلا فہم تلاوت بے کار ہے، وہ بھی غلطی پر ہیں، کیوں کہ بلا فہم تلاوت پر ثواب ضرور ملتا ہے؛ مگر اس کا مطلب یہ لینا کہ قرآن سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں یا یہ کہ قرآن سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں یہ بھی غلط بات ہے۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ نے "تقویۃ الایمان" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے بڑا علم چاہیے، ہم کو وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں؟ یہ بات غلط ہے۔ (۱)

معلوم ہوا کہ قرآن نہ سمجھنا اور اس کے لئے یہ بہانہ کرنا صحیح نہیں؛ بل کہ قرآن میں تدبر کرنا چاہیے۔

---

(۱) تقویۃ الایمان: ۳۰

تدبرقرآن کےفوائد

اوراس کا فائدہ یہ ہے کہ قرآن کے مضامین و معانی دل میں اتر تے ہیں اور انسان کو ہدایت مل جاتی ہے۔کیا آپ نے سنانہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی مسلمان بہن و بہنوئی کو مارنے کے لئے ان کے گھر گئے اور وہاں جا کر بہنوئی کو پیٹا، پھر بہن کو بھی مارا، جب تھک کر بیٹھ گئے تو خیال ہوا کہ چلو قرآن کو پڑھ کر دیکھیں کہ اس میں کیا ہے؟ جب بہن سے لے کر قرآن کی سورۂ طٰہٰ پڑھی اور عربی تو وہ تھے ہی، شاعر و فصیح اور خطیب و بلیغ بھی تھے، معنیٰ سمجھا اور اس پر غور کیا تو نتیجہ کیا ہوا کہ اسلام میں داخل ہوگئے اور چلے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سر لینے، اب سر دینے کو چلے۔ یہ ہدایت قرآن سمجھنے سے حاصل ہوئی۔(۱)

اس پر اور ایک واقعہ یاد آ گیا جو حدیث میں آتا ہے کہ قریش نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عتبہ بن ربیعہ کو بھیجا کہ وہ آپ سے گفتگو کرے، اس نے آ کر کہا کہ آپ نے جو ایمان کی دعوت کا کام جاری کیا ہے، اس سے آپ کا مقصد اگر مال و دولت ہے تو ہم آپ کو مال و دولت وافر طور پر دیں گے، اور حکومت چاہیے، تو ہم قریش مکہ اپنا حاکم بھی بنانے تیار ہیں، اور اگر آپ کو عیش و عشرت چاہیے، تو اس کے اسباب بھی جمع کر دیں گے۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اب تم میری سنو، پھر سورہ حٰم سجدہ کی آیت تلاوت فرمائی اور سجدہ کی آیت پڑھی پھر سجدہ کیا اور عتبہ نے اپنے ہاتھوں کو پیچھے باندھے ان پر ٹیک لگا کر سنتا رہا۔ پھر جب واپس ہوا تو کفار جو اس کے منتظر تھے، کہنے لگے کہ یہ جس چہرے سے گیا تھا اس چہرے سے واپس نہیں آ رہا

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ متعدد کتب سیر و تاریخ میں ہے، دیکھو: سیرت ابن ہشام،۳۴۳،۳۴۶، تاریخ الخلفاء:۱۰۳ وغیرہ

ہے۔عتبہ نے آکران سے کہا میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے ایسا کلام کبھی بھی نہیں سنا۔قسم بہ خدا نہ تو وہ شعر ہے اور نہ تو کہانت ہے اور نہ جادو ہے۔ (۱)

قرآن فہمی کے لیے استاذ کی ضرورت

مگر یاد رکھو کہ قرآن فہمی بغیر استاذ کے حاصل نہیں ہوتی جیسے دنیوی علوم وفنون بغیر استاذ کے حاصل نہیں ہوتے۔اس لئے خود قرآن سمجھنے کے بہ جائے اس کو جو اس کا ماہر ہے، استاذ بنالینا چاہیے، ورنہ وہی حال ہوگا جیسے ایک صاحب نے خود بہ خود قرآن کا ترجمہ دیکھا اور پڑھا اور اس میں ایک آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو! تم ''راعنا'' مت کہو''انظر نا'' کہو۔اس دن سے انہوں نے قرآن کی آیت سے راعنا کا لفظ نکال دیا اور کہنے لگے کہ اللہ میاں نے ہی تو فرمایا کہ راعنا مت کہو، حالاں کہ یہ ایک خاص موقعہ کی آیت ہے۔پھر اتنا بھی نہ سوچا کہ اگر قرآن سے اس کو نکال دیا جائے تو پھر دوسرے پڑھنے والوں کو اس حکم کا پتا کیسے چلے گا؟

غرض خود ہی قرآن میں تدبر کے بہ جائے کسی باقاعدہ عالم سے اس کو سیکھے اور اس کو سمجھے۔

ہر آدمی کو اجتہاد کا حق نہیں ہے

قرآن فہمی کا بیان آپ کے سامنے آگیا؛ مگر ایک بات یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں احکام کی آیتیں ہیں،ان میں اجتہاد کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں؛ بل کہ اس کے لیے متعدد علوم پر مہارت کی ضرورت ہے۔اس لیے قرآن پڑھ کر اس کے عام مضامین سے فائدہ تو اٹھائے؛ مگر خود ہی اپنی عقل سے ان میں اجتہاد نہ کرے،

(۱) سیرت ابن ہشام:۱/۲۹۴

یہ کام فقہائے کرام کا ہے۔اگر ہر آدمی اجتہاد کرے گا تو نہ معلوم کس بات سے کیا نتیجہ نکالے گا اور کیا گڑبڑ کر دے گا؟۔اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک گاؤں میں ایک شخص درخت پر چڑھ گیا؛مگر چڑھنے کو تو چڑھ گیا،اترنا نہیں آتا تھا۔بہت چیخا، چلایا،لوگ جمع ہو کر سوچنے لگے کہ کس طرح اس کو اتارے،اتنے میں ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں اس کو اتاروں گا،تم رسی لے آؤ،لوگ رسی لے آئے،اس نے رسی کو درخت پر اس آدمی کی طرف پھینکا اور کہا کو اس کو پکڑ کر اپنی کمر کو باندھ لے،اس کے بعد اس شخص نے نیچے سے زور سے جھٹکا دیا،وہ آدمی تو نیچے آ گیا؛مگر اس کی روح اوپر چلی گئی،یعنی بے چارہ مر گیا۔اب لوگوں نے اس پر اعتراض کیا،تو نے یہ کیا کیا؟تو کیا جواب دیتا ہے کہ میں نے اس طرح سے کئی آدمیوں کو کنویں سے نکالا ہے۔واہ کیا اجتہاد ہے؟کہ کنویں کے مسئلہ پر درخت کو قیاس کر لیا ہے۔اس طرح ہر آدمی احکام کی آیت میں اجتہاد کرے گا،تو سوائے گڑبڑی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

غرض یہ کہ ایک حق ہے تدبر قرآن؛مگر کسی استاذ کی رہنمائی میں ہونا چاہیے؛مگر آج جدت پسندوں اور ماڈرن اسلام کے داعیوں کا ایک طبقہ پیدا ہوا ہے،جو قرآن کی من مانی تشریح و تفسیر اور احکامِ قرآن میں بے موقعہ اجتہاد و استنباط کرتا ہے اور تمام علمائے سلف و خلف کے خلاف رائے دیتا ہے۔اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ طبقہ علمائے اسلام کو الزام دیتا ہے کہ انھوں نے قرآن و شریعت کو نہیں سمجھا۔افسوس کہ علما پر الزام رکھنے والے ان جدید مفسرین و جدید مجتہدین کی علمی حالت یہ ہے کہ قران صحیح پڑھنا بھی نہیں آتا۔اور ان میں سے اکثر وہ ہیں جو عربی زبان سے اور شرعی علوم سے بالکل جاہل ہیں،پھر بھی اجتہاد کا دعویٰ ہے۔

غرض یہ کہ ساری باتیں جاہلانہ ہیں۔لہذا عوام کو چاہیے کہ قرآن کو ضرور سمجھیں،

مجتہد بننے کی کوشش نہ کریں۔ یہ فقہائے کرام کا کام ہے۔ ہاں! فقہا سے پوچھ کر ان کے احکام کو جو قرآن میں آئے ہیں سمجھیں۔

اطاعتِ قرآن

قرآن مجید کا آخری اور سب سے بڑا حق یہ ہے کہ قرآن کی اطاعت کی جائے کیونکہ قرآن کا نزول ہوا ہی ہے اسی مقصد کے لیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام وقانون بیان فرمایا ہے اور جن جن باتوں کی تعلیم وترغیب دی ہے، ان پر عمل کیا جائے اور جن چیزوں سے منع فرمایا اور جن چیزوں کی مذمت و برائی بیان کی ہے، ان سے پرہیز کیا جائے۔

چنان چہ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾

(الأنعام: ١٩)

یہ قرآن مجید مجھ پر نازل ہوا تا کہ میں تم کو اور جن جن لوگوں تک یہ پہنچے ان کو اس کے ذریعہ ڈراؤں۔

یعنی اس کے احکام پر نہ چلنے اور اس کی اطاعت نہ کرنے کا وبال وعذاب سنا کر ان کو ڈراؤں۔ معلوم ہوا کہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ نیز قرآن میں متعدد مقامات پر قرآن کو ہدایت دینے والی کتاب کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے۔ کہیں فرمایا:

﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ (البقرة: ٢)

(کہ تمام انسانوں کو ہدایت دینے والی کتاب ہے)

قرآن میں ہدایت ہے

معلوم ہوا کہ قرآن ایک ہدایت نامہ ہے۔اس میں لوگوں کے لیے ہدایت کا مکمل سامان جمع کر دیا گیا ہے۔اور ہدایت کے معنی ہیں :ارا ء ة **الطریق** (راستہ دکھانا) قرآن انسانوں کو زندگی گذارنے کا صحیح طریقہ دکھاتا ہے،اور ہر شعبۂ زندگی میں ان کی رہ نمائی کا کام کرتا ہے۔انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ہو، پھر اجتماعی زندگی میں عائلی وقبائلی زندگی ہو، یا شہری و مدنی زندگی ہو، پھر ان زندگیوں کا کوئی پہلو ورخ کیوں نہ ہو، قرآن ہر جگہ ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔یہ اسی لئے تو کرتا ہے کہ ہم اس کی ہدایت کے مطابق عمل کریں۔اگر عمل مقصود نہ ہوتا تو یہ ہدایت نامہ بھیجا ہی کیوں جاتا ؟

ایک خطرناک غلطی کا ازالہ

یہاں ایک عام وخطرناک غلطی کا ازالہ بھی ہو گیا، جو اچھے اچھے پڑھے لکھے؛ بل کہ دین دار لوگوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے،وہ یہ کہ بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں قرآن مجید کے بارے میں یہ تصور قائم ہو گیا ہے کہ قرآن محض پڑھنے کی چیز ہے اور اس پر ثواب مل جاتا ہے، جو ہم کو آخرت میں کام آئے گا۔گویا کہ قرآن کا فائدہ صرف یہ ہے کہ اس کی تلاوت کا ثواب آخرت میں مل جائے گا۔باقی دنیا میں قرآن کا کوئی فائدہ ذہنوں میں نہیں ہے، حالاں کہ یہ ایک نہایت خطرناک غلطی ہے۔اس میں شک نہیں ہے کہ قرآن کی تلاوت پر ثواب ملتا ہے جیسا کہ پہلے میں نے خود عرض کیا ہے؛ مگر یہ خیال باطل ہے کہ قرآن کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں، حالاں کہ دنیا میں زندگی گذارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک ہدایت نامہ بنا کر نازل فرمایا ہے اور حکم ہے کہ ایک مؤمن کی پوری زندگی قرآن مجید کے قانون واصول کے عین مطابق ہونا

چاہیے۔عبادت ہو،معاشرت ہو،معیشت ہو،اخلاقیات ہوں،سیاست ہو،معاملات ہوں،تمام کے تمام قانونِ قرآن کے احاطہ اور دائرہ میں ہونا چاہیے؛مگر اب لوگ اس کے بہ جائے اپنی پوری زندگی کافروں، فاسقوں ،مشرکوں، یہودیوں، عیسائیوں، انگریزوں، ہندوؤں کے قانون کے مطابق گذارتے ہیں۔ معاشرت وتہذیب انگریزوں کی اختیار کرتے ہیں،تقریبات،شادی وغم میں ہندوؤں کے رسوم کواپناتے ہیں۔تجارت ومعاملات میں یہودیوں کی اسکیموں پر ایمان رکھتے ہیں۔سیاسی معاملات میں کفار وفساق کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔کبھی خیال تک نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم الشان کتاب قرآن مجید میں ہماری زندگی کے تمام شعبوں کے لیے جب ہدایت فرمادی ہےتو ہم اس کے مطابق زندگی گذاریں،بس قرآن کو آخرت میں ثواب جمع کرنے کے لیے تلاوت تک محدود کر رکھا ہے کیا یہ خطرناک غلطی نہیں ہے؟

اگر ہم سے پوچھا جائے تو

سوچیے کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھ لے کہ میں نے زندگی گذارنے کے لئے قرآن کو رہ نمائی وہدایت کا سامان بنایا اور تم تک پہنچایا،تا کہ اپنی زندگی اس کے مطابق بناؤ؛مگر تم نے میرا قانون چھوڑ کر کبھی یہود کا،کبھی نصاریٰ کا، کبھی ہندوؤں کا،کبھی مجوسیوں کا قانون اپنایا۔ بتاؤ! کیا اسی واسطے میں نے اس کو نازل کیا تھا؟ اگر ہم سے یہ پوچھا جائے تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ کیا اس وقت ہمارا دین دار طبقہ یہ کہہ کر چھٹکارا پا سکتا ہے کہ اے اللہ! ہم نے روزانہ اتنے پارے پڑھ کر ثواب جمع کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ یہ جواب کچھ کام نہ آئے گا۔لہٰذا ذہن سے یہ نکال دینا چاہئے کہ قرآن صرف پڑھنے اور آخرت میں ثواب جمع کرنے کے لیے ہی ہے؛ بل کہ قرآن دنیا میں زندگی گذارنے اور اپنے آپ کو اس قانون واصول

پر ڈھالنے کے لیے بھی ہے، جس کا نتیجہ ضرور بالضرور آخرت میں نجات ہوگا؛ مگر کوئی صرف میری اس تقریر سے یہ نہ سمجھے کہ میں تلاوت کو غیر مفید قرار دے رہا ہوں۔ نہیں؛ بل کہ میرا منشا یہ ہے کہ جس طرح قرآن کا ایک حق تلاوت ہے، اسی طرح؛ بل کہ اس سے بڑا حق اطاعت ہے۔ اطاعت سے غفلت؛ بل کہ ایک درجہ میں اعراض اور غیروں کے قوانین پر رضا، یہ خطرے کی بات ہے اور قرآن کو ہدایت نامہ نہ سمجھنا، محض تلاوت کے لئے مخصوص کرنا سخت خطرناک غلطی ہے۔

اطاعتِ قرآن کا محدود تصور

اسی سلسلہ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض حضرات قرآن کی اطاعت کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور عمل بھی اس پر کرتے ہیں؛ مگر ان کے ذہنوں میں اطاعتِ قرآن چند مخصوص چیزوں تک محدود ہے۔ چند عبادات اور چند دیگر معاملات میں، تو قرآن پر چلتے ہیں؛ مگر بے شمار اور چیزوں میں اطاعتِ قرآن سے غفلت کرتے ہیں۔ گویا بعض حصہ پر عمل کرتے ہیں اور بعض پر نہیں کرتے اور ان دوسری چیزوں میں غیروں کے قانون پر راضی ہیں۔ مثلاً عبادات میں تو اللہ کا قانون لیتے ہیں؛ مگر جب مسئلہ آتا ہے معاشرت کا، معاملات کا، سیاسیات کا تو غیروں کا قانون اپناتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک قرآن کی اطاعت یہ ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکاۃ ادا کرو اور حج کرو۔ اسی طرح چند اور امور باقی زندگی من مانی گزارتے ہیں، حالاں کہ قرآن کا مطالبہ تو یہ ہے کہ مکمل اطاعت واتباع ہو اور ہر معاملہ میں اتباع واطاعت ہو۔

قرآن میں صاف حکم دیا گیا ہے:

﴿وَهٰذَا كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ﴾ (الأنعام: ۱۵۵)

(یہ (قرآن) مبارک کتاب ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے۔ پس
تم اس کا اتباع کرو۔)

ظاہر ہے کہ یہاں اس کی اتباع سے مراد پوری کتاب کی اتباع ہے، کچھ حصہ یا چند اجزا کی اتباع نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿اِتَّبِعُوْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الاعراف :۳)

(جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا
گیا ہے، اس کی اتباع کرو۔)

یہاں "ما انزل" میں جو "ما" ہے اس کا عموم بتا رہا ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا وہ سب قابل اتباع ہے۔ لہٰذا تمام قرآن پر عمل کرنا چاہئے۔

قرآن پر عمل کرنے کی فضیلت

قرآن مجید پر عمل کرنے کی بڑی فضیلت حدیث شریف میں آئی ہے۔ بخاری وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ:

"حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو مؤمن قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ترنج؛ جس کا مزہ بھی عمدہ ہوتا ہے اور خوش بو بھی عمدہ ہوتی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اور اس پر عمل نہیں کرتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور؛ کہ اس کا مزہ عمدہ ہے؛ مگر اس میں کوئی خوش بو نہیں ہوتی"۔(۱)

(۱) بخاري:۲/ ۷۵۷

اس حدیث میں قرآن پر عمل کرنے والے مؤمن کو ترنج سے تشبیہ دی گئی ہے کیوں کہ ترنج خوش منظر بھی ہوتا ہے، خوش بودار بھی ہوتا ہے اور مزے دار بھی ہوتا ہے۔ پھر پھل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مختلف امراض میں دوائی کا کام بھی کرتا ہے، حتیٰ کہ اس کا چھلکا بھی دوا کے کام آتا ہے۔ اس کے بیج سے تیل نکالا جاتا ہے، جس کے بہت سے طبی فوائد ہیں۔ اس کا کھانا معدہ کی صفائی کا باعث اور ہاضمہ کا نظام اس سے درست ہو جاتا ہے۔ (۱)

اس طرح مؤمن جو قرآن پر عمل کرتا ہے، اس کا ظاہر و باطن دونوں عمدہ ہوتے ہیں اور اس کی ہر ادا اور عمل مفید ہوتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اور روحانی خوش بوؤں سے روح کو معطر کر دیتا ہے۔ کس قدر بڑی فضیلت ہے اس مؤمن کی جو قرآن پڑھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔

قیامت کے دن قرآن حجت ہوگا

نیز حدیث میں ہے کہ:

«اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَيْکَ» (۲)

''یعنی قرآن تیرے حق میں حجت ہوگا یا تیرے خلاف حجت ہوگا''۔

علامہ نووی رَحِمَہُ اللہُ اس کی شرح فرماتے ہیں کہ یعنی تجھ سے فائدہ ہوگا، اگر تو نے اس پر عمل کیا۔ ورنہ تیرے خلاف حجت ہوگا۔

نیز ایک حدیث میں ہے کہ:

---

(۱) فتح الباری:۹/۶۲

(۲) مسلم:۱/۱۱۸

''قیامت کے دن تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی: ان میں سے ایک قرآن ہوگا جو بندوں کے بارے میں حجت کرے گا''(۱)

یعنی جن لوگوں نے اس کے احکام پر عمل کیا، اس کے موافق گواہی دے گا۔ اور جن لوگوں نے عمل نہیں کیا، ان کے خلاف گواہی دے گا۔ معلوم ہوا کہ قرآن کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔

مؤمن کی شان یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرے

بل کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی شان ہی یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرلیا (یعنی حرام کاموں کو حلال کی طرح اختیار کرلیا) اس نے قرآن پر ایمان نہیں رکھا''۔(۲)

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے تاہم ترغیب کے لئے بیان کرنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی حرام کردہ چیزوں سے نہ بچنا مومن کا کام نہیں ہوسکتا، یہی ہے کہ عمل کی تاکید کی گئی۔

قرآن پر عمل کرنے کا ثواب

پھر قرآن پر عمل کرنے کا ثواب بتا کر اس طرف راغب کیا گیا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

---

(۱) مشکوٰۃ:۱۸۶

(۲) مشکوٰۃ:۱۱۸

«قَالَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيْهِ أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجاً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهُ هَااَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِيْ بُيُوْتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ بِكُمْ فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِيْ عَمِلَ بِهٰذَا»(۱)

(جس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا،اس کے ماں باپ کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا،جس کی روشنی اس سورج سے بہتر ہوگی جو تمہارے گھروں میں لاکر لگا دیا جائے۔اب تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا گمان ہے جس نے خود اس پر عمل کیا؟

یعنی اگر سورج کو گھر میں لاکر لگادیا جائے تو جیسی روشنی ہوگی اس سے زیادہ اس تاج کی روشنی ہوگی۔یہ تاج قرآن پر عمل کرنے والے کے والدین کو پہنایا جائے گا۔اب اندازہ کرو کہ خود عمل کرنے والے کا کیا مقام ومرتبہ ہوگا؟

غرض معلوم یہ ہوا کہ محض قرآن پڑھنا کافی نہیں؛بل کہ عمل بھی ضروری ہے۔

قرآن پڑھنے والے کیسے ہوتے ہیں؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بڑی عجیب بات فرمائی:

’’حاملِ قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی رات کی (عبادت سے) پہچانا جائے،جب کہ سب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔اور وہ اپنے دن (میں قانون خدا پر عمل) سے پہچانا جائے،جب کہ لوگ حد سے گزر رہے ہوں۔اور وہ اپنے غم سے پہچانا جائے،جب کہ لوگ تفریح بازی میں مشغول ہوں۔اور وہ اپنے رونے سے پہچانا جائے،جب کہ لوگ ٹھٹا مار رہے ہوں۔اور وہ اپنی خاموشی سے پہچانا جائے،جب کہ لوگ

(۱) ابو داود:۱/ ۲۰۵

باتوں میں مشغول ہوں۔ اور وہ اپنے خشوع سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ فخر وغرور میں مبتلا ہوں۔ (۱)

یہ ہے صحیح معنیٰ میں حامل قرآن جس کی ہر ادا قرآن کے مطابق ہوتی ہے۔

قرآن کا نزول عمل کے لئے ہوا ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا نزول ہوا ہی ہے عمل کرنے کے لیے۔ چنان چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا کہ اس پر لوگ عمل کریں؛ مگر لوگوں نے اس کے پڑھنے ہی کو ایک عمل بنالیا۔ تم میں سے ایک آدمی قرآن کو شروع سے آخر تک اس طرح پڑھ جاتا ہے کہ ایک حرف بھی ساقط نہیں کرتا؛ مگر اس پر عمل کو ساقط کردیتا ہے۔ (۲)

اور سلف کا یہی طریقہ تھا کہ قرآن میں جو پڑھا، اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ تم سے پہلے لوگ (صحابہ تابعین) قرآن کو اپنے رب کے خطوط سمجھ کر پڑھتے، رات میں اس پر غور وفکر کرتے اور دن میں اس کو نافذ کرتے۔ (۳)

غرض قرآن مجید کا یہ بڑا حق ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اس کے احکامات میں سے اوامر پر پابندی کی جائے اور ممنوعات اور محرمات سے پرہیز کیا جائے۔

حرف آخر

یہ پانچ حقوق ہیں قرآن کریم کے، جن کی تفصیل آپ کے سامنے رکھی گئی: پہلا

(۱) احیاء العلوم: ۱/۲۷۴

(۲) احیاء العلوم: ۱/۲۷۵

(۳) احیاء العلوم: ۱/۲۷۵

عظمت، دوسرا محبت، تیسرا تلاوت مع الصحۃ، چوتھا تدبر، پانچواں اطاعت۔ جو شخص ان کو ادا کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جگہ کام یابی عطا فرمائے گا اور جو ان حقوق کو ضائع کرے گا وہ کام یابی سے محروم ہوگا۔

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ ان حقوق کو پورے طور پر ادا کرنے کی کوشش کرے تا کہ کام یابی و سرخ روئی حاصل ہو۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام اہل اسلام کو حقوقِ قرآن ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط

احقر محمد شعیب اللہ خان
ناظم مدرسہ مسیح العلوم

اسلام میں عورت کا کردار

التقریظ

حضرت اقدس مفتی نصیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سابق صدر مفتی مفتاح العلوم جلال آباد (یوپی)

بانی ومہتمم ادارہ فیض مسیح الامت، بڑوت (یوپی)

حمداً و سلاماً:

امابعد: احقر نصیر احمد غفرلہ مظہر مدعا ہے کہ مولانا شعیب اللہ خان، جوان صالح، مہتمم مدرسہ مسیح العلوم بنگلور کا رسالہ ''اسلام میں عورت کا کردار'' بعض حصہ سنا اوراس کے مضامین کا اجمالی مطالعہ کیا بہت جامع اور بڑا نافع معلوم ہوا، طبقہ نسوان کے لیے بہ راہ راست اور طبقہ رجال کے لیے من حيث التبليغ و التعليم و التربية سہل زبان اور فصاحت بیان ہے۔

اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے سب کو مطالعہ وعمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین

(مفتی) نصیر احمد غفرلہ

واردِ حال

مدرسہ مسیح العلوم بیدواڑی بنگلور

۲۱/ جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ

التقریظ

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب دامت برکاتہم

خلیفہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب دامت برکاتہم
ومہتمم مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور سہارنپور، یوپی

حامدًا و مصلیًا:

امابعد: جو لوگ اسلامی احکام سے نا آشنا ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی سے محروم ہیں اور وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی آزادی سلب کرلی ہے، اسے گھر کی چاردیواری میں محصور کردیا ہے، ایسے لوگوں کے لیے صاحب فضل وکمال حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان مدظلہ العالی نے جن کا مزاج ہے ؎

آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

''اسلام میں عورت کا کردار'' تصنیف فرمائی ہے، جس میں قرآن وحدیث کے آئینہ میں عورت کا مقام دکھلایا ہے۔ وہ مذہب اسلام ہی ہے جس نے عورت کو عزت کا مقام عطا فرمایا۔ اسلام آنے سے قبل عورت کا یہ حال تھا ؎

اگر جن بیٹھتی دختر کوئی تقدیر کی ہیٹی
چھچھوندر سے بری معلوم ہوتی تھی اسے بیٹی
گڑھا ایک کھود کر دختر کو زندہ گاڑ دیتے تھے
کوئی بچھو تھا دامن میں کہ دامن جھاڑ دیتے تھے

قرآن پاک نے ''وَلاَ تَقْتُلُوْ ا اَوْلاَدَکُمْ'' (الخ) کہہ کر عورت کو حیات بخشی۔ حضرت مولانا موصوف نے کتاب ہذا میں عام فہم انداز میں عورت کے حقوق، تعلیم وتربیت، آداب زندگی قلم بند فرمائے ہیں۔ یہ کتاب ایک نسخہ ہے جس کے استعمال سے بگڑا ہوا معاشرہ درست ہوسکتا ہے۔ خدا کرے یہ کتاب ہر گھر میں پہنچ جائے اور امت کو استفادہ کی توفیق ہو۔

دعا ہے رب ذوالجلال قبول فرما کر مصنف کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔

محمد اسلم

خادم جامعہ کاشف العلوم، چھٹمل پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

اس مشفق ومہربان ہستی کے نام، جن کی مشفقانہ تعلیم وتربیت، مصلحانہ رہبری و ہدایت، دُوررس فکرسازی اورحقیقت پسندانہ ہمت افزائی نے ایک ایسے نامبارک ماحول ومعاشرے سے، جو مادیت کا پجاری، تہذیب جدید کا شیدائی اوراسلام کا باغی ہے، جس کی رگ رگ میں حقائق سے چشم پوشی، مزاج میں مظاہر پرستی اورایمان میں کم زوری ہے۔ اورغفلت شعاری، دین کے معاملے میں سہل انگاری اورآخرت سے اعراض وبے التفاتی جس کی شرست بن گئی ہے، فیشن پرستی، عریانی وبے حیائی جس کے نزدیک ترقی کی علامت ودلیل ہے، مجھ حقیر وفقیر کونکالا اوراس قابل بنایا کہ تہذیبِ جدید کے متوالوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال سکوں اورفیشن پرستی اور بے حیائی و عریانی کے علم برداروں کواسلام کے سامنے سرنگوں ہونے کی برملا دعوت دوں۔

میری مراداس سے میری والدہ ماجدہ ہیں جنھوں نے ۱۸؍ربیع الاول ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۳؍جولائی ۱۹۹۸ء بروز پیر ایک طویل علالت کے بعد اللہ کا ذکر کرتے کرتے اس دارالفنا سے منہ موڑکر دارالبقا کی طرف کوچ فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ ان کی قبرکونور سے منور کرے اور جنت الفردوس میں ان کوٹھکانا عطافرمائے۔آمین۔

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہواتو چل بسی

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

۷/ جمادی الاول ۱۴۱۹ھ

تقدیم

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق ومحبت کے لیے علم وہنر موت

(اقبال)

مغربی تہذیب وتمدن نے جہاں اور بہت ساری برائیوں کو اپنی شیطانی ملمع کاری سے دل فریب ودل چسپ بنا کر پیش کیا ہے، وہیں اس نے عورت کی بے حیائی وعریانی وفحش کاری کو آزادی نسوان اور مساوات کے خوش کن نعروں اور خوش نما دعوؤں سے دل چسپ بنادیا، جس کے نتیجہ میں بے حیائی وعریانی اور فحش کاری کا بازار ایسا گرم ہوا کہ موجودہ معاشرہ، شہوت کی ایک بھڑکتی بھٹی کا نمونہ دکھائی دیتا ہے اور زن، اس تعلیم وتہذیب کی تاثیر سے زن کی اُن صفات وخصوصیات سے خالی وعاری ہو چکی ہے جو اس کی معصوم نسوانیت کا طبعی وفطری اقتضا تھا، یہی وہ جدید تعلیم وتہذیب ہے جس کو بہ قول اقبال ”ارباب نظر موت کہتے ہیں“

موت کے اس خوں خوار وخوف ناک پنجے سے کوئی چیز عورت کو بچا سکتی اور اس کو دوبارہ نئی زندگی دے سکتی ہے، تو وہ صرف اور صرف اسلام کی وہ تعلیم ہے جس نے جاہلی دور کے وحشی انسانوں کو انسانیت کا سبق پڑھایا، بھٹکتی ہوئی انسانیت کو راہ ہدایت پر گام زن کیا، بے حیائی کے حیا سوز جہنم کو عفت وعصمت کی پاکیزہ تعلیم سے

بجھایا، بداخلاقی وبدتہذیبی کے بدترین سیلاب پر اپنے انمول اخلاقی اسباق سے روک لگائی۔

اسی کے پیشِ نظر زیرِ نظر رسالے میں عورت کا اصل مقام ومرتبہ، اس کی عزت و عظمت اور اس کی اصل صفات وخصوصیات کو پیش کیا گیا ہے؛ تاکہ وہ تہذیب جدید کی لعنت کا طوق اپنے گلے سے اتار کر اسلام کی تعلیم وتلقین اور نصیحت وہدایت کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرے۔

امید ہے کہ خاتون اسلام، اسلام کی ان تعلیمات کی قدر پہچانتے ہوئے، اپنے آپ کو ان سے آراستہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

۷/ جمادی الاول ۱۴۱۹ھ

یکم/ستمبر ۱۹۹۸ء

احاطہ جامعہ مسیح العلوم، منگلور

فصلِ اول

اسلام میں عورت کا مقام

اسلام میں عورت کو بلند ترین مقام عطا فرمایا گیا ہے اور دیگر معاشروں کی بہ نسبت اسلامی معاشرے میں اس کو زیادہ تحفظ دیا گیا ہے۔ عام طور پر عورتوں میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اسلام میں عورت کا کوئی مقام نہیں، اس کی عزت و عظمت نہیں اور اس کی جان و مال کو تحفظ نہیں، حالاں کہ واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ ہم اس فصل میں اختصار کے ساتھ اسلام میں عورت کا مقام بتائیں گے۔

عورت بہترین دولت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلدُّنیا کُلُّھَا مَتاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنیا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ» (۱)

(یہ پوری دنیا ایک سامان ہے اور دنیا کا بہترین سامان ”صالح عورت“ ہے۔)

---

(۱) المشکاة:۲٦٧، النسائی:۲/ ۷۱

اس حدیث پاک میں اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے عورت کو دنیا کی بہترین دولت قرار دیا ہے، جس سے اسلام کی نظر میں اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس عورت کا بلند ترین مقام واضح ہوتا ہے۔

نبیٔ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پسند

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنيَا النِّسَاءُ وَالطِّيبُ وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِيْ الصَّلوٰةِ »(۱)

(دنیا کی چیزوں میں سے مجھے عورتیں اور خوش بو محبوب ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔)

یہ ارشاد مبارک اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظر میں عورتوں کی عزت و عظمت اور آپ کے قلب میں ان کی محبت و شفقت پر صاف طور پر دلالت کرتا ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لینا چاہیے کہ یہ حدیث دراصل رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دو اوصاف و کمالات کی طرف اشارہ ہے:

ایک یہ کہ آپ انتہائی درجے کی عبدیت کے حامل ہیں، اس کا ظہور نماز کے ذریعے ہوا۔

دوسرے یہ کہ آپ غایت درجہ شفقت کے حامل ہیں، اسی شفقت کی ایک فرع یہ ہے کہ آپ کے دل میں عورت کی محبت ڈالی گئی؛ کیوں کہ عورت ضعیف و نازک مخلوق ہے، جس سے شفقت لازم تھی۔

(۱) النسائی: ۲/۹۳، مسند أحمد: ۳/ ۱۲۸

یہی دو چیزیں دین کی اصل ہیں :ایک ’’التعظیم لأمر الله‘‘، دوسرے ’’الشفقة علی خلق الله‘‘۔

بہ ہر حال اس حدیث نے اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پسندیدہ چیزوں میں عورت کو شمار کر کے اس کے درجے کو بلندی کی انتہائی منزل تک پہنچا دیا۔

عورتیں مردوں کے ہم دوش

ایک حدیث میں محسنِ انسانیت حضرت محمد عربی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے:

«اِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ»

(عورتیں مردوں کے برابر یعنی مشابہ ہیں۔)(۱)

یہاں ’’شقائق‘‘ کا لفظ آیا ہے، جو’’شقیقة‘‘ کی جمع ہے، اس کے معنے آتے ہیں: اس چیز کا ایک حصہ، جس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ ’’شقیقہ‘‘ کے معنے ہیں ہم دوش و ہم سر و برابر۔ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے عورتوں کو درجے کے لحاظ سے مردوں کے ہم دوش و برابر قرار دیا ہے۔

آج یورپ نے جو مساواتِ مرد و زن کا نعرہ لگایا ہے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اس پر مٹے جا رہے ہیں، یہ دراصل اسی تعلیم کی بازگشت ہے؛ مگر یورپ نے نعرہ تو اسلام سے لے لیا؛ مگر اس کا مطلب اپنی طرف سے بیان کر کے اس میں تحریف کر دی اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ نعرہ تو مساوات کا لگاتا ہے؛ مگر حقیقت میں وہ عورت کو مردوں کے ہم دوش تسلیم نہیں کرتا؛ بل کہ عورت کو مرد کا کھلونا بناتا ہے۔ اس کے

---

(۱) ترمذی:۱/۳۱، ابو داؤد:۱/۳۱

(۲) دیکھو المنجد مادہ:ش،ق

برخلاف اسلام عورت کو مردوں کے ہم پلہ قرار دے کر اس کے حقوق کو تحفظ بخشتا ہے۔

عورتوں کے حق میں خیر کی وصیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا.»

(عورتوں کے بارے میں مجھ سے خیر کی وصیت قبول کرو۔)(۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے بارے میں خیر و بھلائی کی وصیت فرما رہے ہیں اور امت کو حکم فرما رہے ہیں کہ میری یہ وصیت قبول کرو اور عورتوں سے بھلائی کرو۔ کیا اب بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کا کوئی مقام نہیں، ان کا کوئی حق نہیں؟

عورتوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کی تلقین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ ہیں، جن کے اخلاق سب سے عمدہ ہوں اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں، جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھے ہوں۔"(۲)

دیکھیے اس ارشادِ مبارک میں ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں کو سب سے بہتر قرار دیا ہے، جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئیں۔ اس طرح اس میں مردوں کو تعلیم و تلقین ہوگئی کہ عورتوں کے ساتھ عمدہ اخلاق

---

(۱) البخاري:۳۱۵۳، مسلم:۱۴۶۸، المشكاة:۲۸۰، ابن ماجه:۱۳

(۲) رياض الصالحين:۲۳۰

سے پیش آنا چاہیے۔ کیا اس سے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی رعایت وحفاظت کا علم نہیں ہوتا؟

غرض اسلام نے عورتوں کے درجے کو بلندی وعظمت کی انتہائی منزل تک پہنچایا ہے اور اس کے حقوق کو پورا پورا تحفظ عطا فرمایا ہے۔ یہ چند امور نمونے کے طور پر عرض کیے گئے ہیں؛ ورنہ اس موضوع پر مواد جمع کیا جائے، تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے۔

فصل ثانی

عورت کتنی اچھی، کتنی بری؟

عورت اگر اچھی ہو جائے، تو اس سے دنیا میں اچھائیاں اور خوبیاں پھیلتی ہیں اور اگر وہ خراب ہو جائے، تو فساد کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔ اگر عورت اچھی ہو، تو کوئی چیز اس سے اچھی نہیں اور اگر وہ بری ہو، تو اس سے بری بھی کوئی چیز نہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم اور حضرت آسیہ کو مؤمنین کے سامنے مثال میں پیش فرمایا ہے اور ان کی تعریف فرمائی ہے۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت آسیہ فرعون کی بیوی۔ فرعون کی خباثت و شرارت، تو سب کو معلوم ہے؛ مگر دیکھیے اس کی بیوی جب نیکی پر آئی، تو اس درجے تک پہنچ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی مقدس اور ہمیشہ رہنے والی کتاب میں بہ طور خاص اس کا ذکر فرمایا اور اس کی تعریف کی۔

ان کے برخلاف دو اور عورتوں کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہے: ایک حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا، دوسری حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اور برائی کی ہے اور ان کا جہنمی ہونا بیان کیا ہے۔

(التحریم: ۱۰۔۱۱)

غور فرمایئے ایک طرف فرعون جیسے سرکش اور مردود کی بیوی آسیہ ہیں، جنھوں نے اچھے اوصاف واخلاق اختیار کیے اور نیکی کی راہ کا انتخاب کیا، تو قرآن مجید میں ان کی تعریف بیان کی گئی اور دوسری طرف حضرت لوط وحضرت نوح علیہما السلام جیسی مقدس ذوات کی گھر والیاں ہیں، جن کی مذمت وبرائی ہمیشہ کے لیے قرآن میں ثبت کر دی گئی ہے، حالاں کہ حضرت لوط ونوح علیہما السلام وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں کہ دنیا کا کوئی انسان بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتا، تو فلاح پا جاتا؛ مگر ان کی بیویاں ان کے نقش قدم پر نہ چلیں؛ تو عذاب میں گرفتار ہوئیں۔

جب عورت نیکی پر آتی ہے، عمدہ اخلاق سے اپنے کو آراستہ کرتی ہے اور صلاح وتقوے کی زندگی گزارتی ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر- جس سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا- عورت کے حق میں یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں:

« وَلَيْسَ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا شَيءٌ أَفْضَلُ مِنَ الْمَرْأَةِ الصَّالِحَةِ »(۱)

(دنیا کی چیزوں میں ''نیک عورت'' سے افضل وبہتر کوئی چیز نہیں ہے۔)

اور جب عورت نیکی کا راستہ چھوڑ کر اخلاقِ رذیلہ سے اپنے آپ کو ملوث کرتی اور شر وفساد کی زندگی گذارتی ہے، تو اسی ترجمانِ حق زبان سے عورت کے حق میں یہ الفاظ صادر ہوتے ہیں:

«وَاطَّلَعْتُ فِي النَّارِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَاءُ »(۲)

(میں نے دوزخ کو دیکھا، اس میں جانے والی اکثر عورتیں تھیں)

---

(۱) ابن ماجہ: ۱۳۳

(۲) بخاری: ۲/ ۷۸۲، مسلم: ۲/ ۳۵۲، ترمذی: ۲/ ۸۷

ایک طرف مؤمن مرد کے لیے سب سے زیادہ بہترین چیز تقویٰ کے بعد نیک عورت کو قرار دیا ہے۔

چناں چہ فرمایا:

«مَااسْتَفَادَ الْمُؤْمِنُ بَعْدَ تَقْوَى اللّٰهِ خَيْرًا لَهُ مِنْ زَوْجَةٍ صَالِحَةٍ »(۱)

(اللہ سے تقویٰ کے بعد نیک عورت سے زیادہ بہترین چیز سے مؤمن نے استفادہ نہ کیا ہوگا۔)

تو دوسری طرف عورت کو سب سے زیادہ فتنہ کا سبب بھی بتایا گیا ہے۔

چناں چہ حدیث میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ:

«مَا اَدَعُ بَعْدِيْ فِتْنَةً أَضَرُّ عَلٰى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ» (۲)

(میرے بعد میں نے مردوں کی حق میں کوئی فتنہ ''عورتوں'' سے زیادہ نقصان دہ نہیں چھوڑا ہے۔)

وجہ کیا ہے؟ وہی کہ جب عورت ان اوصاف واخلاق، خصوصیات وکمالات سے آراستہ ہوتی ہے جو اس کے لیے ضروری ہیں، تو وہ دنیا کی سب سے بہترین چیز قرار پاتی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں بلندی کی انتہائی منزلوں میں جگہ پاتی ہے اور ایک مؤمن کے حق میں ''تقویٰ کی صفت'' کے بعد اگر کوئی چیز اعلیٰ وافضل اور سب سے زیادہ خیر کا باعث ہوسکتی ہے تو وہ عورت ہی ہے؛ مگر یہی عورت جب سیدھی راہ سے ہٹ کر برائی کے راستہ پر پڑ جاتی ہے اور ان کمالات وخصوصیات سے ہاتھ

---

(۱) ابن ماجہ:۱۳۳

(۲) بخاری:۴/۷۶۳، مسلم:۴/۳۵۲، ترمذی:۲/۱۰۶، ابن ماجہ:۲۸۸

دھو بیٹھتی ہے اور شیطانی اخلاق و اعمال اختیار کر لیتی ہے، تو یہ دنیا کی سب سے بد ترین مخلوق قرار پاتی اور فتنہ کا باعث بنتی ہے۔

فصل ثالث

مؤمن عورت کے اوصاف قرآن کے آئینہ میں

ایک مؤمن عورت میں وہ کیا اوصاف وکمالات ہونے چاہئیں جو اس کو اللہ اور رسول کی نظروں میں عزت وعظمت عطا کرتے ہیں اور وہ ان کی بنا پر اجر عظیم کی بشارت کی مستحق، اخروی سرخروئی اور سرفرازی کی حامل اور جنت اوراس کی نعمتوں کی وارث قرار پاتی ہے۔قرآن مجید نے ان اوصاف واخلاق کو بیان فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِیْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِیْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذَّاكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ (الاحزاب: ۳۵)

(تحقیق کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد اور محنت جھیلنے والی عورتیں اور دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں اور خیرات کرنے

والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو بہت یاد کرنے والی عورتیں اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے مغفرت اور اجر عظیم کو۔)

آیت کا شان نزول

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمارا یعنی عورتوں کا ذکر کیوں نہیں فرمایا اور صرف مردوں کا ہی ذکر کیوں فرمایا؟ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا۔(۱)

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا، جو ایک انصاری خاتون تھیں، انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ ہر بات مردوں ہی کے بارے میں آئی ہے اور عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جاتا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے اوصاف و اخلاق بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے؛ اس لیے کہ یہ آیت جیسا کہ عرض کیا گیا عورتوں کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی، اس میں اگرچہ مردوں کا بھی ذکر ہے؛ مگر اصل

---

(۱) ابن کثیر:۳/۵۰۳، روح المعانی :۲۲/۲۲

(۲) روح المعانی:۲۲/۲۲، قرطبی:۱۴/۵۸۱

مقصود عورتوں کا تذکرہ ہے۔

مؤمن عورت کے قرآنی اوصاف

اس آیت میں جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں، ان پر غور کرنا چاہیے؛ کیوں کہ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ نہ مردوں سے ہے اور نہ عورتوں سے؛ بل کہ ان لوگوں سے ہے جو ان اوصاف واخلاق کے حامل ہیں۔ یہ کل دس (۱۰) اوصاف واخلاق ہیں جو یہاں بیان کیے گئے ہیں (۱) اسلام (۲) ایمان (۳) قنوت یعنی اطاعت (۴) صدق یعنی سچائی (۵) صبر (۶) خشوع (۷) صدقہ وخیرات (۸) روزہ (۹) شرم گاہ کی حفاظت (۱۰) ذکر اللہ۔

ان اوصاف کی مختصر تشریح وتوضیح ذیل میں دی جاتی ہے؛ تا کہ ان اوصاف کی حقیقت واصلیت معلوم ہو جائے۔

(۱) اسلام: اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بندوں کی بھلائی و بہبودی کے لیے، جو احکامات وقوانین نازل فرمائے ہیں، ان کو قبول کر کے ان کی اطاعت واتباع کی جائے؛ کیوں کہ اسلام کے اصل معنی ہیں ''اپنے کو کسی کے سپرد کر دینا اور بالکل اسی کے تابع فرمان ہو جانا'' اور ظاہر ہے کہ یہاں مراد اللہ کے سپرد ہو جانا اور اسی کے فرمان کے تابع ہو جانا ہے اور اللہ کا فرمان وہی ہے جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، لہذا اسلام کی حقیقت و روح یہی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور ہر بات میں اسی کے قانون کا پابند بن جائے۔

اس تشریح کو سامنے رکھ کر خواتین حضرات کو غور کرنا چاہئے کہ کیا ہم میں یہ صفت پائی جا رہی ہے اور کیا ہم اسی طرح اللہ کے حوالے ہو گئے ہیں اور اس کے قانون پر ہر

موقعہ پر عمل کرتے ہیں؟

(۲) **ایمان** : ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ نبی ورسول کی خبر پر ان حقائق کو مان لینا اور دل سے قبول کر لینا، جو ہماری عقلوں اور شعور وادراک سے معلوم نہ ہوسکیں اور جو ہمارے حواس سے دور ہوں، جیسے اللہ کا وجود، توحید باری تعالیٰ ، جنت ودوزخ، رسول کی رسالت، نبی کی نبوت ،وحی کا سلسلہ،قبر وحشر کے احوال وغیرہ، ان سب باتوں کو نبی ورسول کی خبر کی بنیاد پر دل سے مان لینا ایمان ہے،ان کے بارے میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ ذراسا بھی ان میں شک کیا جائے ؛ بل کہ اپنی نظر سے زیادہ نبی کی خبر پر اعتبار واعتماد ہونا چاہیے۔

(۳) **قنوت** : ''قنوت'' کے اصلی معنیٰ'' اطاعت'' کے ہیں ۔اس سے مراد مکمل اطاعت وفرماں برداری ہے، اس طرح کہ کسی بھی حکم میں ذرا برابر خلل نہ پڑے اور پوری یکسوئی اور دل کی مکمل آمادگی کے ساتھ اطاعت بجالائے ۔ یہ کیفیت دراصل اوپر کی دوصفات ''اسلام وایمان'' کے راسخ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) **صدق**: ''صدق'' سچائی کو کہتے ہیں۔اس کی تین قسمیں ہیں : پہلی قسم زبان کی سچائی کہ جو بات زبان سے نکالے وہ سچائی رکھتی ہو،حدیث میں ہے:

«اِنَّ الصِّدُقَ يَهْدِیُ اِلَی الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّيَهْدِیُ اِلَی الْجَنَّةِ»

اور فرمایا:

«اِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِیُ اِلَی الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَيَهْدِیُ اِلَی النَّارِ »(۱)

(سچائی نیکی کا راستہ بتاتی ہےاور نیکی جنت کا راستہ بتاتی ہے۔ بلاشبہ

---

(۱) بخاری:۵۶۳۹، مسلم:۴۷۱۹

جھوٹ فسق وفجور کا راستہ بتاتا ہے اور فسق وفجور جہنم کا راستہ بتاتا ہے۔

دوسری قسم عمل کی سچائی ، وہ یہ کہ نیکی کے کاموں میں کاہلی وسستی سے پرہیز کرے، نماز کا وقت ہوا تو نماز پڑھ لے، روزوں کے دن آئیں، تو روزہ رکھے، اسی طرح اور عبادات اور نیکیوں کے وقت ان عبادات اور نیکیوں کو ادا کرے۔ یہ عمل کی سچائی ہے؛ کیوں کہ بندہ مؤمن ایمان لا کر اللہ سے وعدہ کر چکا ہے کہ میں عبادت واطاعت کروں گا، تو جب اس وعدہ پر عمل ہوگا، تو عملی سچائی ظاہر ہوگی ورنہ وہ عمل کا سچا نہ ہوگا۔ تیسری قسم دل کی سچائی، وہ یہ ہے کہ ایمان میں پختگی ہو، نفاق نہ ہو۔ یہاں صادقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان تینوں سچائیوں کے حامل ہوں۔

(۵) **صبر** : لغت میں ''صبر'' کے معنی حبس کے ہیں، یعنی روکنا، اس سے مراد اپنے نفس کو روکے رکھنا اور کنٹرول میں رکھنا ہے۔صبر بھی تین قسم کا ہوتا ہے:

(۱) ایک یہ ہے کہ نفس کو اطاعت وعبادت پر لگائے رکھے۔

(۲) دوسرے یہ ہے کہ نفس کو گناہوں سے باز رکھے۔

(۳) تیسرے یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو مصائب و پریشانیاں پیش آتی ہیں، ان پر بھی نفس کو سنبھالے رکھے کہ وہ اللہ کی کوئی شکایت نہ کر پائے۔

پہلی قسم کو ''صبر علی الطاعة''، دوسری کو ''صبر عن المعصیة''، اور تیسری قسم کو ''صبر علی المصیبة'' کہتے ہیں۔ان تینوں میں مشترکہ بات یہ ہے کہ نفس کو کنٹرول میں رکھنا پڑتا ہے، تب ہی وہ نیکی پر قائم ہوتا اور گناہوں سے بچتا اور مصیبت پر بے قابو ہونے سے رکتا ہے۔

خواتین حضرات اس پر خصوصیت سے توجہ فرمائیں کہ کیا اس قسم کے صبر کا مادہ ان میں پیدا ہوگیا ہے؟ اگر نہیں تو کوشش کریں۔

(٦) **خشوع:** ''خشوع'' سے مراد دل کا اللہ کی طرف جھکاؤ اور لگاؤ ہے۔ اس سے انسان میں وقار سکون اور تواضع پیدا ہوتا ہے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز میں داڑھی سے کھیلتا ہوا دیکھا، تو فرمایا کہ اس کے دل میں اگر خشوع ہوتا، تو اس کے اعضا میں بھی خشوع ہوتا۔ (۱)

(۲) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی داڑھی سے کھیل رہا ہے، تو فرمایا کہ اس کے دل میں خشوع ہوتا، تو اعضا میں بھی خشوع ہوتا۔ (۲)

(۳) ایک شخص نماز میں داڑھی سے کھیل رہا تھا، حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے دیکھا، تو فرمایا کہ اس کے دل میں اگر خشوع ہوتا، تو اس کے اعضا میں بھی خشوع ہوتا۔ (۳)

(۴) ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص کو انھوں نے نماز میں کنکریوں سے کھیلتا ہوا دیکھا، تو یہ فرمایا۔ (۴)

اور یہاں صرف نماز میں خشوع مراد نہیں ہے؛ بل کہ ہمہ وقت اللہ کی طرف توجہ اور دل کا جھکاؤ مراد ہے۔

(۷) **صدقہ وخیرات** : اس سے مراد سخاوت کا مادہ اور جذبہ ہے کہ اللہ تعالے کے نام پر اپنا مال لٹا دیا جائے، خواہ زکاۃ کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح مساکین وفقرا پر خرچ کیا جائے۔ صدقہ وخیرات کے فضائل اور اس پر اللہ کی طرف

---

(۱) نوادر الاصول:۳/۲۱۰

(۲) تعظیم قدر الصلاۃ:۱/۱۹۴

(۳) ایضاً

(۴) سنن بیہقی :۲/۲۸۵

سے دیا جانے والا ثواب، قرآن وحدیث میں بڑی تفصیل کے ساتھ بار بار بیان کیا گیا ہے؛ اس لیے مسلم عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر سخاوت کا جذبہ پیدا کرے اور بخل وکنجوسی سے بچے۔

(۸) **صوم**: یعنی روزہ، ''صوم'' روزہ کو کہتے ہیں جس میں محض اللہ کے واسطے انسان اپنی خواہشات اور لذات کو چھوڑ دیتا ہے جب اللہ کے لیے اللہ کے حکم پر جائز خواہشات اور لذات کو بھی چھوڑ دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ حرام وناجائز کاموں اور حرام لذتوں اور خواہشوں میں، تو ہرگز کبھی بھی نہ پھنسے گا، یہی جذبہ اس صفت سے مقصود ہے۔

(۹) **عفت وعصمت** : ایک اہم صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ شرم گاہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس سے مراد عفت وعصمت ہے اور یہ صفت عورتوں کی تمام صفات میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے؛ بل کہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ عورت نام ہی ہے سراپا عفت وعصمت کا، جس میں عفت وعصمت کا عنصر نہ ہو، وہ عورت کی تعریف سے خارج ہے۔

(۱۰) **ذکر اللہ** : آخری وصف ''ذکر اللہ'' بتایا گیا ہے، یعنی اللہ کی یاد۔ اس میں زبانی ذکر بھی داخل ہے اور قلبی ذکر بھی داخل ہے اور عملی ذکر بھی داخل ہے۔ زبانی ذکر یہ ہے کہ زبان سے اللہ کو یاد کرے مثلاً تلاوت کلام اللہ کرنا، کلمہ طیبہ پڑھنا، یا اور کوئی تسبیح وذکر کرنا۔ اور قلبی ذکر یہ ہے کہ دل اللہ کی طرف متوجہ ہو اور ہر کام کے موقعے پر خدا کے حکم کو سوچ کر اس کے مطابق کام کیا جائے۔ اور عملی ذکر جیسے نماز، حج وغیرہ عبادات کا ادا کرنا ہے۔ یہ ہیں وہ صفات، جو ایک مؤمن عورت کے اندر ہونی چاہئیں۔ اور مرد بھی مستحق انعام اسی وقت ہوگا، جب کہ وہ ان صفات کا حامل ہو۔ آیت کریمہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

البتہ آیت کا نزول خصوصیت کے ساتھ چوں کہ عورتوں کے لیے ہوا ہے؛ اس لیے یہاں خواتین کو خصوصیت کے ساتھ ان صفات کے حاصل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔

سُورَةُ التَّحْرِيْمِ (آيَة:۵) میں بھی اچھی عورت کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں: **مسلمات ، مؤمنات ، قانتات ، تائبات ،عابدات ،سائحات** ،یعنی اسلام، ایمان، قنوت، توبہ، عبادت اور سیاحت۔ پہلی تین کا ذکر اوپر آچکا ہے، آخری تین کی شرح یہ ہے:

توبہ : یعنی اپنے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے رجوع ہونا اور معافی مانگنا، اپنی تقصیر کا اعتراف اللہ کو بہت پسند ہے اور تقصیر کر کے بھی اعتراف نہ کرنا اور معافی کی جگہ ضد وہٹ سے کام لینا مسلمان کی شان سے بعید ہے۔

عبادت: اس کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے سامنے عاجزی وانکساری بھی بندہ مؤمن کا خاص وصف ہے۔(اسلام میں بعض عبادات کی شکلیں مقرر ہیں؛ نماز، روزہ، حج، زکاۃ وغیرہ۔اور بعض عبادات کی شکلیں مقرر نہیں ہیں، ان کو حسب حال کیا جاسکتا ہے، جیسے ذکر وتلاوت وغیرہ، بہ ہر حال یہ بھی مؤمن کی ایک خاص شان ہے۔)

سیاحت : اس کی ایک تفسیر روزے سے کی گئی ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حسن، ابن جبیر سے مروی ہے۔اس صورت میں ''سائحات'' کے معنی وہی ہوں گے جو پچھلی آیت میں ''صائمات'' کے معنی ہیں۔

اور دوسری تفسیر ہجرت سے کی گئی ہے اور ہجرت کے معنی ہیں، اللہ ورسول کی خاطر اور اپنے دین کی حفاظت کی خاطر اپنے وطن اور گھر بار اور رشتے داروں کو چھوڑ کر

کسی دوسری جگہ چلا جانا،تو یہ صفت دراصل خدا کی محبت میں اور رسول کے عشق میں ہر چیز کو قربان کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اوصاف ایک مؤمن و مسلمان عورت میں ہونے چاہئیں۔ جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں سنورتے ہیں اور وہ دونوں جہاں میں کام یاب ہوتی ہے۔

فصل رابع

مؤمن عورت کے اوصاف احادیث کی روشنی میں

قرآن کے بعد احادیث نبویہ کی طرف آیئے، ان میں دیکھیں کہ عورت کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کن اوصاف وخصوصیات کو لازم قرار دیا ہے، یا مستحسن گردانا ہے۔

دین داری، عورت کا کمال

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لأَرْبَعٍ لِمَا لِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ »(۱)

(عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ مال کی وجہ سے، حسب ونسب کی وجہ سے، جمال وحسن کی وجہ سے اور دین داری کی وجہ سے، پس تو دین دار کو پسند کر کے کام یاب ہو جا۔)

اس حدیث سے یہ سبق دیا گیا ہے کہ نکاح کے لیے ایسی عورت کو پسند کیا جائے جو دین دار ہو۔ وہیں اس بات کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے کہ عورت کا کمال

(۱) بخاری :۲/۷۶۲، مسلم: ۱/۴۷۳، ترمذی: ۱/۲۰۷، نسائی: ۲/۲ ۷۱، ابوداود: ۱/۲۸۰، ابن ماجہ: ۱۳۳، احمد: ۲/۴۲۸

اوراس کی خوبیوں کا معیار نہ مال و دولت ہے، نہ حسن و جمال اور نہ خاندانی عزت و عظمت ؛بل کہ اس کا کمال ''دین داری'' ہے۔جس عورت میں یہ کمال ہو وہ واقعی صاحب کمال ہے اور جس کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ چاہے کتنی حسین کیوں نہ ہو اور حسب ونسب اور خاندانی شرافت میں کتنی ہی آگے کیوں نہ ہو اللہ اور اس کے رسول کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں؛ اس لیے تاکید کی گئی ہے کہ دین دار عورت سے نکاح کرو، اس میں کام یابی ہے۔

عفت و پاک بازی

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمَرْأَۃُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَأَحْصَنَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَیِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ»

(عورت اگر پانچ وقت کی نماز پڑھتی رہے اور رمضان کے روزے رکھ لیا کرے اور اپنی آبرو کی حفاظت رکھے اور اپنے خاوند کی تابع داری کرے، تو ایسی عورت جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔)(۱)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری عورتوں میں سب سے اچھی وہ عورت ہے، جو اپنی آبرو کے بارے میں پارسا ہو۔(۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت کے اندر اپنی آبرو کی حفاظت اور عفت و

---

(۱) مشکاۃ:۲۸۱

(۲) کنز العمال:۴۵۱۵۷

عصمت کا جوہر ہونا چاہئے۔ وہی عورت قابل تعریف اور جنت کی مستحق ہے۔

پردہ وحیا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے پوچھا کہ عورت کے حق میں سب سے بہتر چیز کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم سب خاموش رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میں گھر واپس آیا، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ عورت کے حق میں سب سے بہتر بات کیا ہے؟ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ مردوں کو نہ دیکھے اور نہ مرد اس کو دیکھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کیا، تو آپ نے فرمایا ہاں! فاطمہ تو میرا جز ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا پردہ میں رہنا کہ نہ وہ کسی اجنبی مرد کو دیکھ سکے اور نہ کوئی اجنبی مرد اس کو دیکھ سکے، بہترین صفات میں سے ہے۔

عورت کے لیے پردہ کا حکم قرآن میں بھی صاف طور پر آیا ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (الأحزاب: ۳۳)

(اپنے گھروں میں ٹکی رہو)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو بلاضرورت گھر کے باہر نہ جانا چاہیے؛ بل کہ اپنے گھر میں ٹکی رہنا چاہئے اور اگر بہ ضرورت باہر جانا ہو، تو حکم ہے کہ اپنے آپ کو پردہ میں ڈھانپ کر باہر جائے۔

---

(۱) مسند فاطمة للسيوطي: ۱۱۸

چناں چہ فرمایا:

﴿یاأَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِأَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَا بِیْبِهِنَّ﴾ (الأحزاب:۵۹)

(اے پیغمبر! اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحب زادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیبیوں سے بھی کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر ڈال لیا کریں اپنی چادروں میں سے)

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ عورت اپنے اوپر چادر ڈال لیا کریں، یہی برقعہ کہلاتا ہے۔ غرض بلاضرورت، تو گھر کے باہر ہی نہ جانا چاہیے اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے، تو اپنے آپ کو پوری طرح برقعہ سے ڈھانپ کر جانا چاہئے؛ نیز احادیث میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی پردہ کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا:

«إِنَّ الْمَرْأَةَ تُقْبِلُ فِيْ صُوْرَةِ شَیْطَان وَتُدْبِرُ فِيْ شَیْطَانٍ» (۱)

عورت (جب باہر نکلتی ہے تو) شیطان کی صورت میں سامنے آتی ہے اور شیطان کی صورت میں واپس جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عورت کے باہر جانے آنے سے اس کو دیکھنے والے مردوں کے دلوں میں وسوسہ اور برائی آتی ہے، جیسا کہ شیطان وسوسہ و برائی کا باعث بنتا ہے؛ لہذا عورت کو بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلنا چاہیے۔ (۲)

دوسری حدیث میں فرمایا:

---

(۱) مسلم:۱/۴۴۹

(۲) شرح مسلم للنووی:۱/۴۴۹

« اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ إِذَاخَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ . »(۱)

(کہ عورت جب باہر نکلتی ہے،تو شیطان اس کوتا کتا ہے)

ہاں!اگرضرورت پر نکلے،تو اجازت ہے؛مگر پردہ کے ساتھ نکلنا چاہئے،جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

’’عید کے دن عورتیں عیدگاہ جائیں،حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ بعض عورتوں کے پاس چادر نہیں ہوتی،وہ کیا کریں؟فرمایا کہ اس کی دوسری بہنیں اپنی چادر میں اس کو چھپالیں‘‘(۲)

معلوم ہوا کہ عورت برقعہ یا چادر اوڑھ کر بہ ضرورت باہر جاسکتی ہے بغیر برقعہ وچادر کے نہیں جاسکتی۔اور چادر اوڑھنے کا حکم جیسا کہ اوپر گذرا خود قرآن نے بہ صراحت دیا ہے۔

کیا عورت کے لیے چہرہ کا پردہ ہے؟

عورت کے حجاب میں چہرہ میں داخل ہے یا نہیں؟اس میں بعض جدت پسند لوگوں نے اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے چہرہ کو حجاب سے خارج قرار دینے کی ایک فضول کوشش شروع کررکھی ہے۔

اورحقیقت یہ ہے کہ یہ جدت پسندوں کا طبقہ ہر کام میں غیروں کی تقلید کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے؛اسی لیے ان کے طور طریقوں کو اپنانا چاہتا ہے اور پھر ان میں سے جو لوگ کچھ دین داری کی طرف آجاتے ہیں،وہ اپنی دین داری کو بھی اسی معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں،ان کو علما کا بتایا ہوا دین پسند نہیں آتا؛بل کہ وہ دین میں بھی وہی جدت

---

(۱) ترمذی :۱/۱۲۰،مشکاۃ:۲۶۹

(۲) مسلم:۱/۲۹۱،ابو داؤد:۱/۱۶۱،ابن ماجہ:۹۲،ترمذی:۱/۱۲۰

چاہتے ہیں، جس میں پوری نہیں، تو ذرا سی بے حیائی کی گنجائش ہو، بالکلیہ نہیں، تو کم از کم تھوڑا سا حرام جائز ہو۔

چناں چہ آج کل مغربی ذہن رکھنے والے بعض لوگ مغرب کی ہر بات کو اچھی نگاہ سے دیکھتے اور اس کے لیے قرآن وحدیث کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں، تاکہ مغربی طرز معاشرت پر چلنے کے لیے قرآن وحدیث سے دلیل فراہم ہو جائے، اسی طرح یہ لوگ اولاً اپنے ذہن میں مغربی بے حیائی وعریانی کو جگہ دے لیتے ہیں، پھر قرآن وحدیث میں اپنے اس ذہنی ومزعومہ جواز کو تلاش کرنے لگتے ہیں اور موقع بے موقعہ آیات واحادیث سے استدلال کرنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح تو قرآن وحدیث سے ہر غلط سے غلط بات بھی کوئی غیر معقول آدمی ثابت کرسکتا ہے اور تاریخ میں ایسے افراد اور جماعتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں، جنھوں نے اپنے زمانے کے حالات اور فلسفوں سے مرعوب ومتاثر ہو کے قرآن وحدیث کی تفہیم وتشریح کو ان کے تابع بنادیا اور بہت سی بے تکی باتیں قرآن وحدیث سے ثابت کرنے لگے تھے خوارج، معتزلہ، جبریہ وغیرہ باطل فرقوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیے اور اس طرح کے استدلالات کا ایک انبار آپ کے سامنے آجائے گا۔

اصل یہ ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے اولاً جزئیات سے بحث کرنا اصولاً غلط ہے؛ بل کہ صحیح اصول یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے مقاصد اور شریعت کے منشا کو پیش نظر رکھنا چاہیے، پھر تمام جزئیات کو اس منشا ومقصد پر منطبق کرتے چلے جانا چاہیے، اس نقطہ نظر سے جب ہم مصادر شریعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ قرآن وحدیث کا منشا یہ ہے کہ عورتیں غیر مردوں سے بالکل الگ تھلک رہیں اور اُن سے اِن کا کسی طرح نہ اختلاط ہو، اور نہ آمنا سامنا ہو۔

چناں چہ قرآن پاک کی یہ آیت پڑھیے:

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (الأحزاب: ۳۳)

(اے نبی کی عورتو! تم اپنی گھروں میں ٹکی رہو)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے اصل یہ ہے کہ بلاضرورت گھر کے باہر ہی نہ نکلیں۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ:

﴿وَاِذَا سَأَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَاسْئَلُوْهنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَا بٍ﴾

(اور جب تم ان سے (ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے) کچھ ضرورت کا سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے سوال کرو۔)

(الأحزاب: ۵۳)

اس میں مردوں سے کہا گیا ہے کہ جب تم عورتوں سے کچھ مانگو، تو پردہ کے پیچھے سے مانگو، غور کیجیے کہ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی نا کہ عورت مرد کے سامنے ہی نہ آئے اور مردوں کو ضرورت پڑے، تو وہ پردہ کی آڑ سے ہی ان کے ساتھ معاملہ کرنے کے روادار ہیں۔

نیز قرآن کریم کہتا ہے:

﴿وَلاَيَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَايُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ﴾

(النور: ۳۱)

(عورتیں پیر مار کر نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہوگی)

مفسرین میں سے متعدد حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عورتیں پیروں میں ایسا زیور نہ پہنیں، جو چلنے سے آواز پیدا کرتا ہو اور لوگ عورتوں کی طرف

متوجہ ہوں۔(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو بجتا زیور بھی پہن کر نہ چلنا چاہیے کہ اس سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔ان نکات قرآنیہ؛ بل کہ احکامات الٰہیہ کو سامنے رکھ کر سوچیے کہ عورت کا چہرہ کھلا رکھ کر گھومنا پھرنا کیا ان احکامات سے میل کھاتا ہے؟ یا ان سے ٹکراتا ہے؟ اگر عورت سے بہ ضرورت بات چیت بھی پردہ سے ہونا ہے اور زیور بجتا ہوا پہننا ممنوع ہے؛ کیوں کہ اس سے لوگ عورت کی طرف متوجہ ہوں گے، تو کیا چہرہ کھلا ہوگا، تو لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں ہوگی؟

اس نقطہ نظر سے جب ہم یہ آیت پڑھتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ﴾ (الاحزاب: ۵۹)

(اے نبی! آپ اپنی عورتوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرما دیں کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں کھینچ لیں)

تو معاً یہی بات مفہوم ہوتی ہے کہ اپنے سروں، چہروں اور اپنی پوری شخصیت کو ڈھانپ لیں اور اس سے یہ مفہوم نکالنا کہ ''چہرہ چھوڑ کر اپنے اوپر چادر ڈال لیں'' ہوسکتا ہے کہ کسی مغربی تہذیب کے دل دادہ کے ذہن کے خراش وتراش کا نتیجہ ہو تو ہو؛ لیکن قرآن وسنت کے مجموعی فکر اور اسلامی مقاصد ومنشا کو سامنے رکھنے والے کے ذہن میں کبھی یہ مفہوم ذہن میں نہیں آسکتا۔

چناں چہ حضرات صحابیات نے اس آیت کو سنا، تو چہرہ کا بھی پردہ ضروری سمجھا۔ حضرت عبیدہ السلمانی رحمۃ اللہ نے خود اپنے شاگردوں کو بتایا کہ اس طرح چادر ڈالی

(۱) دیکھو طبری:۹/۱۰

جاتی ہے اورانہوں نے چادر لے کراوپر ڈال لیا اوراپنی ناک وبائیں آنکھ بھی چھپالی اورصرف دائیں آنکھ کھلی رکھی۔(۱)

اورابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتیں چہرہ اورسر چھپالیں۔(۲)

اس آیت کا یہی مطلب متعدد مفسرین نے صراحت سے بیان کیا ہے۔اب آیئے دیکھتے ہیں کہ صحابیات کا کیا معمول تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ جس میں آپ پر منافقین نے تہمت لگائی تھی،اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک طرف کواکیلی بیٹھی ہوئی تھی،ادھر سے حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ آئے اورانہوں نے مجھے پہچان لیا؛ کیوں کہ وہ حجاب کے نزول سے پہلے مجھے دیکھ چکے تھے،پس میں نے ان کو دیکھا تو:

«فَخَمَّرْتُ وَجْهِي بِجِلْبَابِي.» (۳)

(میں نے اپنا چہرہ اپنے جلباب یعنی چادر سے ڈھانک لیا۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث پر فوائد بیان کرتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کواپنا چہرہ نیک وبد ہرایک سے چھپانا ہے۔(۴)

نیز ابوداؤدونسائی نے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے پردہ کے پیچھے سے ایک خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا چاہا،تو آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اورفرمایا کہ

(۱) طبری:۲۲/۴۶،ابن کثیر:۳/۵۳۵
(۲) طبری:۳۳۲
(۳) بخاری:۲/۵۹۴
(۴) شرح مسلم:۲/۳۶۰

معلوم نہیں کہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اور اس عورت نے عرض کیا کہ عورت کا، تو فرمایا کہ اپنے ناخنوں کو مہندی سے رنگ لو۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چہرہ کھول کر نہیں آیا کرتی تھیں؛ بل کہ وہ پردہ کے آڑ سے گفتگو کرتی تھیں۔

نیز حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام پہننے والی عورت کو نقاب پہننے سے منع فرمایا۔(۲)

اور ''لاتنقب'' (نقاب نہ پہنیں) کا مطلب علمائے حدیث نے یہ بتایا ہے کہ ''لا تستسر وجهها'' کہ اپنا چہرہ نہ ڈھانپیں۔(۳)

اب غور کرنا چاہیے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں عورت کو چہرہ ڈھانپنے سے منع فرمایا، تو اس سے مطلب یہی ہوگا اور ہونا چاہئے کہ عام حالات میں عورت کو چہرہ ڈھانپنا ہے، تبھی تو احرام کی حالت میں اس سے منع فرمایا اور اس منع سے بھی یہ مراد ہے کہ کپڑا چہرہ پر ڈال لیا جائے اور اگر چہرہ پر کپڑا لگائے بغیر چہرہ کو حالت احرام میں بھی چھپایا جائے، تو یہ منع نہیں ہے؛ بل کہ صحابیات کا عمل یہی تھا کہ وہ اس حالت میں بھی غیر مردوں سے اپنا چہرہ چھپاتی تھیں۔

چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَنَحْنُ مُحْرِمُوْنَ، فَإِذَا مَرَّ بِنَا الرَّاكِبُ سُدَّلْنَا الثَّوْبُ عَلَىٰ وَجْهِنَا وَإِذَا جَاوَزْنَا

(۱) ابو داود:۴۱۶۶، نسائی:۵۰۸۹

(۲) بخاری:۱۷۴۱، ابو داود:۱۸۲۷، ابن خزیمہ:۲۵۹۰، ترمذی:۸۳۳، نسائی: ۲۶۷۳ وغیرہ

(۳) فتح الباری:۴/۵۴، تحفۃ الاحوذی:۳/۴۸۴، عون المعبود:۵/۱۹۰

كَشَفْنَاهُ »(۱)

(ہم اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ حالت احرام میں ہوتے تھے پس جب کوئی سوار ہماری طرف سے گزرتا، تو ہم اپنے چہرہ پر کپڑا کھینچ لیتے اور جب وہ آگے بڑھ جاتا، تو ہم چہرہ کھول لیتے تھے)

اور یہی بات بھی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔(۲)

معلوم ہوا کہ عام حالات میں تو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی ہی اوراحرام کی حالت میں بھی اس طرح وہ اپنا چہرہ چھپائے گی کہ کپڑا چہرہ سے نہ لگے، تاہم احرام کی حالت میں چہرہ چھپانا علما میں مختلف فیہ ہے، جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اکثر یہی فرماتے ہیں کہ چہرہ پر کپڑا اڈالنا تو منع ہے؛ لیکن غیر مردوں سے اس طرح چہرہ چھپانا چاہئے کہ چہرے کو کپڑا نہ لگے۔ ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ ہے۔

اب رہا یہ استدلال کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں؛ لہٰذا یہ اس لیے حکم ہے کہ عورت کا چہرہ کھلا ہوتا ہے؛ اس لیے مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کو نہ دیکھیں، ورنہ ان کو کیوں اس کا مکلّف کیا جاتا؟

یہ استدلال اگرچہ بعض بڑے حضرات جیسے قاضی عیاض وغیرہ سے منقول ہے تاہم یہ انتہائی مخدوش ہے کیوں کہ:

اولاً یہ کیا ضروری ہے کہ اس سے صرف مسلمان عورتوں سے نظریں بچانے کا

---

(۱) ابن خزیمہ:۴/۲۰۴، ابو داود:۱۸۳۳، بیھقی فی السنن:۵/۴۸،ابن ابی شیبہ: ۳/۲۸۴

(۲) معجم کبیر طبرانی:۲۳/ ۲۸، مجمع الزوائد:۳/۲۴۰

مفہوم نکالا جائے؟ ہوسکتا ہے کہ اس سے کافر عورتوں سے بھی نظریں بچانے کا حکم دیا گیا ہو، جو مطلقاً پردہ ہی نہیں کرتیں، اور یہی صحیح ہے۔

دوسرے یہ کیا ضروری ہے کہ اس آیت سے صرف عورتوں کے چہرے سے نظر بچانے کا مفہوم اخذ کیا جائے؟ کیا عورتوں کا صرف چہرہ دیکھنا ہی منع ہے؟ علما نے تصریح کی ہے کہ اگر عورت کو بہ نظر شہوت کپڑوں کے اوپر سے بھی دیکھے گا، تو حرام ہوگا۔(۱)

لہٰذا چہرہ ڈھکا ہوا ہونے کے باوجود بھی اس سے نگاہ نیچی رکھنا ضروری ہے۔

تیسرے یہ استدلال اس لیے بھی غلط ہے کہ اگر اس آیت کے حکم سے مسلمان مرد اپنی نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں اور اس لیے عورت کو چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے، تو اس سے صرف یہ معلوم ہوا کہ مؤمن مردوں کے سامنے اور وہ بھی جب کہ اس آیت پر وہ عمل کرتے ہوں تب عورت کو چہرہ کھولنے یا کھلا رکھنے کی اجازت ہے؛ لیکن کافر مردوں اور فاسق مردوں کے سامنے کھولنے یا کھلے رکھنے کا کیا جواز ہے؟

اب اس کے بعد عقلی نقطہ نظر سے بھی غور کیجیے کہ عورت کا حسن و جمال جس قدر اس کے چہرہ سے ظاہر ہوتا ہے کسی اور سے اس قدر نہیں ہوتا، تو یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ پورا جسم تو اس کا چھپایا جائے اور اس کے چھپانے کا مقصد اس کی عفت و عصمت کا تحفظ ہو؛ مگر اس عفت و عصمت پر جہاں سے سب سے زیادہ حملہ کا امکان ہے اس راستہ کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ چوروں کے خطرہ سے گھر کے چھوٹے موٹے سوراخ اور کھڑکیاں اور روشن دان سب بند کر کے گھر کا بڑا پھاٹک کھلا رہنے دیا جائے۔ یہ بات اس قدر خلاف عقل ہے کہ کوئی موٹی عقل والا بھی اس

---

(۱) التمهيد لابن عبد البر: ٦/ ٣٦٥

کو روا رکھنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

سلسلہ کلام جب دراز ہو ہی گیا ہے، تو یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ اس مسئلے میں بعض لوگوں کو ایک حدیث سے بھی غلط فہمی ہوئی ہے کہ ابوداؤد نے حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور ان پر باریک قسم کے کپڑے تھے، تو آپ نے ان سے فرمایا:

''اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس اور اس حصہ کے سوا کچھ اس میں سے نظر آئے، اور آپ نے ہاتھ کی ہتھیلیوں اور چہروں کی طرف اشارہ کیا۔(۱)

اس سے ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے عورت کو چہرہ کھلا رکھ کر پھرنے کی اجازت دی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے:

اولاً تو یہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، ایک تو اس لیے کہ اس کے راویوں میں سعید بن بشیر ایک راوی ضعیف ہے، دوسرے امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو خالد بن دریک نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور خالد کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات نہیں ہے، لہٰذا روایت منقطع ہے۔(۲)

دوسرے اس حدیث میں عورت کے حجاب کا مسئلہ نہیں؛ بل کہ اس کے ستر کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کو تنہائی میں بھی اور گھر میں بھی جس طرح کے کپڑے پہننا ہے وہ یہ ہے، اس حدیث میں حجاب کا مسئلہ نہیں بیان کیا گیا ہے، کہ عورت باہر

---

(۱) ابوداود:۴۱۰۴

(۲) عون المعبود:۱۱/۱۰۹، والدرایۃ:۱/۲۳، التلخیص الحبیر:۳/۴۳

جانے اور غیر مردوں کے سامنے ظاہر ہونے کی صورت میں چہرہ اور کھلا رکھ سکتی ہے۔

اور معلوم ہونا چاہئے کہ ستر اور حجاب میں فرق ہے، ستر تو مرد و عورت دونوں کے لیے ہے؛ حتیٰ کہ مثلاً نماز تنہائی میں بھی پڑھتے ہوئے ستر کو چھپانا ضروری ہے، مرد کے لیے بھی عورت کے لیے بھی، البتہ مرد کے لیے ستر کے حدود الگ ہیں اور عورت کے ستر کے حدود الگ ہیں۔ مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنے تک ستر ہے اور عورت کے لیے سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے پورا جسم ستر ہے۔ اور بعض نے قدموں (پیروں کو بھی) ستر سے خارج مانا ہے۔ جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔ تو مذکورہ حدیث میں اسی ستر کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کا حجاب والے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور حجاب صرف عورت کے لیے ہوتا ہے ہاں! حجاب میں چہرہ داخل ہے یا نہیں اس پر تین ائمہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ہاں داخل ہے اور ہر حال میں اس کو چھپانا غیر مردوں سے ضروری ہے، چاہے فتنہ کا خوف ہو یا نہ ہو اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ چہرہ کا چھپانا اس صورت میں ضروری ہے کہ جب کہ فتنہ کا خوف ہو، ورنہ ضروری نہیں۔ (۱)

مگر کون نہیں جانتا کہ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا قول اپنے زمانہ کے لحاظ سے ہے جو خیر القرون تھا، شر کے بہ جائے خیر کو غلبہ تھا، اور آج شر کو غلبہ ہے اور شہوتوں کی بھٹی بھڑکا دی گئی ہے، اس صورت حال میں چاروں ائمہ کے نزدیک ایک ہی مسئلہ ہو گیا کہ عورت کو چہرہ چھپانا ضروری ہے۔

لہذا ان دلائل کی روشنی میں بالتفصیل یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں عورت کو چہرہ بھی چھپانا لازم و ضروری ہے۔

---

(۱) دیکھو تفسیر معارف القرآن: ۷/ ۲۱۷ تا ۲۲۰

گھریلو کام کی عادت

عورت کے لیے گھریلو کام کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے اور بلا لحاظ مذہب و ملت، ہر قوم اور مذہب کے لوگوں میں اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو اس کی مشق و عادت ڈالی جاتی ہے؛ مگر یوروپ و مغرب کے حیا سوز کلچر نے جہاں اور بہت سارے حقائق بدل دیئے ہیں، اس حقیقت کے اوپر بھی پردہ ڈال دیا ہے اور اب لڑکیاں گھریلو کام اہم و اقدم سمجھنے کے بہ جائے غیر اہم؛ بل کہ اپنی شان سے گرا ہوا خیال کرنے لگی ہیں اور گھریلو کام کے بہ جائے دفتری و بازاری کام کو ترجیح دینے لگی ہیں اور انتہائی بے حیائی و بے غیرتی پر اتر آئی ہیں۔

اسلام نے عورت کے لیے گھریلو کام کی اہمیت وفضیلت بیان کی ہے۔ حدیث پاک میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ عورت کا اپنے گھر میں گرہستی کا کام کرنا اس کو جہاد کے رتبے کو پہنچاتا ہے۔ (۱)

اللہ اکبر! کیا فضیلت و اہمیت ہے، اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظر میں گھریلو کام کی، کہ اس کو جہاد کے برابر قرار دیا ہے۔ لہذا عورتوں کو چاہئے کہ وہ گھریلو کاموں کو فوقیت دیں اور اپنی بچیوں کو اس کی تربیت دیں؛ ورنہ جو عورتیں گھریلو کام کو ترک کر کے باہر کے کاموں کو ترجیح دیتی ہیں، وہ آخر کار نکمی ہو جاتی ہیں اور ان سے گھریلو زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مغربی مصنف و مفکر ژول سلیمان نے لکھا ہے:

> ”آج عورتوں نے پارچہ بافی کی مشینوں اور چھاپہ خانوں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ حکومت نے ان سے اپنے کارخانوں میں کام

---

(۱) کنز العمال:۴۵۱۳۸

لینا شروع کر دیا ہے۔ اور وہ گو اس ذریعہ سے کچھ ٹکے کما لیتی ہیں؛ لیکن اسی کے مقابلے میں انہوں نے اپنے گھروں کی بنیاد کھود ڈالی اور ان کو برباد کر دیا ہے۔

آگے لکھتا ہے:

''ملازمت نے ان عورتوں کو منزلی (گھریلو) زندگی سے بہت دور کر دیا ہے اور گھرانوں کی رونق کو مٹا رہی ہیں۔''(۱)

یہ ایک مغربی مفکر کا بیان ہے جو آپ نے پڑھا اور یہ مغربی علاقوں کی حالت بیان کی گئی ہے، جس کو لوگ حسن ظن کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جس کی ہر ادا ہمارے دلوں کو بھاتی ہے۔

خود اہل مغرب بھی عورت کے لیے گھریلو کام کی اہمیت کے قائل ہیں۔

ایک مغربی مصنف leo kinsella نے اپنی کتاب The ideal wife میں بہت تفصیل سے اس پر لکھا ہے اور باہر جا کر کام کرنے کی مذمت کی ہے، یہاں اس کا صرف ایک جملہ نقل کرتا ہوں:

It is almost impossibale for the wife to remain qween of the home if she works .

(p;136)

''یعنی یہ بات بہت حد تک بیوی کے لیے ناممکن ہے کہ وہ گھر کی ملکہ بنی رہے اگر وہ (باہر جا کر) کام کرتی ہو''

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کون ہو سکتی ہیں؟ وہ اپنے گھر میں خود کام کرتی

(۱) بہ حوالہ مسلمان عورت:۲۱۱

تھیں؛حتیٰ کہ چکی پیستی تھیں اور دیگر گھریلو کام کرتی تھیں،جس سے ان کے ہاتھ سخت ہوگئے تھے، کندھے پر پانی اٹھالاتی تھیں،جس سے ان کی گردن پرنشان پڑ گئے تھے۔اور جب انہوں نے اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اس کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ فاطمہ!صبر کراور بہترین عورت وہ ہے، جو اپنے گھر والوں کے کام آئے۔(۱)

علم دین کی طلب وتڑپ

علم دین کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے،خواہ وہ عورت ہو یا مرد ہو؛مگر عام طور پرعورتوں میں علم دین کی کمی اور علم دین کے طلب کی کمی پائی جاتی ہے۔صحابیات و تابعات کودیکھوان کے اندرعلم دین کی طلب اوراس کے لیےتڑپ کس قدرتھی؟

حدیث ہی میں ہے کہ صحابیات نے اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے عرض کیا کہ مرد(دین کے بارے میں)غالب آ گئے یعنی دین کی باتین سننےاورعلم حاصل کرنے کے مواقع ان کوزیادہ ملتے ہیں؛لہذا آپ ہمارے لیے ایک دن مقرر فرما دیجئے (اس میں آپ ہم کودین کی باتیں سکھائیں)چناں چہ آپ نے ان سے ایک دن کاوعدہ فرمالیا(ایک دن مقرر کردیا۔)(۲)

اس حدیث سے حضرات صحابیات کا ذوق وشوق علم دین کے سلسلے میں معلوم ہوتا ہے،حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ عَنْہا نے ایک موقعہ پر انصاری عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''بہترین عورتیں،انصار کی عورتیں ہیں، کہ حیاوشرم نے ان کودین

---

(۱) دیکھو فتح الباری:۱۱/۱۱۹-۱۲۱

(۲) بخاری:۱/۲۰

میں تفقہ اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے سے باز نہیں رکھا۔‘‘(۱)

دیکھیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انصاری صحابیات کی تعریف میں فرمایا کہ حیا وشرم کے باوجود دین کا علم حاصل کرتی تھیں؛ اس لیے وہ بہترین عورتیں ہیں۔ چناں چہ بہت سے مسائل کی تحقیق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں نے کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات دیئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تمام صحابیات میں سب سے زیادہ احادیث روایت فرمائی ہیں۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد دو ہزار دوسو دس (۲۲۱۰) ہے۔ اور تمام صحابہ کرام میں کثرت روایت کے لحاظ سے ان کا چھٹا نمبر ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں سے جلیل القدر حضرات بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مشکل مسائل پوچھا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر فقہ اور طب (ڈاکٹری) اور شاعری کا جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

حضرت امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تمام صحابیات کا علم ایک جگہ رکھا جائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم سب پر بھاری ہو جائے گا۔(۲)

مثال کے طور پر یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کیا گیا، ورنہ تاریخ میں حضرات صحابیات وتابعات کی زندگیوں کا جو نقشہ دیا گیا ہے، وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ وہ سب کی سب علم دین کی طلب وجستجو میں لگی رہتی تھیں اور اس طلب اور جستجو نے ان کو

---

(۱) بخاری:۱/۲۴

(۲) تہذیب التہذیب:۱۲/۵۳۵

علم کے بلند مقام پر فائز کیا۔

عبادت وتقویٰ

عورت کے لیے جس طرح دین کی ضرورت ہے، اسی طرح عبادت واطاعت، تقویٰ و پرہیز گاری کی بھی ضرورت ہے۔قرآن میں جو صفات عورتوں کی بیان ہوئی ہیں، ان میں ایک صفت ''قانتات''(عبادت و اطاعت کرنے والی عورتیں) مذکور ہے۔اور ایک جگہ ''عابدات''(عبادت و اطاعت کرنے والیاں) کا ذکر ہے؛ نیز حدیث میں ارشاد ہے کہ جو عورت پانچ وقت نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی عصمت کی حفاظت کرے اور شوہر کی اطاعت کرے، وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے (یہ حدیث اوپر حوالہ کے ساتھ گذر چکی ہے)

اس حدیث میں بھی عبادت وتقویٰ کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے۔نماز روزہ کا ذکر، عبادت کی طرف اشارہ ہے اور عفت و عصمت سے تقویٰ و پرہیز گاری کی طرف اشارہ ہے اور شوہر کی اطاعت کا ذکر معاشرت واخلاق کی طرف اشارہ ہے۔

لہٰذا عورت کو چاہئے کہ عبادت و اطاعت اور تقویٰ اور پرہیز گاری کا شوق اپنے اندر پیدا کرے۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

> اللہ اس مرد پر رحم کرے جو رات میں اٹھ کر نماز (تہجد) پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی جگائے، اگر وہ نہ اٹھے، تو اس کے چہرہ پر پانی چھڑکے۔ اور اللہ اس عورت پر رحم کرے جو رات میں اٹھ کر نماز (تہجد) پڑھے اور اپنے شوہر کو بھی اٹھائے، اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرہ پر پانی چھڑکے۔(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جب آدمی

(۱) ابو داود:۱/۱۸۵، ابن ماجہ:۹۴، نسائی:۱/۲۳۹

اپنی بیوی کو رات میں اٹھاتا ہے پھر دونوں نماز پڑھتے ہیں تو ان کو ذاکرین میں لکھا جاتا ہے۔(۱)

عورت کے لیے تہجد کی ترغیب ہے، تو پھر فرض کی کتنی اہمیت ہوگی، اس کا اندازہ خود لگائیے۔

الغرض اپنے آپ کو عبادت واطاعت کے لیے مستعد کرنا چاہیے۔

ذکر وتلاوت کی پابندی

عورت کے لیے ذکر واذکار، تسبیح وتلاوت کی پابندی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے اس کے دنیوی و گھریلو مشاغل میں بھی نورانیت و روحانیت نیز سہولت و آسانی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنے مشاغل اور گھریلو کام کی مشقت کا ذکر کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر ایک خادم عطا فرمانے کی درخواست کی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسبیح و ذکر کی تلقین فرمائی تھی۔

چناں چہ روایات میں اس کی تفصیل اس طرح آتی ہے:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے چاہا کہ چوں کہ گھریلو کاموں کی زیادتی اور سختی سے بہت پریشانی ہے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ چکی پیس پیس کر سخت ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کنویں سے پانی بھرا کرتے ہیں، اس سے ان کے سینے میں درد کی شکایت پیدا ہو گئی۔اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی پانی اٹھایا کرتیں، جس سے ان کی گردن میں نشان ہو گئے۔اور دیگر گھریلو مصروفیات سے ان کے کپڑے بھی خراب

(۱) ابو داود:۱/ ۱۸۵،ابن ماجہ:۹۴

وخستہ ہوجاتے۔اور روٹیاں پکانے کی وجہ سے (دھویں نے) چہرہ کا رنگ بدل دیا؛اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک غلام یا خادم مانگ لیں۔جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پہنچے،تو آپ وہاں موجود نہ تھے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کرکے واپس چلی آئیں اور جب رات ہوچکی اور یہ حضرات بستر پر چلے گئے،تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لائے۔اوران دونوں کے درمیان میں آپ بیٹھ گئے اور معلوم کیا کہ بیٹی! کیا بات تھی، جو تم آئی تھیں؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے عرض کرتے ہوئے شرم آئی، اس لیے کہہ دیا کہ سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی، پھر بعد میں بتایا کہ یہ پریشانی تھی،تو آپ نے یہ پریشانی ومشقت سن کر فرمایا کہ کیا میں تمہیں خادم سے بہتر چیز نہ بتاؤں؟

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فاطمہ!تم جس چیز کا مطالبہ کررہی ہووہ تمہیں زیادہ پسند ہے یا وہ جو اس سے بہتر چیز ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چٹکی لی اور(آہستہ سے) کہا کہ تم یہ بولو کہ خادم سے بہتر جو چیز ہے وہ پسند ہے۔غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم بستر پر جاؤ،تو چونتیس (۳۴) مرتبہ اللہ اکبر،تینتیس (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ اور تینتیس (۳۳) دفعہ الحمد للہ پڑھو، یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔(۱)

(۱) بخاری:۲/ ۸۰۷،فتح الباری:۱۱/ ۱۱۹،۱۲۱

اس میں گھریلو کام کی مشقت سن کر نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو ذکر و تسبیح کی تعلیم دی ہے، اس کی وجہ بعض علما نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جو اللہ کے ذکر پر پابندی کرتا ہے، اس کو اس سے زیادہ قوت ملتی ہے جتنی کہ خادم کے کام کرنے سے ملتی ہے؛ نیز اس کا کام کرنا آسان وسہل ہو جاتا ہے۔(۱)

(۱) فتح الباری:۹/۵۰۶

فصل خامس

عورت کے لیے ناپسندیدہ صفات واعمال

عورت کے لیے جس طرح بعض اعمال واوصاف پسندیدہ ہیں، اسی طرح بعض اعمال واوصاف اس کے لیے ناپسندیدہ بھی ہیں، جن سے اس کو بچنا اور پرہیز کرنا چاہئے۔

جاہلی تبرج

قرآن پاک کے اندر عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

﴿وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى﴾ (الأحزاب ۔۳۳)

(تم عورتیں قدیم جاہلی طریقہ پر (اپنی زینت) دکھاتی ہوئی نہ پھرا کرو)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عورتیں بے پردہ پھرتی اور اپنے بدن اور لباس کی زیبائش کا علانیہ مظاہرہ کرتی تھیں۔ اس بد اخلاقی و بے حیائی کی روش کو مقدس اسلام کب برداشت کرسکتا ہے؟ اس نے عورتوں کو حکم دیا کہ گھروں میں ٹھہریں اور زمانہ جاہلیت کی طرح باہر نکل کر حسن و جمال کی نمائش کرتی نہ پھریں۔(۱)

---

(۱) فوائد بر ترجمہ شیخ الہند رحمہ اللہ :۵٦١

اس آیت اور اس کی تفسیر سے واضح ہوا کہ اسلام کی نظر میں عورت کا بے حیائی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرنا اور باہر گھومنا پھرنا ناپسندیدہ عمل ہے۔

مگر افسوس کہ آج یہ جاہلی رسم وطریقہ ''فیشن'' کے نام سے پوری بے حیائیوں اور انتہائی درجہ کی بے شرمیوں کے ساتھ معاشرہ میں رواج پایا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کے اندر بھی اب یہ کوئی نئ و منکر بات نہ رہی، بے شمار خاندان ایسے ہیں جن میں اس بے حیائی و بے شرمی کو تہذیب وشائستگی کا قائم مقام سمجھ لیا گیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کا آزادنہ اختلاط، آپس میں بے شرمی و بے حیائی کا مظاہرہ اور غیر محرم کے سامنے زیب وزینت کا اظہار ایک ''فیشن'' کی حیثیت اختیار کر لیا گیا ہے؛ مگر معلوم ہے کہ اس کے نتائج کیا ظاہر ہو رہے ہیں؟

خدا کی قسم اس کو بیان کرنے کی قوت و طاقت نہ زبان میں ہے اور نہ قلم میں ہے، لکھنے والوں نے ہمت کر کے اس پر بہت کچھ لکھا ہے نہ صرف مسلمانوں نے؛ بل کہ مغربی ویوروپی اہل قلم نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ امریکہ کا ایک مصنف لکھتا ہے۔

''ہماری آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ آج کل جن حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس قدر غیر فطری ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو دس پندرہ برس کی عمر ہی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ نہایت افسوس ناک ہوتا ہے۔ اس قسم کی قبل از وقت صنفی دلچسپیوں سے بہت برے نتائج رونما ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں۔ ان کا کم از کم نتیجہ یہ ہے کہ نوعمر لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں یا کم سنی میں شادیاں کر لیتی ہیں۔ اور اگر

محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے،تو خودکشی کرلیتی ہیں۔(۱)

اس افسوس ناک نتیجے کومزید قوت پہنچانے کے بہ جائے اس کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

عورت کی امارت

اسلام میں عورت کے حقوق اور حدود مرد کے حقوق وحدود کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ہاں کم نہیں ہیں۔ حقوق کا مختلف ہونا اور بات ہے اور حقوق کا کم ہونا بالکل دوسری بات؛ مگر اکثر لوگ اپنی ناسمجھی سے ان دونوں کو ایک خیال کرتے ہیں اور اسلام پر الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ عورتوں کو پورے حقوق نہیں دیتا، حال آں کہ یہ سراسر غلط ہے۔

اسلام نے عورت کے لیے کام کا ایک دائرہ مقرر کیا ہے اور مرد کے لیے دوسرا دائرہ، عورت گھر کی ملکہ ہے اور مرد گھر سے باہر کے امور پر دسترس رکھتا ہے۔ لہذا ان تمام کاموں کو جو عورت کے دائرہ سے خارج ہیں، اسلام ان کو عورت کے حق سے خارج قرار دیتا ہے۔ اسی میں سے عورت کی امارت اور ولایت کا مسئلہ بھی ہے۔

جمہور علما؛ بل کہ سبھی علما کا اس پر ہمیشہ سے اتفاق چلا آرہا ہے کہ عورت کسی قومی وملی کام کی متولی ووالی و حاکم و سردار نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے امور کی والی عورت کو مقرر کرے۔(۲)

مگر حیرت ہے کہ آج کے دور میں خود بعض اہل اسلام بھی اس حدیث کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اور اب جگہ جگہ عورتیں الیکشن میں حصہ لیتی نظر آرہی ہیں اور بہت سی

---

(۱) بہ حوالہ پردہ:۷۷

(۲) بخاری:۲/ ۶۲۷، نسائی:۲/۳۰۴، ترمذی:۲/۵۲

جگہوں پر عوام الناس عورتوں کو کام یاب بنانے، ان کے حق میں ووٹ بھی دیتے ہیں۔ حالاں کہ عورت کو ووٹ دینا دراصل اس کو والی بنانا ہے، جو حدیث کی رو سے صراحۃً ممنوع ہے۔ اور ایسی قوم کو اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ناکام قوم قرار دیا ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ بعض اسلامی ممالک میں عورتیں وزیر اعظم بنی ہوئی ہیں۔ اگر وہ ناجائز تھا، تو وہاں یہ کیوں کر ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے کام ہوتے ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی، اچھے بھی اور برے بھی، اس سے اس بات پر استدلال کرنا کہ شرعاً یہ جائز ہے، اصولاً غلط اور بے موقعہ ہے اور جن اسلامی ممالک کا حوالہ اس سلسلے میں دیا جاتا ہے وہ درحقیقت اسلامی ممالک کہلانے کے مستحق ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کو مسلم ممالک کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اسلامی ملک وہ ہے جہاں اسلامی قوانین اور شریعت کو آئین و دستور قرار دیا گیا ہو اور ان ممالک میں شریعت کو آج تک بہ حیثیت دستور تسلیم ہی نہیں کیا گیا، تو وہاں کے کسی قانون اور طریقہ کو بہ طور حجت پیش کرنا سادہ لوحی اور اصول سے عدم واقفیت ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

بے حیائی و بے پردگی

عورت کی عمدہ صفات میں بتایا گیا ہے کہ اس کو باحیا اور باپردہ ہونا چاہئے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ اس کے حق میں بے حیائی اور بے پردگی اچھی چیز نہیں۔ اس سلسلے کے چند احکامات سن لیجئے۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ﴾

(النور: ۳۱)

(اور عورتیں اپنے پیر (زور سے) نہ ماریں تا کہ ان کی مخفی زینت ظاہر نہ ہو جائے)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت اتنی باحیا اور باپردہ ہونا چاہئے کہ اس کے پیروں کی آواز اور زیور کی جھنکار بھی مردوں کو محسوس نہ ہو۔ نیز جس طرح مردوں کو حکم ہے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی اور شرم گاہ کو محفوظ رکھیں، اسی طرح عورتوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ (النور :۳۱)

ایک دفعہ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو ایک نابینا صحابی تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور آپ کے پاس اس وقت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ نے ان دونوں سے فرمایا کہ تم پردہ میں چلی جاؤ، ان ازواج مطہرات نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ صحابی اندھے نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا تم دونوں بھی اندھی ہو اور ان کو تم نہیں دیکھ سکتیں؟ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح مردوں کو حکم ہے کہ عورتوں پر نگاہ نہ ڈالیں، اسی طرح عورتوں کو بھی حکم ہے کہ مردوں پر نظر نہ ڈالیں۔

قرآن میں ہے کہ:

"اگر مرد غیر محرم عورتوں سے کچھ مانگنا چاہیں تو پردہ کی آڑ سے مانگیں"۔ (الأحزاب :۵۳)

نیز فرمایا کہ:

"غیر مردوں سے نرمی کے ساتھ بات نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے، وہ کہیں لالچ نہ کرے"۔ (الأحزاب :۳۲)

---

(۱) المشکاة:۲۶۹

نیز حدیث میں ہے کہ: رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ عورت جب عطر لگا کر کسی مجلس پر سے گذرے، تو وہ ایسی اور ایسی یعنی زانیہ ہے۔(۱)

ان ساری تعلیمات کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ عورت ہر طرح کی بے حیائی و بے پردگی سے مکمل پرہیز کرے یہی عورت کی شان اور اسی میں اس کا کمال ہے۔

مردوں سے مشابہت

عورت کا اصل حسن و جمال اس میں ہے کہ عورت عورت رہے۔ اللہ نے عورت کو جن خوبیوں اور کمالات سے ممتاز کیا ہے، اس کا حق ہے کہ عورت اپنی ان خوبیوں وکمالات کو باقی رکھے۔ اس لیے شریعت نے حکم دیا کہ عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار نہ کریں۔

چناں چہ ایک حدیث میں ہے:

رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت فرمائی ہے۔(۲)

افسوس کہ آج یوروپ و امریکہ کی تہذیب جدید نے جہاں اور بہت سی بے حیائیوں کو جنم دیا اور پھیلایا ہے، وہیں مردوں اور عورتوں میں فرق و امتیاز کو بھی ختم کر دیا ہے۔ عورتیں لباس و پوشاک، وضع قطع، طرز و انداز سب چیزوں میں مردوں کی نقالی ومشابہت اختیار کرنے لگی ہیں اور اس غیر فطری روش وطریقے کو فیشن کا نام دے کر بہ طور فخر اختیار کیا جاتا ہے۔

(۱) ترمذی: ۲/ ۱۰۷، ابو داؤد: ۲/ ۵۷۵، نسائی: ۲/ ۲۸۲

(۲) ترمذی: ۲/ ۱۰۶، ابو داؤد: ۲/ ۵۷۶، بخاری: ۲/ ۸۷۴، ابن ماجہ: ۱۳۷

یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے ایک طرف آخرت کی تباہی و ہلاکت ہے،تو دوسری طرف دنیوی اعتبار سے بھی یہ نقصان دہ ہے؛ کیوں کہ اس سے عورت کی نفسیات اور اس کی نسوانی خصوصیات متاثر ہوتی ہیں اور وہ پھر نہ مردوں میں شمار کرنے کے قابل رہتی ہے اور نہ عورتوں میں گننے کے لائق ؛ کیوں کہ ظاہری وضع قطع اور لباس و پوشاک اور طرز و انداز کا اثر نفسیات پر ضرور ہوتا ہے ۔ اور جدید تحقیقات نے بھی اس کی تصدیق وتوثیق کی ہے؛ اس لیے عورت کو صرف عورت بن کر رہنا چاہئے ۔

باریک کپڑے پہننا

عورت کے لیے حیا و پردہ کی ضرورت و اہمیت اور بے حیائی و بے پردگی کی برائی و مذمت اوپر عرض کی گئی ہے۔ اسی میں سے یہ بھی ہے کہ عورت اتنا باریک کپڑا نہ پہنے، جس سے اس کا بدن ظاہر ہو۔ حدیث میں ہے کہ حضرت اسماء بنت ابو بکر ﷞ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس وقت ان کے بدن پر باریک کپڑے تھے ۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے منہ موڑ لیا اور فرمایا:

> اے اسماء! عورت جب بالغ ہو جائے ،تو اس کو لائق نہیں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے ؛ مگر چہرہ اور ہاتھ ۔(۱)

ایک حدیث میں بہ طور پیشین گوئی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوزخیوں کی دو قسم ایسی ہیں، جن کو میں نے دیکھا نہیں ،یعنی میرے بعد ظاہر ہوں گی، ان میں سے ایک یہ فرمایا کہ ایسی عورتیں جو کپڑے پہنی ہوں گی ؛ مگر ننگی ہوں گی ۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنت میں نہ داخل ہوسکیں گی اور نہ جنت کی خوش بو پائیں

---

(۱) ابو داؤد:۲/ ۵٦۷ ، المشکاۃ:۳۷۷

گی، حالاں کہ جنت کی خوش بو اتنی دور سے محسوس کی جا سکے گی۔ (۱)

اس حدیث میں جو فرمایا گیا کہ کپڑے پہنی ہوں گی؛ مگر ننگی ہوں گی۔ اس کا ایک مطلب علما نے یہ بیان کیا ہے کہ اتنے باریک کپڑے پہنے کہ بدن اندر سے جھلکنے لگے۔ (۲)

اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ ایسا لباس پہننے والی عورتیں جنت میں داخل نہ ہو سکیں گی اور نہ جنت کی خوش بو پائیں گی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک دفعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بنت عبد الرحمان حاضر ہوئیں اور باریک و پتلا دو پٹہ اوڑھے ہوئی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس دو پٹہ کو لیا اور پھاڑ ڈالا، پھر ایک موٹی اوڑھنی ان کو اڑھائی۔ (۳)

دیکھیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے باریک دو پٹہ کو کتنا برا سمجھا کہ اس کو پھاڑ ڈالا اور موٹا دو پٹہ ان کو اڑھایا۔ لہذا عورت کو چاہیے کہ باریک لباس نہ پہنے جس سے بدن جھلکنے لگے۔ یہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے۔

بلا محرم سفر

بغیر محرم کے سفر کرنا عورت کے لیے جائز نہیں، اگر چہ کوئی مقدس سفر ہی ہو جیسے حج کا سفر۔

(۱) چناں چہ حدیث میں ہے:

---

(۱) مسلم:۲/۲۰۵

(۲) شرح مسلم:۲/۲۰۵

(۳) المشکوۃ:۳۷۷

نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا عورت تین دن کا سفر نہ کرے؛
مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا محرم ہو۔ (۱)

(۲) دوسری حدیث میں فرمایا:

کسی ایسی عورت کے لیے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو،
جائز نہیں کہ محرم کے بغیر ایک دن ایک رات کا سفر کرے۔ (۲)

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے اور بعض روایات میں یوں ہے کہ
عورت کے لیے حلال نہیں کہ بغیر محرم کے سفر کرے۔ (۳)

(۴) ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

عورت ایک برید (یعنی بارہ میل) کا سفر نہ کرے؛ مگر یہ کہ اس
کے ساتھ اس کا شوہر یا محرم ہو۔ (۴)

ان روایات میں بہ ظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔ کہ کسی میں عورت کو بغیر محرم سفر سے مطلقاً منع کیا گیا ہے، کسی میں ایک برید یعنی بارہ میل سفر سے منع کیا ہے، بعض میں ایک دن کی مسافت سفر سے منع کیا ہے۔ بعض فقہا نے فرمایا کہ عورت بغیر محرم کے نہ قریب کا سفر کرسکتی ہے نہ دور کا۔ اور روایات میں جو مختلف باتیں ہیں، یہ سوال کرنے والوں کے لحاظ سے ہیں کہ کسی نے تین دن کا سوال کیا، کسی نے ایک دن کا اور کسی نے ایک برید کا، تو جو سوال تھا اس کے مطابق جواب دیا گیا، لہذا عورت کو بغیر

(۱) بخاری: ۱/ ۱۴۷، مسلم: ۱/ ۴۳۳، طحاوی: ۱/ ۳۰۲، مسند حمیدی: ۲/ ۴۴۰
(۲) بخاری: ۱/ ۱۴۸، مسلم: ۱/ ۴۳۴، طحاوی: ۱/ ۳۰۲
(۳) طحاوی: ۱/ ۳۰۱، مسلم: ۱/ ۴۳۴، مسند حمیدی: ۱/ ۲۲۲
(۴) طحاوی: ۱/ ۳۰۲

محرم نہ دور کا سفر جائز ہے، نہ قریب کا، بعض نے روایات مذکورہ میں ترجیحی عمل سے کام لیا ہے اور اس میں بھی فقہا کے مختلف نظریات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور پرفتن میں جہاں ایک طرف شرم وحیا کی چادر کو تار تار کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف فحش لٹریچر، گندے ناول، حیا سوز پوسٹر، ٹی وی کے شرم ناک مناظر اور دیگر عوامل نے شہوت کی بھٹی ہر طرف بھڑ کا رکھی ہے۔ عورت کے لیے اسی میں عافیت وخیریت ہے کہ وہ نہ بڑا سفر بغیر محرم کے کرے نہ چھوٹا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا منشا بھی بہ ظاہر یہی ہے کہ عورت عافیت وخیریت میں رہے اور اس کی عزت، عفت و عصمت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

آرائش وزیبائش میں حدود سے تجاوز

آرائش وزیبائش اور بناؤ سنگار، حسن و جمال کے لوازمات میں سے ہے اور عورت جو کہ سراپا جمال ہے، اس کی فطرت میں داخل ہے؛ اس لیے شریعت نے عورت کو بناؤ سنگار کی اجازت ہی نہیں ؛ بل کہ ترغیب بھی دی ہے۔ مثلاً:

(۱) عورت کو مہندی سے اپنے ہاتھوں کو زینت دینے کی اجازت وترغیب حدیث میں آئی ہے۔ چناں چہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے بیعت کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو فرمایا کہ اپنی ہتھیلیوں کو جب تک (مہندی سے) نہ بدلوگی، میں بیعت نہ کروں گا اور ایک روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے اپنے ہاتھ سے ایک خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کیا، تو آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور فرمایا کہ مجھے کیا پتہ کہ یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟ اس عورت نے عرض کیا کہ عورت کا ہاتھ ہے، فرمایا کہ اگر تو عورت ہوتی تو اپنے ناخنوں کو (مہندی سے) رنگ

دیتی۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو مہندی سے اپنے ہاتھوں کو زینت دینا مستحب و پسندیدہ امر ہے اور اس کی تعلیم و ترغیب دی گئی ہے۔

(۲) ریشمی لباس و پوشاک اور سونے کے زیورات مردوں کے لیے حرام و ناجائز قرار دیے گئے؛ مگر عورت کو اس کے ذریعے زینت اختیار کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ چناں چہ حدیث میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

اللہ تعالی میری امت کی عورتوں کے لیے ریشم اور سونا حلال کیا اور مردوں پر حرام کیا ہے۔(۲)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔(۳)

(۳) کانوں میں اور گلے میں، ہاتھوں اور پیروں میں زیورات سے اپنے کو آراستہ کرنے کی اجازت دی گئی اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عام صحابیات میں اس کا رواج موجود تھا۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک عید کے موقع پر نبی کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نمازِ عید کے بعد عورتوں میں جا کر وعظ فرمایا اور اس میں صدقہ کی فضیلت بیان کی اور اس کا حکم دیا تو عورتیں اپنے کانوں سے قرط (بالیاں) اور گلوں سے ہار، ہاتھوں سے انگوٹھیاں اور پیروں سے چھلے نکال کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔(۴)

(۱) ابو داؤد:۲:۵۷۴، نسائی:۲:۲۷۹

(۲) نسائی:۲:۲۹۳

(۳) ترمذی:۱:۳۰۲، ابن ماجہ:۲۵۷، طحاوی:۲:۲۸۸

(۴) بخاری:۲/۸۷۳،۲/۹۷۴، نسائی:۱/۲۳۵، ابن ماجہ:۹۱

ایک حدیث میں ہے کہ دو عورتیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم ان کی زکاۃ دیتی ہو؟ انہوں نے بتایا کہ نہیں، تو فرمایا کہ کیا تم کو یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو آگ کے کنگن پہنائے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، تو فرمایا کہ ان کی زکاۃ ادا کرتی رہو۔ (۱)

اور امام بخاری تعلیقاً اور ابن سعد نے موصولاً روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ (۲)

ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک مرتبہ چاندی کی بڑی بڑی انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ (۳)

اسی طرح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھی چاندی کے پازیب تھے جن کو استعمال فرماتی تھیں۔ (۴)

ان احادیث وآثار سے معلوم ہوا کہ اسلام نے عورت کو زیب وزینت کے اختیار کرنے کی اجازت وترغیب دی ہے؛ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آرائش وزیبائش میں حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ بل کہ غیر شرعی زیبائش وآرائش سے بچنا چاہیے۔

چناں چہ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بدن کو گودنے والی اور

---

(۱) ترمذی:۱/۱۳۸

(۲) بخاری:۲/۸۷۳،فتح الباری:۱۰/۳۳۰

(۳) ابوداود:۱/۲۱۸

(۴) ابوداود:۱/۲۱۸

دانتوں کو چھیدنے والی اور خداداد صورت میں تغیر کرنے والی عورتوں پر لعنت کرے۔ اور میں کیوں ان پر لعنت نہ کروں جن پر حضرت رسول خدا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے لعنت کی ہے۔(۱)

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے بال میں دوسروں کے (بال جوڑنے والی) اور جڑوانے والی اور بدن گودنے والی اور گدوانے والی پر لعنت کی ہے۔(۲)

(۳) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری بیٹی کے چیچک نکلی تھی، جس سے اس کے بال جھڑ گئے اور میں نے اس کی شادی کردی، تو کیا میں اس کے بالوں میں دوسرے بال جوڑ دوں؟ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: اللہ نے بالوں میں جوڑ لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت کی ہے۔(۳)

(۴) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے آخری سفر حج کے دوران مدینہ تشریف لائے اور وہاں خطبہ دیا۔ آپ نے ایک سپاہی سے (جو آپ کا محافظ تھا) بالوں کا ایک گچھا لیا۔ اور فرمایا کہ کہاں ہیں تمہارے علما؟ میں نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے سنا ہے کہ آپ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی لیے ہلاک ہوئے (کہ ان کی عورتوں نے بالوں میں بال ملانے کو) اختیار کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرا خیال یہ تھا کہ یہ کام (بالوں میں بال ملانا)

---

(۱) بخاری:۲/ ۸۷۹، نسائی:۲/ ۲۹۲، مسلم:۲/ ۲۰۴، ابو داود:۲/ ۵۷۴

(۲) بخاری:۲/ ۸۷۹، ترمذی:۱/ ۳۰۶، ابو داود:۲/ ۵۷۴، نسائی:۴/ ۲۹۲، مسلم:۲/ ۲۰۴

(۳) مسند حمیدی:۱/ ۲۵۳، بخاری:۲/ ۸۷۹، مسلم:۲/ ۲۰۴، نسائی:۲/ ۲۹۲

سوائے یہود کے کوئی نہیں کرتا۔ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلم نے اس کو جھوٹ اور دھوکہ قرار دیا ہے۔ (۱)

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل دوزخ کی دو قسمیں ایسی ہیں کہ میں نے ان کو نہیں دیکھا (یعنی آئندہ پیدا ہوں گی) ایک وہ قوم جن کے پاس گائے کی دم کے مانند کوڑے ہوں گے، جن سے وہ لوگوں کو ماریں گے۔ دوسرے وہ عورتیں جو کپڑے پہنی ہوں گی؛ مگر ننگی ہوں گی۔ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی اور خود دوسروں کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی۔ ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ یہ لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ جنت کی خوش بو پائیں گے، حالاں کہ اس کی خوش بو اتنی دور سے محسوس کی جاسکے گی۔ (۲)

ان احادیث میں چند مسائل ہیں ہم ان کی توضیح و تفصیل یہاں پیش کریں گے۔

بدن گودنا یا گدوانا

بدن گودنا یا گدوانا حرام ہے اور جاہلیت کے دور کی رسم ہے۔ اس کو عربی میں وشم کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہتھیلی کی پشت پر یا کلائی یا بازو یا مونڈھے وغیرہ پر سوئی سے نقش بنا کر اس میں سرمہ یا نورہ بھر دیتے ہیں۔ جس سے وہ نقش ابھر کر دکھائی دیتا ہے، کبھی اس نقشہ میں کوئی پھول یا کسی جانور کی شکل بناتے ہیں۔ ہندوؤں میں اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ حرام ہے۔ گودنے والی اور گدوانے والی دونوں پر لعنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر چھوٹی بچی کو اس کے ذمے دار

(۱) بخاری:۲/۸۷۸، مسلم:۲/۲۰۵، ابو داود:۲/۵۷۴

(۲) مسلم:۲/۲۰۵

گودوائیں تو یہ ذمے دار گناہ گار رہوں گے، بچی پر گناہ نہ ہوگا اور چوں کہ اس میں خون باہر آنے کے بعد وہیں سوراخوں میں جم جاتا ہے۔لہٰذا علما نے فرمایا کہ وہ بدن کا حصہ ناپاک ہو جاتا ہے اس کو زائل کرنا واجب ہے۔ بشرطے کہ بلا حرج و تکلیف اس کو ضائع کیا جا سکے۔(۱)

غرض یہ کہ زیب وزینت کی یہ صورت قطعی اسلام میں حرام اور ناجائز ہے، لہٰذا اس سے احتراز لازم وضروری ہے۔

بال نوچنا

دوسری چیز جس سے ان احادیث میں ممانعت کی گئی ہے وہ ہے بال نوچنا اور اس سے مراد یہ ہے کہ زینت وخوب صورتی کے لیے اپنی بھنویں بنائیں اور اس کے بال نوچیں۔اسی طرح چہرے کے اطراف اور سر کے کناروں کے بال نوچیں یہ بھی حرام ہے۔البتہ عورت کے داڑھی یا مونچھ نکل آئے تو اس کو زائل کرنے کے بارے میں علما نے اختلاف کیا ہے۔امام ابن جریر نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔

مگر جمہور علما نے فرمایا کہ داڑھی اور مونچھ کو نوچ کر نکال دینا عورت کے لیے مستحب ہے۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو عورتوں میں بالوں کو کاٹنے اور بھنویں بنانے کا رواج ہے، وہ اس حدیث کی رو سے صریح ناجائز ہے۔

بالوں میں بال ملانا

تیسری چیز ان احادیث میں وصل شعر ہے۔یعنی بالوں میں بال ملانا۔یہ بھی

---

(۱) فتح الباری:۱۰/۳۷۲، شرح مسلم نووی:۲/۲۰۵
(۲) ایضاً

حرام اور ناجائز ہے اور اس میں اتنی سختی برتی گئی ہے کہ چیچک کی وجہ سے ایک لڑکی کے بال جھڑ جانے پر بھی اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ بال میں بال ملائے جائیں۔ جب کہ اس لڑکی کی شادی بھی ہوئی تھی اور شوہر کے لیے زیب و زینت کے لیے ضرورت بھی تھی جیسا کہ حدیث نمبر ۳ میں مذکور ہے۔

جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ اپنے بالوں میں اضافہ کے لیے خواہ بال استعمال کریں یا اور کوئی چیز سب حرام و ناجائز ہے جیسے دھاگے، ریشم، صوف وغیرہ کے بنے ہوئے کھبے ہوتے ہیں اور اس کے ناجائز ہونے کی دلیل مسلم کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے زجر و منع کیا کہ عورت اپنے بالوں میں کوئی چیز بھی ملائے۔ (۱)

چوں کہ اس حدیث میں بالوں میں کسی بھی چیز کا ملانے سے منع فرمایا گیا ہے، لہٰذا جمہور علما نے اس بات کو ناجائز قرار دیا کہ عورت اپنے بالوں میں ریشم، صوف، نیلون وغیرہ کسی بھی چیز کو ملائے اور بالوں کو بڑھائے۔ لہٰذا احتیاط یہی ہے کہ عورت اس سے پرہیز کرے۔

البتہ بعض علما و بہت سے فقہا نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ بالوں میں کسی انسان کے بال ملانا، تو حرام و ناجائز ہے؛ لیکن دوسری کسی چیز سے اپنے بالوں میں اضافہ کرنا ناجائز نہیں ہے۔ اور ان کی دلیل حضرت سعید بن جبیر رَحِمَهُ اللهُ کا یہ قول ہے:

" لاباس بالقرامل" کہ قرامل میں کوئی حرج و مضائقہ نہیں ہے۔

اس قول کو امام ابو داؤد رَحِمَهُ اللهُ نے نقل کیا ہے۔ ابن حجر رَحِمَهُ اللهُ نے فرمایا کہ

---

(۱) مسلم: ۲/۲۰۴

اس کی سند صحیح ہے۔(۱)

قرامل قرمل کی جمع ہے اور یہ ایک قسم کی گھاس کو کہتے ہیں جس میں لمبی لمبی بالیاں ہوتی ہیں اور یہاں اس سے مراد ریشم یا صوف وغیرہ کے دھاگے ہیں، جن کو عورتیں اپنے بالوں میں لگا کر چوٹیاں بناتیں ہیں۔(۲)

اس قول کے پیش نظر بعض علما وفقہا یہ فرماتے ہیں کہ عورت اپنے بالوں میں بال تو نہیں ملا سکتی؛ مگر صوف، ریشم وغیرہ کے بنے ہوئے کھبے استعمال کر سکتی ہے۔ امام احمد کا یہی قول ہے جیسا کہ امام ابوداؤد نے اپنے سنن میں نقل کیا ہے۔(۳)

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور علمائے حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ بالوں کے علاوہ کوئی اور مصنوعی چیز بالوں میں ملانے اور لگانے کی اجازت ہے۔چناں چہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

”لاباس ان تتصل المرأۃشعرھا بالصوف انماینھی بالشعر.“

اس میں حرج نہیں کہ عورت اپنے بال کو صوف میں ملائے ممنوع تو بال سے ملانا ہے۔(۴)

اس کو نقل کر کے امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی کو ہم لیتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ عورت کو زینت کے لیے اپنے بالوں میں بال ملانے کی تو اجازت نہیں ہے، البتہ کوئی اور چیز ملائے، تو درست اور

(۱) فتح الباری:۱۰/ ۳۷۵
(۲) فتح الباری:۱۰/ ۳۷۵
(۳) ابوداود:۲/۴/۵۷
(۴) جامع المسانید:۲/ ۳۰۷، کتاب الآثار:۱۹۷

جائز ہے اور جو عورتوں میں مشہور ہے کہ عورت اپنے ہی بال جما کر کے اس کی چوٹی بنائے اور لگا لے، تو جائز ہے، یہ صحیح نہیں۔ فقہا نے تصریح ہے کہ عورت خواہ اپنے بال بالوں میں ملائے یا غیر کے، ہر دو صورتیں حرام اور نا جائز ہیں۔ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ اکثر علما کے نزدیک عورت کا اپنے بالوں میں کسی بھی چیز کو جوڑنا نا جائز ہے۔ اور بعض ائمہ جیسے ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ وغیرہ بالوں کے سوا کسی اور چیز کا استعمال کیا جائے، تو اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور بال خواہ اسی کے ہوں یا کسی اور کے، بہ ہر حال ان کا ملانا اور جوڑنا نا جائز ہے۔

دانتوں کے درمیان جگہ بنانا

ان احادیث میں اس بات سے بھی ممانعت آئی ہے کہ عورت دانتوں کے درمیان فاصلہ اور جگہ بنائے۔ عربی میں اس کو فلج کہتے ہیں۔ جس کے اصل معنی ہیں دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کرنا اور یہاں مراد دانتوں کے درمیان فاصلہ کرنا ہے، تاکہ حسن پیدا ہو، یہ بھی حرام ہے؛ کیوں کہ اس میں اللہ کی تخلیق میں تغیر و تبدیلی لازم آتی ہے۔ اسی لیے اس جگہ حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے "المغيرات خلق الله" (جو عورتیں کہ اللہ کی خلقت و بناوٹ میں تبدیلی کرنے والی ہیں) اس جملہ میں اشارہ ہے اس فعل کے ممنوع ہونے کی طرف، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی کرنا شیطانی فعل اور حرکت ہے۔ (النساء :۱۱۹)

غرض یہ کہ حسن و خوب صورتی کی خاطر اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی کی اجازت نہیں؛ البتہ علاج کے لیے یا دانتوں میں کسی عیب کے ازالہ کے لیے اس قسم کے کام

---

(۱) العالمكيري :۵/۳۵۸، درمختار مع شامی:۶/۳۷۳

کی ضرورت پڑے تو علما نے اس کی اجازت دی ہے۔ (۱)

سر پر چونڈا بنانا

آخری حدیث میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بہ طور پیشین گوئی فرمایا کہ ایسی عورتیں ہوں گی جو کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی۔ اس کی تفصیل وتشریح پہلے گزر چکی ہے اور ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ بختی اونٹ اونٹوں کی قسموں میں سے ایک خاص قسم ہے جس کے کوہان بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ علامہ نووی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں اپنے سروں کو عمامہ کپڑا وغیرہ باندھ کر بنائیں گی۔ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ (۲)

اور قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ اس میں ان عورتوں کے سروں کو اونٹ کے کوہان سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ اپنی چوٹیوں کو اٹھا کر اپنے سروں کے اوپر باندھے گی؛ تاکہ زینت ہو۔ (۳)

یہ وہی صورت ہے جس کو یہاں کے عرف میں ''چونڈا'' کہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جائز نہیں ہے اور اس میں ان عورتوں کو وعید سنائی گئی ہیں، جو اپنے سروں پر چونڈا باندھتی ہیں کہ وہ عورتیں جنت کی خوش بو سے بھی محروم رہیں گی، چہ جائے کہ جنت میں داخل ہوں۔

سر کھلا رکھنا

آج کل سر کھلا رکھنا اور بے پردہ رہنا عورتوں کا فیشن بن گیا ہے اور عورتیں اس

---

(۱) شرح مسلم:۲۰/۲۰۵، مرقات:۷/۲۹۵، فتح الباری:۱۰

(۲) شرح مسلم:۲/۲۰۵

(۳) فتح الباری:۱۰/۳۷۵

کو بھی زینت کا لازمہ سمجھتی ہیں۔حالاں کہ غیر محرم کے سامنے سر کھولنا بے حیائی کی بات ہے۔اور یہ پردہ میں داخل ہے کہ سر اور بالوں کو غیر محرم سے چھپائیں۔

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے ''الکبائر'' میں ایک لمبی حدیث نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ وفاطمہ رضی اللہ عنہا دونوں ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ زارو قطار رو رہے تھے، ان حضرات نے آپ سے رونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ معراج کی رات میں نے اپنی امت کی عورتوں کو دیکھا جو مختلف قسم کے عذاب میں گرفتار تھیں۔لہذا اس کی وجہ سے رو رہا ہوں۔فرمایا کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا جس کو بالوں میں باندھ کر لٹکایا گیا ہے اور اس کا دماغ پک رہا ہے اور ایک عورت کو دیکھا جس کو اس کی زبان سے باندھ کر لٹکا دیا گیا ہے اور اس کے حلق میں گرم گرم پانی ڈالا جا رہا ہے اور ایک عورت کو دیکھا، جس کے پیر اس کی چھاتیوں سے باندھ دیئے گئے ہیں اور ہاتھ سر پر باندھ دیے گئے ہیں۔اور ایک عورت کو دیکھا جس کو اس کی چھاتیوں سے باندھ کر لٹکا دیا گیا ہے۔ اور ایک عورت ایسی ہے کہ اس کا سر خنزیر جیسا، بدن گدھے جیسا ہے اور ہزاروں قسم کا عذاب ہو رہا ہے۔اور ایک عورت کو دیکھا کتے کی شکل پر ہے اور آگ اس کے منہ میں داخل ہو کر پاخانہ کی راہ سے نکل رہی ہے اور فرشتے اس کے سر پر آگ کے گرزوں سے مار رہے ہیں۔پھر تفصیل سے ان عورتوں کی وہ برائیاں بیان فرمائیں جن کی وجہ سے ان کو یہ عذاب

ہور ہا تھا کہ پہلی عورت مردوں سے اپنے بال چھپاتی نہ تھی۔ دوسری شوہر پر زبان درازی کرتی تھی۔ تیسری پاکی کا اہتمام نہ کرتی تھی اور نماز کا مذاق اڑاتی تھی۔ چوتھی زانیہ تھی۔ پانچویں جھوٹی اور چغل خور تھی۔ چھٹی حسد کرتی تھی۔ (۱)

اس حدیث سے بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سر کھلا رکھنا عورت کے لیے معیوب بات ہے۔

---

(۱) الکبائر:۱۷۸

فصل سادس

عورت اور ازدواجی زندگی

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت قاہرہ وحکمت بالغہ سے انسان کی دو صنفیں ''مرد وعورت'' بنا کر ایک دوسرے کے لیے سامان راحت ولذت اور ذریعۂ تسکین وطمانیت پیدا فرمادیا، جس سے دنیا کا یہ پورا نظام ایک خاص انداز پر چل رہا ہے۔اوراس کی وجہ سے انسانوں کی آبادی کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ یٰاَیُّھَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَ ۃٍوَخَلَقَ مِنْھَازَوْجَھَاوَبَثَّ مِنْھُمَارِجَالاً کَثِیْرًاوَّنِسَاءً وَاتَّقُوْااللّٰہَ الَّذِیْ تَسَاءَ لُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً.﴾ (النسآء۔۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کوایک جاندار سے پیدا کیا اوراس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اوران دونوں سے بہت سے مرداورعورتیں پھیلائیں اورتم خدا تعالی سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہواورقرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالی تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔)(۱)

(۱) ترجمہ از حضرت تھانوی قدس سرہ

پھر مرد و عورت کو ایک دوسرے کا جوڑا بنا کر ان میں محبت و مودت اور رأفت و رحمت کے عجیب جذبات پیدا فرما دیے، جو بلا شبہ اللہ تعالے کی قدرت کا ایک عظیم کارنامہ اور شاہ کار ہے. جیسا کہ خود اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِي ذَالِكَ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الروم :۲۱)

(اور(اللہ کی قدرت کی) نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت ڈالدی بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں)

غرض یہ کہ اللہ تعالے نے مرد و عورت کے درمیان زوجیت کا رشتہ قائم کر کے انہیں ایک نئی زندگی سے وابستہ کر دیا، جو تفرد و تجرد کی زندگی سے بہت مختلف ہے، لہذا اس زندگی میں مرد و عورت پر کچھ ذمے داریاں ہیں، کچھ حقوق، کچھ آداب عائد ہوتے ہیں، جن کی رعایت و پابندی اور حفاظت و پاس داری کے بغیر ازدواجی زندگی کا حقیقی لطف اٹھایا نہیں جا سکتا؛ مگر یہاں اس وقت ہمارے پیش نظر، چوں کہ عورت کا کردار پیش کرنا ہے؛ اس لیے ہم صرف عورت سے متعلق ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، جو اس کی ازدواجی زندگی کے بنانے، سنوارنے اور اسلام کے موافق گذارنے میں مفید و ثمر آور و نتیجہ خیز ہیں۔

شوہر کی عظمت و عزت

شادی کے بعد سب سے پہلے جس ذات سے عورت کو وابستگی و تعلق ہوتا ہے وہ

شوہر ہے اور یہ رشتہ وتعلق جس طرح مضبوط و مستحکم ہوتا ہے، اسی قدر نازک بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس کو نباہنا اور قائم رکھنا کچھ اصول وآداب کا تقاضا کرتا ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ عورت شوہر کی تعظیم وتکریم کرے اور اس کو اپنا بڑا خیال کرے اور اس کی عظمت وحرمت کا پاس رکھے۔ اور قرآن مجید میں اللہ تعالے نے فرمایا:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النسآء: ۳۴)

(مرد عورتوں پر حاکم ہیں)

اس آیت میں شوہر کی عظمت وحرمت بیان کی گئی ہے کہ وہ عورت پر حاکم اور اس کا قوام وقیم ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ یہ آیت سعد ابن ربیع رضی اللہ عنہ کی عورت حبیبہ بنت زید رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی، جب کہ سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو اس کی نافرمانی پر ایک طمانچہ رسید کیا اور اس کے والد نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، تو بھی اپنے شوہر کے ایک طمانچہ لگا کر بدلہ لے لے، جب یہ باپ اور بیٹی بدلہ لینے کے لیے چلے، تو اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے، آپ نے ان سے فرمایا کہ ارے واپس آجاؤ، یہ دیکھو جبرئیل میرے پاس آئے ہیں۔ آیت سنا کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے ایک ارادہ کیا اور اللہ عزوجل نے دوسرا ارادہ کیا۔ (ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یہ فرمایا) میں نے ایک بات کا ارادہ کیا اور اللہ عزوجل نے جو ارادہ کیا وہی خیر ہے۔ (۱)

اس آیت اور اس کے شان نزول سے معلوم ہوا کہ مرد (شوہر) کا اللہ اور اس

(۱) قرطبی: ۵/۱۶۸، روح المعانی: ۵/۲۳

کے رسول کی نظر میں کیا مقام ومرتبہ ہے اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے میں سجدہ کا حکم دیتا، تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے بہ وجہ اس حق کے، جو اللہ نے ان مردوں کا عورتوں پر رکھا ہے۔ (۱)

اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مرد کا کتنا اونچا مقام ومرتبہ بتایا ہے کہ اگر اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کے لیے سجدہ کی اجازت ہوتی، تو عورت کو حکم ہوتا کہ مرد کو سجدہ کرے۔ لہٰذا عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کی عزت وعظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ زندگی گذارے. آج کی عورتوں نے یورپ وامریکہ کی تقلید میں شوہر کی عظمت وحرمت کا پاس وخیال ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور مساوات کا کھوکلا نعرہ لگا کر اسلام کی اس تعلیم کے خلاف چلنا شروع کر دیا ہے،؛ مگر یاد رکھو کہ اسلام سے زیادہ مساوات کا سبق دینے والا کوئی نہیں ہوسکتا (جیسا کہ اس سے قبل بھی تفصیلاً عرض کیا گیا ہے) مگر مساوات کا یہ مطلب لینا بالکل عقل وفطرت کے خلاف ہے کہ کسی کی عظمت وحرمت کا پاس وخیال نہ رکھا جائے۔ کیا کوئی شخص تمام انسانوں کے بہ حیثیت انسان مساوی ہونے کا یہ مطلب نکال سکتا ہے کہ کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں؟ باپ اور بیٹے کا ہر اعتبار سے ایک ہی مرتبہ ہے، استاذ وشاگرد میں کوئی تفاضل نہیں اور حاکم ورعایا سب ایک ہی مرتبہ کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ مساوات کا معنی ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔ اسی طرح مرد وعورت کی مساوات کا یہ مطلب نہیں اور نہ ہوسکتا ہے کہ دونوں میں کسی بھی اعتبار سے فرق نہیں اور شوہر کو کسی اعتبار سے بھی تفوق حاصل نہیں۔

غرض یہ کہ اسلام میں شوہر کو ایک عظمت وبلندی مرتبہ حاصل ہے اور عورت پر لازم ہے کہ اس کا لحاظ رکھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اے عورتو! اگر تم کو

---

(۱) ابو داؤد:۱/۲۹۱، ترمذی:۱/۲۱۹، ابن ماجہ:۱۳۳

معلوم ہوجائے کہ تمہارے مردوں کا تم پر کیا حق ہے، تو تم اپنے شوہر کے قدموں کی غبار و دھول کو اپنے گالوں سے صاف کروگی۔(۱)

ایک حدیث میں جس کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور احمد و نسائی نے روایت کیا ہے، آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ عورت پر سب سے بڑا حق کس کا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے شوہر کا۔(۲)

شوہر کی اطاعت و خدمت

عورت کے کمال و خوبی میں سے اسلام نے شوہر کی اطاعت و خدمت کو بھی شمار کیا ہے اور اس کو عورت پر لازم بھی قرار دیا ہے اور جو عورت شوہر کی اطاعت نہ کرے اس کے لیے سخت وعید بھی بیان کی گئی.

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عورت اگر پانچ وقت کی نماز پڑھے۔اور رمضان کے روزے رکھے اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے، تو وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہوجائے''۔(۳)

اس حدیث میں شوہر کی اطاعت کرنے والی عورت کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ وہ ضرور جنت میں جائے گی اور اس کو اختیار ہوگا کہ جس دروازے سے چاہے داخل ہوجائے۔اس میں اشارہ ہے کہ اس کو کوئی چیز دخول جنت سے مانع نہ ہوگی اور جلد

---

(۱) الکبائر:۱۷۴

(۲) فتح الباری:۴۰۲/۱۰

(۳) مشکاۃ:۲۸۱

سے جلد جنت میں پہنچ جائے گی۔ (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھی عورت کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ عورت جو اپنے شوہر کو خوش کر دے جب وہ اس کو دیکھے اور وہ اس کی فرمانبرداری کرے جب وہ کوئی حکم دے اور اس کے خلاف نہ کرے، نہ اپنے نفس میں، نہ اپنے مال میں جس کو وہ ناپسند کرے۔ (۲)

اس حدیث نے بہترین عورت کی صفات وخصوصیات میں تین چیزوں کو بیان کیا ہے ۔

(۱) جب شوہر اس کو دیکھے، تو اس کو خوش کر دے:

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب مرد عورت کی بشاشت وچستی اور حسن اخلاق اور حسن معاشرت کو دیکھے، تو خوش ہو جائے ۔ اور اگر اس کے ساتھ ساتھ حسن صورت بھی جمع ہو جائے، تو وہ نور علے نور اور سرور علے سرور ہے۔ (۳)

(۲) جب حکم دے تو اطاعت کرے:

اس سے مراد وہ حکم ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو، اگر کوئی مرد شریعت کے خلاف حکم دے مثلاً یہ کہے کہ بے پردہ میرے ساتھ چلو، تو اس کی بات ماننا جائز نہیں، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے:

«لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ»

---

(۱) مرقات:٦/٢٧٨

(۲) نسائی:۲/۷۱، مشکاۃ:۲۸۳

(۳) مرقات:٦/٢٧٨

(اللہ کی معصیت و نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)

پس اگر شوہر خلاف شریعت حکم نہ دے؛ بل کہ مباح و جائز کام کا حکم دے، تو عورت کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کو انجام دے۔

(۳) اپنے نفس و مال میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی تصرف نہ کرے:

نفس میں تصرف سے مراد یہ ہے کہ اس کی مرضی و اجازت کے بغیر کسی جگہ آئے جائے، کسی سے ملنے وغیرہ اور مال سے مراد وہ مال ہے، جو مرد نے ضروریات زندگی کے لیے عورت کو دیا ہے۔ اس میں اس کی مرضی و اجازت کے بغیر تصرف درست نہیں اور بعض علما نے کہا کہ مال سے عورت کا مال مراد ہے۔ اس صورت پر عورت کو اپنے مال میں بھی بغیر شوہر کی مرضی کے تصرف نہ کرنا چاہئے۔ بہترین عوررت کا یہی کردار ہوتا ہے۔ (۱)

حضرت حصین بن محصن رحمۃ اللہ نے اپنے ایک پھوپی سے روایت کیا ہے (جو کہ صحابیہ ہیں) کہ انہوں فرمایا کہ میں ایک حاجت وضرورت کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی ،تو آپ نے فرمایا کہ اے عورت! کیا تو شوہر والی ہے؟ میں نے کہا ہاں؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اس سے الگ تو کہاں آ گئی؟ میں نے عرض کیا کہ میں کوتاہی نہیں کرتی ؛مگر جب کہ مجبور ہو جاتی ہوں۔ آپ نے پھر فرمایا کہ دیکھ لے کہ تو کہاں آ گئی؟ وہ (شوہر) ہی تیری جنت یا دوزخ ہے۔ (۲)

اس حدیث میں شوہر کی رضا و اجازت کے بغیر عورت کے باہر جانے پر اللہ کے

---

(۱) مرقات :۶/ ۲۷۸،مرقات سے مال کی دونوں تفسیر نقل کی گئی ہیں۔

(۲) مسند حمیدی:۱/۱۷۲

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ اور آخر میں یہ فرمایا کہ شوہر یا تو تیری جنت ہے یا جہنم۔ یعنی اگر اس کی اطاعت و خدمت کرے گی، تو جنت ملے گی ورنہ جہنم۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر شوہر عورت کو حکم دے کہ پیلے پہاڑ سے پتھر اٹھا کر کالے پہاڑ کی طرف اور کالے پہاڑ سے سفید پہاڑ کی طرف منتقل کرے، تو اس کو چاہیے کہ ایسا ہی کرے۔

ابن ماجہ میں لال پہاڑ اور کالے پہاڑ کا ذکر ہے۔ (۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے عورت کو ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے، خواہ وہ مشکل سے مشکل کام کیوں نہ ہو۔ اس سے اطاعت کی اہمیت بتانا مقصود ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن عورت سے سب سے پہلے جس بات کا سوال ہوگا وہ اس کی نماز اور اس کے شوہر کے بارے میں ہوگا۔ (۲)

یعنی یہ سوال ہوگا کہ شوہر کی اطاعت و خدمت کی یا نہیں؟ اب سوچ لیا جائے کہ مرد کی اطاعت و فرماں برداری اور خدمت کتنی ضروری ہے۔

شوہر کی رضا و خوشی کا اہتمام

ازدواجی زندگی میں شوہر کی مرضی و خوشی کا اہتمام اور اس کی ناراضی و ناخوشی

(۱) مشکاۃ:۲۸۳/۳ ابن ماجہ:۱۳۳

(۲) الکبائر:۱۷۳

سے بچنے کا التزام بھی عورت کے اہم ترین فرائض میں داخل ہے۔اوراس کے خلاف کرنا اس کے لیے اللہ کے غضب وغصہ کا باعث وسبب ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جوعورت اس حال میں مرے کے اس کا شوہر اس سے راضی ہو وہ جنت میں داخل ہوگی۔ (۱)

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر کی رضا وخوشی ،عورت کو جنت میں لے جاتی ہے۔اس سے شوہر کی رضا وخوشی کے حاصل کرنے کی اہمیت وفضیلت ثابت ہوئی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین شخص ہیں،جن کی نہ نماز قبول ہوتی ہے اور نہ ان کی کوئی نیکی (آسمان کی طرف) چڑھتی ہے۔ایک وہ غلام جو بھاگ گیا ہو جب تک وہ اپنے آقا کی طرف لوٹ کر نہ آئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دے دے۔ (یعنی اطاعت کرے)دوسرے وہ عورت جس پر اس کا خاوند ناراض ہو،تیسرے شرابی جب تک کہ نشہ اس کا نہ اترے۔ (۲)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شوہر کی ناراضی سے اللہ بھی ناراض ہوتے ہیں اور اس عورت کی نمازوں کو رد فرمادیتے ہیں۔ جو شوہر کو ناراض کرتی ہے؛ مگر یہاں یہ بھی یادرکھنا چاہئے کہ مراد وہ ناراضی ہے جو شرع کے موافق ہو۔اگر شوہر اس لیے ناراض ہوتا ہے کہ عورت اللہ کے حکموں پر چلتی ہے،تو اس کی یہ ناراضی حدود شرع سے متجاوز ہونے کی بنا پر اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ہاں !نوافل ومستحبات کے ادا کرنے میں عورت کو

---

(۱) ابن ماجہ :۳۴۳، ترمذی:۲۱۹/۱

(۲) مشکاۃ:۲۸۳

چاہئے کہ شوہر کی رضا کا لحاظ رکھے۔ مثلاً نفل نماز پڑھنے یا نفل روزہ رکھنے سے شوہر کے حقوق میں کوتاہی لازم آتی ہے، تو عورت کو نفل نماز و نفل روزہ کی اجازت نہ ہوگی؛ مگر یہ کہ شوہر اجازت دے دے، تو پھر ویسا ہی کرے۔

(۱) چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کے لیے حلال و جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھے، جب کہ اس کا شوہر موجود ہو؛ مگر اس کی اجازت سے (رکھ سکتی ہے) (۱)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت رمضان کے سوا کوئی اور روزہ نہ رکھے، جب اس کا خاوند موجود ہو؛ مگر یہ کہ اس کی اجازت ہو۔ (تو پھر جائز ہے) (۲)

(۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے شوہر صفوان بن معطل، میں نماز پڑھتی ہو تو مارتے ہیں اور روزہ رکھتی ہوں تو روزہ تڑوا دیتے ہیں اور خود فجر کی نماز اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک کہ سورج نہیں نکل جاتا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ اس وقت وہیں مجلس میں موجود تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان باتوں کے بارے میں پوچھا جو اس عورت نے کہا تھا، حضرت صفوان نے وضاحت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے جو یہ کہا کہ نماز پڑھنے پر مارتا ہوں تو بات یہ ہے کہ یہ دو دو سورتیں (نماز میں) پڑھتی ہے اور میں نے اس سے اس کو منع کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) بخاری: ۲/۷۸۲

(۲) ابو داؤد: ۱/۳۳۳، ترمذی: ۱/۱۶۳، ابن ماجہ: ۱۲۶، دارمی: ۲/۱۲

فرمایا کہ ایک سورت ہوتو کافی ہے۔صفوان نے کہا کہ اس نے جو یہ کہا کہ میں اس کا روزہ تڑوادیتا ہوں تو بات یہ ہے کہ یہ مسلسل روزے رکھتی چلی جاتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں صبر نہیں کرسکتا۔ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ پھر صفوان نے عرض کیا کہ اور یہ بات کہ میں نماز فجر سورج نکلنے تک نہیں پڑھتا۔تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بیوی بچے والے ہیں (رات میں ضرورت کے لیے کام کرتے ہیں) لہٰذا سورج نکلنے سے پہلے اٹھ نہیں پاتے۔ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جب بیدار ہوں نماز پڑھ لو۔ (۱)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نفل روزہ شوہر کی مرضی واجازت کے بغیر رکھنا اچھا نہیں ۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نوافل پر نوافل یا لمبی لمبی رکعتیں پڑھنا جس سے شوہر کی خدمت میں خلل وکوتاہی ہو، اچھا نہیں ۔غرض یہ کہ شوہر کی رضا وخوشی کا ہر جگہ اور ہر وقت لحاظ وخیال رکھنا عورت پر لازم ہے۔

ایک تنبیہ

مگر ایک بات ذہن میں رہے کہ یہ شوہر کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کی رضا وخوشی کا اہتمام وخیال صرف اس موقعے پر ضروری اور لازم ہے، جب کہ اس سے خدا کی نافرمانی اور ناراضی لازم نہ آتی ہو، اگر شوہر ایسی بات کا حکم دے جس سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو، یا اس کی ناراضی پر مشتمل ہو، تو وہاں ہرگز شوہر کی بات نہیں مانی جائے گی ۔چناں چہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا نے فرمایا کہ انصار کی ایک عورت نے اپنی لڑکی کی شادی کی، پس اس کے سر کے بال گرنے لگے، وہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے حکم دیا

(۱) ابو داؤد:۱/۳۲۳

ہے کہ میں اپنے بالوں میں دوسرے بال ملاؤں۔آپ نے فرمایا کہ نہیں؛بال میں بال ملانے والی عورتوں پرلعنت کی گئی ہے۔(۱)

دیکھئے اس حدیث نے صاف بتادیا کہ جو بات خلاف شرع ہواس میں شوہر کی بات نہیں مانی جائے گی۔

شوہر کی ناشکری سے پرہیز

عام طور پرعورتوں میں ایک بیماری یہ ہے کہ شوہر کی ناشکری کرتی ہیں۔ مال و پیسہ ملے،عمدہ کھانے وبہترین کپڑے ملیں،راحت وآسائش کاپوراسامان میسر ہو؛مگر ذراسی بات خلاف شرع پیش آجائے تو بلاجھجک یہ کہہ دیتی ہیں کہ اس گھر میں میں نے کبھی راحت نہیں پائی،یہاں مجھے کوئی سکون نہیں چنان چہ اس زودرنجی اورناشکری کاحدیث میں ذکرآیاہےاوراس پرنبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے وعید سنائی ہے۔

ان احادیث کو بہ غور ملاحظہ کریں اوراپنے حالات پر بھی غور کریں۔نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نےفرمایا:

"میں نے دوزخ کودیکھا اس میں اکثر عورتیں تھیں،صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُم نے پوچھا کہ یارسول اللہ!یہ کس وجہ سے ہے؟آپ نےفرمایا کہ ان کی ناشکری کرنے کی وجہ سے ہے۔پوچھا گیا کہ کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟فرمایا کہ اپنےشوہر کی ناشکری کرتی ہیں اوراحسان کوجھٹلاتی ہیں۔ اگرتو ان میں سے کسی سے اپنی پوری زندگی بھی احسان وسلوک کرے پھر تجھ سے کوئی بات خلاف طبع دیکھے گی تو یوں کہے گی کہ میں نے تیرے سےکوئی بھلائی کبھی نہیں دیکھی۔(۲)

(۱) بخاری:۲/۸۷۴

(۲) بخاری:۱/۱۴۴،مسلم:۱/۲۹۸، مالک:٦٦

حضرت جابر بن عبد اللہ بن عمر وغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے عورتو! تم صدقہ دو اور کثرت سے استغفار کرو، کیوں کہ میں دیکھا کہ تم دوزخ والوں میں زیادہ تعداد میں ہو۔ایک جری عورت نے کہا کہ یارسول اللہ! ہماری کیا بات ہے کہ ہم دوزخ میں زیادہ جائیں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم (عورتیں) لعنت بہت کرتی اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ایک روایت میں ہے کہ تم شکوہ بہت کرتی ہو۔(۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عورتوں میں کچھ بری باتیں اور اخلاقی رذائل ایسے ہیں، جن کی وجہ سے اکثر عورتیں جہنم میں جائیں گی۔ایک یہ کہ زبان پر ہمیشہ لعن طعن کے الفاظ کا ہونا، چناں چہ مشاہدہ ہے کہ اکثر عورتیں اپنے بچوں کو، بڑوں کو، اپنوں اور غیروں سب کو، اکثر و بیشتر لعنت کرتی رہتی ہیں۔دوسرے یہ کہ شکوہ وشکایت ان کا محبوب مشغلہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر شکوہ وشکایت کرنے لگتی ہیں۔تیسرے یہ کہ شوہر کی ناشکری کرتی ہیں اور کتنا بھی انہیں چین وراحت شوہر کی طرف سے پہونچے؛ مگر جوں ہی ذراسی بات خلاف مزاج پیش آئی، سارے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر وعید سنائی ہے کہ ایسی عورتیں جہنم میں جائیں گی۔اس لیے ایک تو عورتوں کو اس قسم کی برائیوں سے خصوصیت سے پرہیز کرنا چاہیے۔دوسرے صدقہ وخیرات اور استغفار کے ذریعہ ان گناہوں کو دھونا چاہیے۔

---

(۱) ابن ماجہ:۲۸۸، مسلم:۱/۲۸۹، فتح الباری:۲/۴۶۸، دارمی:۱/۱۶۳

شوہر کے لیے زیب وزینت

ازدواجی زندگی میں جن امور کی بہت زیادہ اہمیت ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت شوہر کے لیے زیب وزینت اختیار کرے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس آتے ہیں تو صحابہ سے فرماتے ہیں کہ ابھی فوراً گھروں میں داخل نہ ہوں؛ بل کہ عورتوں کو ذرا مہلت دو کہ بالوں کو ٹھیک کرلیں اور (غیر ضروری بال) صاف کرلیں۔ (۱)

اس حدیث میں سفر سے آنے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرتے ہیں کہ ابھی فوراً اچانک گھروں میں داخل نہ ہوں اور عورتوں کو ذرا مہلت دو کہ وہ بالوں میں کنگھی کرلیں اور غیر ضروری بالوں کو استرے وغیرہ سے صاف کر کے زینت اختیار کرلیں۔

ملاعلی قاری رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

> ’’معنیٰ یہ ہیں کہ اس وقت تک ٹہر جاؤ کہ عورتیں اپنے شوہروں کے لیے زیب وزینت کرلیں اور اپنے آپ کو شوہر کے لیے تیار کرلیں‘‘۔ (۲)

ایک اور حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

> ’’جب تُو رات میں (شہر میں) داخل ہو تو اپنے گھر والوں کے پاس اس وقت تک داخل نہ ہو کہ وہ بالوں میں کنگھی اور استرے سے صفائی نہ

---

(۱) بخاری:۲/۷۸۹، مسلم:۱/۲۸۹، دارمی:۲/۱۳۲، مشکاۃ:۲۶۷
(۲) مرقات:/۱۹۲

کر لے۔''(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ، جب تم میں سے کوئی بہت دنوں (گھر سے) غائب رہے، تو رات میں اچانک اپنے گھر والوں کے پاس نہ جائے۔(۲)

علامہ ابن حجر عسقلانی رَحِمَهُ الله نے لکھا ہے:

''اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ طویل مدت تک گھر سے غائب رہنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ عورت کی طرف سے ایسی بات پائے جو کہ کراہت ونفرت کا سبب وباعث بن جائے۔مثلاً عورت صفائی ونظافت اور زیب وزینت کے ساتھ نہ ہو۔''(۳)

اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوگئی کہ عورت کا مرد کے لیے زیب وزینت اختیار کرنا ضروری ہے۔اس لیے مردوں کو حکم دیا گیا کہ ایک دم واچانک گھروں میں داخل نہ ہوں تا کہ عورتیں زیب وزینت کرلیں۔اور علمانے اس کو مرد کے حقوق میں شمار کیا ہے کہ عورت پاکی وصفائی اور زیب وزینت کے ساتھ رہے اور اس میں کوتاہی کرنے پر سزا دی جاسکتی ہے۔درِمختار وردالمحتار میں ہے کہ:

''زینت کے ترک کرنے پر شوہر اپنی بیوی کو سزا دے سکتا ہے۔''(۴)

اسی طرح ''خانیه'' اور ''البحر الرائق'' میں ہے کہ چار باتوں پر شوہر بیوی

---

(۱) بخاری:۲/ ۷۸۹

(۲) بخاری:۲۰/ ۷۸۸

(۳) فتح الباری:۹/ ۳۴۰

(۴) شامی:۴/ ۷۷

کو مار سکتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ عورت زینت ترک کرے۔ اور ایک حیرت ناک بات یہ بھی سن لیجئے کہ ان چار میں ایک چیز نماز کا ترک کرنا بھی ہے؛ مگر اس میں علما کا اختلاف ہے کہ نماز کے چھوڑنے پر عورت کو شوہر مار سکتا ہے یا نہیں؛ لیکن ترکِ زینت پر مارنے کے جواز پر سب کا اتفاق ہے۔(۱)

اس سے اندازہ لگائیے کہ عورت کے لیے زینت کا اختیار کرنا کس قدر ضروری اور اہم ہے اور زینت، نظافت وصفائی میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں کہ منہ کو مسواک یا کسی اور چیز سے صاف کرے اور جسم اور کپڑوں کو عطر وخوشبو سے معطر کرے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کرے، زیر ناف اور بغلوں کے بال صاف کرے وغیرہ۔

گھر اور بچوں کی حفاظت

اسلام نے پاکیزہ اور پرسکون اور پرلطف زندگی کے لیے جو اصول وضوابط تعلیم فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت شوہر کے گھر کی، اس کے مال واسباب کی اور اس کے بچوں کی نگرانی وحفاظت کرتی رہے۔ یہ اس کے فرائض و ذمے داریوں میں داخل کیا گیا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچے کی راعی ونگران اور حفاظت کرنے والی ہے۔(۲)

راعی وہ امانت دار نگران، جو اس چیز کی اصلاح وتدبیر میں لگا رہتا ہے، جو اس کی ذمے داری میں دی گئی ہو اور عورت کی نگرانی یہ ہے کہ گھریلو امور اور اولاد کی

---

(۱) خانیه علی هامش الهندیه:۱/۴۴۲،البحر الرائق :۵:۴۹

(۲) بخاری:۲/ ۱۰۵۷

تدبیر کرے اور اس معاملے میں شوہر کا تعاون کرے۔ (۱)

وہ حدیث پہلے گذر چکی ہے جس میں فرمایا گیا کہ بہترین عورت وہ ہے جو شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے اور شوہر کی مرضی کے بغیر اس میں تصرف نہ کرے۔

بہ ہر حال عورت کی یہ ذمے داری ہے کہ شوہر کے گھر اور اس کے مال و اولاد کی حفاظت کرے اور اس کے لیے بہتر سے بہتر تدبیر اختیار کرے، کسی چیز کو ضائع نہ کرے، خراب نہ کرے، ورنہ اس سلسلہ میں اس کی پوچھ ہوگی۔ چناں چہ اوپر درج کردہ حدیث کے اول و آخر میں یہ جملہ ہے:

« أَلاَ فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ »

(تم میں ہر ایک نگراں ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی ماتحت رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا)

بچوں کی تربیت و نگرانی

عورت پر شادی کے بعد جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، ان میں اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیم بہت ہی اہم اور نازک ذمے داری ہے۔ اس کی طرف اوپر کی احادیث میں اشارہ گذر چکا ہے؛ مگر اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو الگ سے ذکر کرنا مناسب سمجھا گیا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری اگر چہ باپ پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ماں جو کردار (رول) ادا کرسکتی ہے، اس کے مقابلے میں باپ کی حیثیت ثانوی درجہ کی رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ ماں کی گود، بچے کا سب سے پہلا مدرسہ و تعلیم گاہ ہوتی ہے، پھر بچہ کو ماں سے دن رات کے چوبیس گھنٹے میں اکثر اوقات

---

(۱) فتح الباری: ۱۳/۱۱۲، ۱۱۳

سابقہ پڑتا ہے، جب کہ باپ سے بہت کم سابقہ پڑتا ہے؛ اس لیے عورت پر بچوں کی تعلیم وتربیت کی یہ نازک ذمے داری باپ سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات تو یہ ذہن نشین ہونا چاہیے کہ بچے کو شروع ہی سے ایمان و یقین میں مضبوط کرنے کی فکر لازم ہے۔ دوسرے اسلامی آداب و اسلامی تہذیب سے اس کو آراستہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، پھر جب وہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائے، تو تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے، تعلیم میں اول ومقدم دینی تعلیم کو رکھنا چاہیے پھر عصری ودنیوی تعلیم سے بھی بچہ کو آراستہ کرنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔

یہ مختصر جملے بڑی تفصیل کے متقاضی ہیں، ؛لیکن یہ اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ آج عام طور پر مائیں اپنے بچوں کی تربیت میں انتہائی کوتاہی کرتی ہیں، ان کو نہ اسلامی آداب سکھاتی ہیں، نہ اسلامی تہذیب واخلاق سے ان کو آراستہ کرتی ہیں ؛ بل کہ صرف انگریزی وعصری اسکولوں کے حوالے کر کے یہ سمجھ جاتی ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا؛ مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ان اسکولوں میں ایمان و یقین تو ایک طرف رہا، وہاں ان بچوں کو اخلاق و آداب کی تعلیم بھی نہیں دی جاتی ؛ بل کہ اور زیادہ بے ادبی، گستاخی، بد تہذیبی سکھائی جاتی ہے، جیسا کہ مشاہدہ وتجربہ ہے؛ اس لیے بچوں کی تربیت کا گھر میں نظام بنانا چاہیۓ ؛ مگر اس کے لیے پہلے ماؤں کو علم واخلاق، ایمان واسلام سے اپنے آپ کو مزین و آراستہ کرنا چاہیے، ورنہ جہالت و بداخلاقی و بد تہذیبی سے ماں خود آزاد نہ ہو، تو بچوں کی وہ کیا تربیت کر سکتی ہے؟

بچوں کی تربیت کے لیے حضراتِ انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کے قصے، حضراتِ صحابہ وصحابیات کے واقعات اور بزرگانِ دین کے حالات وکوائف کا پیش کرنا اور ان کو سنانا نہایت مفید ہوتا ہے اور چوں کہ بچے کہانی سننے کے نہایت شوقین

ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ ان قصوں کو بہت ذوق ورغبت سے سنتے اور یاد بھی کرتے ہیں۔لہذا اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔بعض عورتیں بچوں کو گالیاں سکھاتیں ہیں اور بچے کی زبان سے گالیاں سن کر خوش ہوجاتی ہیں اور اکثر عورتیں اپنے بچوں کو ٹی وی کی عادی بناتی ہیں اور بچے اس کی وجہ سے فحش و بے حیائی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور بعض عورتیں اپنے بچوں کو گانے سکھا کر خوش ہوجاتی ہیں۔غور کیجیے کہ یہ تربیت ہو رہی ہے یا بگاڑ؟

غرض یہ کہ ماں پر یہ بڑی اہم و نازک ذمے داری ہے۔اس کو احساس ذمے داری کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔تربیت اولاد کے سلسلے میں مشہور محدث علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تحفۃ المودود باحکام المولود'' میں ایک جگہ تفصیلی کلام کیا ہے۔میں یہاں اس کے ایک حصہ کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔اور وہ یہ ہے:

جن چیزوں کا بچہ بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے ان میں سے ایک اس کے اخلاق کی طرف بھی توجہ ہے؛ کیوں کہ اخلاق پیدا ہی ہوتے ہیں ان چیزوں سے جن کی عادت مربی بچپن میں ڈالتا ہے، جیسے سخت مزاجی، غصہ، چاپلوسی، جلد بازی، طیش، شدت اور لالچ وغیرہ، پس بڑے ہونے کے بعد ان چیزوں کی تلافی اس پر مشکل ہوجاتی ہے اور یہ صفات و حالات اس میں راسخ ہوجاتے ہیں۔اسی لیے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ان کے اخلاق منحرف ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی تربیت ہی اسی طرح ہوئی ہے۔اسی طرح ضروری ہے کہ بچہ جب عقل وشعور کی عمر کو پہونچ جائے، تو لہو ولعب اور باطل قسم کی مجالس سے بچے، گانے، فحش اور بدعت اور بری گفتگوں کے سننے سے بچے؛ کیوں کہ

جب یہ اس کی سماعت سے معلق ہو جاتے ہیں، تو بڑے ہو کر ان باتوں سے الگ ہونا ان پر مشکل ہوتا ہے۔ اور اس کے ذمے دار کو بھی ان باتوں سے ان کو ہٹانا شاق (مشکل) ہوتا ہے؛ کیوں کہ عادات کو بدلنا مشکل کاموں میں سے ہے۔ ذمے دار کو چاہیے کہ وہ بچہ کو کسی سے کوئی چیز لینے سے بہت ہی زیادہ اجتناب کرائے؛ کیوں کہ جب وہ لینے کا عادی ہو جائے گا، تو یہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی اور وہ لینے کا عادی ہوگا، نہ کہ کسی کو دینے کا۔ لہٰذا بچہ کو دینے اور خرچ کرنے کی عادت ڈالے اور ذمے دار جب کسی کو کچھ دینا چاہے، تو بچہ کے ہاتھ سے دے تا کہ وہ دینے کی حلاوت کا مزہ چکھے۔ نیز بچہ کو جھوٹ اور خیانت سے اس سے زیادہ بچائے جتنا کہ اس کو زہر سے بچاتے ہیں؛ کیوں کہ جھوٹ اور خیانت کی سبیل اس پر آسان ہوگئی، تو دنیا اور آخرت کی سعادت اس کے حق میں خراب ہوگئی اور اس کو ہر خیر سے محروم کر دیا۔ بچہ کو سستی سے، بے کاری سے، راحت و آرام سے بچائے؛ بل کہ اس کے برخلاف (محنت و مجاہدہ) کی عادت ڈالے اور آرام صرف اتنا دے جس سے کہ اس کا نفس اور بدن کام کے لیے تیار ہو جائے؛ کیوں کہ سستی اور بے کاری برے نتائج اور شرمندگی کا ذریعہ اور سبب بنتی ہیں اور محنت اور کوشش سے اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دنیا میں یا آخرت میں اور کبھی دونوں جگہ۔ پس جو سب سے زیادہ آرام کرتا ہے وہ (بعد میں) سب سے زیادہ تھکتا ہے اور جو سب سے زیادہ محنت کرتا ہے، وہ بعد میں سب سے زیادہ راحت پاتا ہے۔(۱)

---

(۱) تحفة المودود: ۲۰۹-۲۱۰

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کے اس کلام سے بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے، اگر ہماری مائیں ہم پر توجہ مرکوز کریں تو ان کی اولاد سلف کے نمونہ پر چلے گی اور مخلوق کو بھی ان سے نفع ہوگا۔

آخر میں ایک حدیث پر اس فصل کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَدِّبُوْ أَوْلَادَكُمْ عَلٰى ثَلَاثِ خِصَالٍ حُبِّ نَبِيِّكُمْ وَحُبِّ الِ بَيْتِهِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ.»(۱)

(اپنی اولاد کو تین عادتوں پر تربیت کرو، ایک تمہارے نبی اکرم کی محبت، دوسرے نبی کے گھر والوں کی محبت، تیسرے تلاوۃ قرآن۔)

اس حدیث میں اول ایمان کی، دوسرے اعمال کی تعلیم وتلقین اور اس پر تربیت کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آل رسول کی محبت ایمان کا تقاضا ہے اور جس کے دل میں یہ چیز پیدا ہو جائے، وہ اتباع رسول اور اتباع آل رسول کے ذریعہ اپنے عمل کو بھی درست کر لیتا ہے، لہذا سب سے پہلے رسول کی محبت بچوں میں پیدا کی جائے، پھر تلاوت قرآن کی تعلیم ہونا چاہئے؛ اس لیے کہ قرآن ہمارا اصل ماخذ وسرچشمۂ ہدایت ہے۔

آج بچوں کو خود ماں باپ، فلم اسٹاروں، اور کھلاڑیوں اور دنیا داروں کی محبت سکھاتے ہیں اور دنیا بھر کی چیزیں پڑھاتے ہیں؛ مگر قرآن اور اسلام کی تعلیم نہیں دیتے، یا اگر دیتے بھی ہیں، تو ثانوی درجہ پر دیتے ہیں جس سے بچوں میں بگاڑ وفساد کا آنا لازمی ہے۔

---

(۱) طبرانی بحوالہ کنوز السنۃ:۱۳۸

غرض یہ کہ ماں کے ذمے ہے کہ بچوں کی تربیت پر خاصا زور صرف کرے اور ہر اچھی عادت، تمام اچھے اخلاق ان میں پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

شوہر کے والدین اور رشتے داروں سے سلوک

عورت پر لازم ہے کہ شوہر کے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے، شوہر کی ماں کو اپنی ماں اور شوہر کے باپ کو اپنا باپ سمجھے، بھائی کو اپنا بھائی اور بہن کو اپنی بہن سمجھے، اسی طرح دیگر رشتے داروں کو درجہ بدرجہ مقام دے کر ان کو اس درجہ و مقام کے لحاظ سے دیکھے اور اس کے مناسب ان سے سلوک کرے۔

علامہ شمس الدین الذہبی رَحِمَہُ اللہ لکھتے ہیں: عورت پر واجب ہے کہ شوہر کے خاندان والوں اور اس کے رشتے داروں کا اکرام کرے۔ (۱)

آج کل امت میں جو امراض اور بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں، جن سے معاشرہ فاسد اور خراب اور متعفن ہو گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت شادی ہوتے ہی شوہر کو اس کے رشتے داروں اور والدین سے جدا کرنے کی فکر کرتی ہے، اور اس کی تحریک شروع کر دیتی ہے۔ شوہر کے والدین سے بدسلوکی، شوہر کے بھائی، بہنوں سے لڑائی جھگڑا، اور اس کے رشتے داروں سے نفرت و کراہت اور ان کی توہین و تذلیل، آخر کار نوبت یہاں تک پہونچتی ہے کہ شوہر اور اس کے خاندان میں نفاق، و شقاق پیدا ہوتا ہے اور جدائی و فراق کے حالات بن جاتے ہیں اور اس سب کی ''ہیروئن'' یہی نئی نویلی دلہن ہو جاتی ہے۔

اسلام تو اتحاد و اتفاق، پیار و محبت کا سبق دیتا ہے اور یہاں اس کے خلاف نفاق،

(۱) الکبائر: ۱۷۵

شقاق اور فراق کی باتیں ہوتی ہیں۔ عورت کو چاہیے کہ اس روش سے دور رہے اور شوہر کے تمام اہل خاندان کے ساتھ محبت کے ساتھ اور حسن سلوک کے ساتھ رہے۔

تنبیہ : میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جگہ اور کلی طور پر اس صورت حال کی ذمے دار یہ شادی ہونے والی لڑکی ہوتی ہے، نہیں، ؛ بل کہ بہت ساری جگہوں پر شوہر کے والدین و رشتے دار اور خود شوہر کی طرف سے لڑکی پر زبردستی اور بے جا مطالبات وغیرہ کی وجہ سے اس طرح کی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے؛ مگر چوں کہ اس رسالہ کا موضوع یہ نہیں ہے؛ اس لیے اس کا ذکر ہم نے نہیں کیا ہے اور بعض دوسرے مضامین میں ہم نے اس پر بھی کلام کیا ہے؛ اس لیے کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہاں صرف لڑکی کو ذمے دار کیوں بتایا گیا ؟ وجہ ظاہر ہے کہ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ عورت شوہر کے رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے ،اس کی ترغیب دینا مقصود ہے لہذا ہم نے بات کو اسی پر منحصر و محدود رکھا ہے۔

گھریلو کام کس کی ذمے داری ہے؟

ازدواجی زندگی میں خوشی وخوش گواری پیدا کرنے کے لیے جو تدابیر و ذرائع ہیں ان میں اہم بات یہ ہے کہ عورت گھریلو کام کاج کے لیے ہمیشہ اپنے آپ کو مستعد وتیار رکھے، کھانا پکانے ، برتنوں کو صاف کرنے ، گھر کو سجانے اور سنوارنے اور ہر چیز میں صفائی وستھرائی ،تہذیب وشائستگی کا پاس ولحاظ رکھنے کی فکر وکوشش کرنا ،عورت کی اہم ترین ذمے داریوں میں سے ہے۔

اس سلسلے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی تنہا اپنے گھر کی تمام ذمے داریاں پوری فرماتی تھیں ،حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مقام ومرتبہ میں ،علم و فضل میں اور حسب ونسب میں بڑھ کر کون عورت ہوسکتی ہے؟ جب آپ ہی اپنے گھر

کا سارا کام کرتی تھیں، تو ہر مسلمان عورت کو بھی ان کی اتباع میں یہی طریقہ اپنانا چاہیے۔ یہ جو عوام؛ بل کہ خواص اور علما میں بھی مشہور ہو گیا ہے کہ عورت پر کھانا پکانے وغیرہ کی ذمے داری نہیں ہے؛ بل کہ شوہر کے ذمے ہے کہ عورت کو پکا پکایا کھانا لا کر دے، یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ فقہا کرام نے اس مسئلہ میں تفصیل لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت ایسے خاندان کی ہے کہ اس کی عورتیں خود پکانے اور گھریلو کام کرنے کی عادی نہیں ہوتیں،؛ بل کہ خدمت گاروں سے کام لیتی ہیں، تب شوہر کے ذمے ہے کہ پکا پکایا کھانا مہیا کرے، یا کوئی خدمت گار عورت کے لیے مقرر کرے اور اگر عورت اپنے گھر میں خود کام کرنے کی عادی ہے اور ایسے خاندان کی ہے کہ وہاں کی عورتیں خود گھریلو کام کرتی ہیں تو خود عورت پر پکانا واجب ہے، حتیٰ کہ شوہر سے اس کام کی اجرت لینا بھی اس کے لیے جائز نہیں۔ علما نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عام عورتوں پر گھریلو کام کرنا شرعاً و عادۃً واجب ہے۔ ہاں بڑے خاندان کی عورت جس کو اس کام کی عادت نہیں، اس کے لیے پکا ہوا کھانا فراہم کرنا مرد کے ذمے ہے۔ فافہم

نباہ کی کوشش

ازدواجی زندگی کا مسئلہ بڑا ہی نازک ہوتا ہے اور یہ صرف دو افراد (مرد و عورت) کا مسئلہ نہیں؛ بل کہ دو خاندانوں کا مسئلہ ہے اور پھر ایک دو دن یا چند مہینوں کا مسئلہ نہیں؛ بل کہ زندگی بھر کا مسئلہ ہے؛ اس لیے کھٹی میٹھی باتیں، نرم و گرم حالات، سختی و نرمی کی کیفیات، مزاجوں میں تلون، حالات میں اتار چڑھاؤ، رایوں میں

(۱) دیکھو عالمگیری:۱/۵۵۰، البحر الرائق:۴/۱۸۳، در مختار و شامی:۳/۵۷۹

اختلاف ،نظریات میں تفاوت وغیرہ وغیرہ سبھی قسم کی باتیں پیش آسکتی ہیں ؛اس لیے ہرصورت حال کوانگیز کرنے اور قبول کرنے کے لیے عورت کو پہلے ہی سے تیار رہنا چاہیے ،مرد کی طرف سے کبھی سختی پیش آئے یا اس کا نظریہ وخیال کسی معاملہ میں مختلف ہو جائے ،کبھی غصہ دیکھنے کو ملے ،کبھی مالی تنگی پیش آجاے ،ہرصورت میں عورت نباہ کرنے کی کوشش کرے ،اسی لیے شریعت میں ازدواجی زندگی کے تعلق کوتوڑنے کی سخت مذمت و برائی بیان کی گئی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”شیطان اپنا تخت سمندر پر بچھاتا ہے اور اپنی ذریت کوفتنہ مچانے بھیجتا ہے اور اس سے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جوسب سے بڑا فتنہ مچانے والا ہو،بس ایک ایک اس کے پاس آکر کہتے ہیں کہ میں نے یہ فتنہ کا کام کیا، میں نے یہ کام کیا،تو شیطان کہتا ہے کہ تو نے تو کچھ نہیں کیا ،پھر ایک شیطان آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں کے پیچھے پڑ کر اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑا کہ اس کے اور اسکے بیوی کے درمیان تفریق کرادی ، یہ سن کر شیطان خوش ہو جاتا ہے اور اس کو شاباشی سے دے کر اس کو گلے سے لگالیتا ہے۔(۱)

معلوم ہوا کہ میاں بیوی میں تفریق و جدائی شیطان کوسب سے زیادہ پسند ہے؛ اس لیے وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے لہذا مرد کو بھی اور عورت کو بھی چاہیے کہ کسی بھی صورت میں تفریق تک نوبت نہ پہنچائیں ،الاّ یہ کہ ضرورت شدیدہ لاحق ہو جائے۔

نیز حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) مسلم:۲/۳۷

«اَیُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا الطَّلَاقَ مِنْ غَیْرِ بَاسٍ فَحَرَامٌ عَلَیْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ »(۱)

(جو کوئی عورت اپنے شوہر سے بلا کسی وجہ کے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوش بو حرام ہے۔)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ عورت کو بلا وجہ طلاق یا خلع کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ؛ بل کہ نباہ کرنا چاہیئے ، ہاں ایسی سخت حالت پیش آجائے کہ بغیر طلاق یا خلع کے زندگی مشکل ہوجائے تو پھر الگ بات ہے۔

ولادت اور ضبط ولادت

ازداجی زندگی میں عوت کے لیے ایک کٹھن مرحلہ ولادت و زچگی کا ہوتا ہے، ؛مگر یہ مرحلہ عورت کے حق میں دنیوی اعتبار سے اور ازواجی کے لحاظ سے ایک کمال کا ثبوت اور اخروی زندگی کے لیے ایک فضیلت کا ذریعہ ہے، چناں چہ جو عورت بانجھ ہوتی ہے اس کو ناقص سمجھا جاتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ولادت عورت کے حق میں ایک کمال ہے۔ پھر اگر کوئی عورت بانجھ ہوتی ہے، تو لوگ اس کے نقص و عیب کو دور و زائل کرنے کے لیے کبھی ڈاکٹروں کے پاس، کبھی عاملوں کے پاس اور کبھی مندر کے پجاریوں کے پاس تک جاتے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں (حالاں کہ بعض عامل اور یہ مندر کے پجاری شرکیہ و کفریہ کلمات پر مشتمل تعویذ گنڈے کرتے ہیں، جس سے ایمان کا سلب ہوجانا یقینی ہے)

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کا بانجھ ہونا عیب و نقص اور با اولاد ہونا وجہِ کمال شمار ہوتا ہے۔ اور اخروی فضیلت اس میں اس طرح ہے کہ زچگی کی تنگی و پریشانی

(۱) دارمی:۲/۱۳۴،ترمذی:۱/ ۲۲۶،ابن ماجہ:۲/ ۱۴۸، ابو داؤد: ۱/۳۰۳

پھر بچے کی پرورش وتربیت میں پیش آنے والی کلفت پر اس کو ثواب ملتا ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عورت اپنی حالت حمل سے لے کر بچہ جننے اور دودھ چھڑانے تک (فضیلت وثواب میں) ایسی ہے جیسے وہ آدمی جو اسلام کی راہ میں سرحد کی نگہبانی کرنے والا ہو اور اگر اس درمیان مر جائے تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملے گا۔ (۱)

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ دینی ودنیوی دونوں اعتبار سے عورت کے لیے یہ بات باعثِ کمال وفضیلت ہے کہ اس کو اولاد ہو، تو اب ایک دوسری بات بھی سمجھ لینا چاہیے، وہ یہ کہ اسلام میں کثرتِ اولاد بھی مطلوب ہے۔ چناں چہ یہ مضمون احادیث میں پوری صراحت ووضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمْ» (۲)

(شادی ایسی عورت سے کرو جو زیادہ بچے جننے اور محبت کرنے والی ہو؛ کیوں کہ میں تمہاری وجہ سے فخر کروں گا۔)

ملا علی قاری رحمہ اللہ ''شرح مشکوۃ'' میں مذکورہ بالا حدیث کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ودود'' وہ عورت جو اپنے شوہر سے محبت کرنیوالی ہو اور ''ولود'' وہ

---

(۱) کنز العمال: بحوالہ بہشتی زیور حصہ آٹھواں: ۵۸

(۲) ابو داؤد: ۱/۲۸۰، نسائی: ۲/۷۰

ہے جوزیادہ بچے جننے والی ہو۔اوررسول اللہ نے یہ دوقیدیں اس لیے لگائی ہیں کہ بچہ جننے والی عورت اگرشوہر سے محبت نہ رکھتی ہو،تو شوہر بھی اس سے رغبت نہ کرے گا اوراگرعورت محبت تو کرتی ہو؛مگر بچہ جننے والی نہ ہو،تو مقصود حاصل نہ ہوگا اوروہ مقصودامت کوزیادہ کرنا ہے،تو الدو تناسل کی کثرت سے (پھرآخری جملہ کی تشریح میں کہتے ہیں) میں تم سے فخر کروں گا؛یعنی تمہارے سبب سے ساری امتوں پر فخر کروں گا، میرے ماننے والوں کی کثرت کی وجہ سے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تکثیر اولاد کی ترغیب دی ہےاوراس کی حکمت ومصلحت بھی بتلائی ہے کہ اگرتمہاری اولادزیادہ ہوگی تو میں اس کی وجہ سے دیگرامتوں پرفخرکروں گا کہ میرے ماننے والے زیادہ ہیں۔

حضرت انس رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ بہت محبت کرنیوالی اور بہت جننے والی سے شادی کرو کیونکہ میں قیامت کے دن تمہاری وجہ سے فخر کروں گا۔(۲)

حضرت ابن عمر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کی حدیث میں یہ آیا ہے کہ شادی کرو(اولاد)زیادہ کرو؛ کیوں کہ میں امتوں پرتمہارے سبب سے فخر کروں گا۔(۳)

مگرآج مغربی تہذیب کے بت نے اسلام کی تعلیم کے بالکل برعکس یہ تعلیم و تبلیغ جاری کررکھی ہے کہ اولادکم سے کم ہو،اس لیے پہلے،تو یہ نعرہ تھا کہ ”ہم دواور

---

(۱) مرقات:۶/۱۹۲-۱۹۳

(۲) ابن حبان بحوالہ فتح الباری:۹/۱۱

(۳) رواہ الشافعی بلاغافتح الباری:۹/۱۱۱

ہمارے دو''؛ مگر اب اس تقلیل کی تعلیم میں مزید ترقی ہوئی ہے، اس لیے اب یہ نعرہ لگایا جارہا ہے ''ہم دو اور ہمارا ایک'' اور شاید مزید ترقی ہوگی تو یہ کہا جائیگا ''ہم دو اور ہمارا کوئی نہیں''۔ خیر اس پر تو کوئی حیرت واستعجاب نہیں البتہ اس پر ضرور حیرت وتعجب ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ مغربی تہذیب کے اس بت نے اسلام کے پیروکاروں میں سے بھی کچھ اپنے پجاری پیدا کرلیے، جو اس کی تعلیم پر آمنا وصدقنا کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس پر عمل کو ترقی کی علامت سمجھتے ہیں۔

یہ ضبط ولادت یا برتھ کنٹرول (Birth control) کا نظریہ جن بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے، ان میں بنیادی طور پر اس بات کو پیش کیا جاتا ہے کہ انسانی نسل کا اضافہ معاشی خطرات وپریشانیوں کا باعث ہے؛ کیوں کہ وسائل پیداوار محدود ہیں۔ لہذا اگر تحدیدِ نسل نہ کی گئی تو آئندہ مزید وشدید خطرات کا دنیا کو سامنا کرنا پڑیگا۔ اس کے بعد نکات بعد الوقوع کے طور پر اس نظریہ کی کچھ اور بنیادیں بھی تراش لی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ زیادہ بچوں کا ہونا عورت کے لیے تکلیف کا باعث ہے اور اس کی صحت اور خوب صورتی پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ کہ اولاد کی کثرت کی وجہ سے ان کی صحیح تربیت ومعقول تعلیم کا انتظام مشکل ہوتا ہے وغیرہ۔

جہاں تک معاشی خطرات ومشکلات کا مسئلہ ہے، تو اس کی بنیاد پر ضبطِ تولید خالص جاہلی نظریہ ہے جس کی تردید میں قرآن پاک کی متعدد آیات نازل ہوئی ہیں۔ جاہلی دور میں عرب کے اندر اولاد کا قتل مروج تھا، جس کی ایک وجہ یہی تھی کہ معاشی تنگی وپریشانی کا خطرہ محسوس کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کی تردید فرمائی ہے اور اس عمل کو گناہ کبیرہ قرار دیا۔

چناں چہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا﴾ (الإسراء:۳۱)

(اور تم اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو اور تم کو رزق دیتے ہیں، بلاشبہ ان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے)

دوسری جگہ فرمایا

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ﴾ (الأنعام:۱۵۲)

(اور اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا حالاں کہ اللہ ہی نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ پھر کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے بچے کو اس لیے قتل کر دینا کہ وہ تیرے ساتھ ساتھ کھائے گا۔(۱)

اس حدیث کا منشا بھی یہی ہے کہ فقر وفاقہ یا معاشی تنگی کے اندیشہ سے اولاد کو قتل کرنا گناہ عظیم ہے اور شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔ آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ اس پر واضح دلیل وبرہان ہیں کہ معاشی تنگ دستی وتنگ حالی کے پیش نظر اولاد کو مارنے کا نظریہ غیر اسلامی وجاہلی نظریہ ہے؛ کیوں کہ اسلام بنیادی طور پر اس فلسفہ ونظریہ کا مخالف ہے کہ انسانی آبادی میں اضافہ معاشی تنگی پیدا کرتا ہے؛ بل کہ اسلام،

---

(۱) بخاری:۲/۱۱۲۲، مسلم:۱/۶۳

تو صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ جو بچہ بھی دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنا مقررہ ومقدرہ رزق لے کر آتا ہے ۔ پھر عقلاً بھی یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا؛ اس لیے کہ اگر آبادی میں اضافہ ہوتا ہے،تو اللہ نے قدرتی طور پر اس کے کم کرنے اور حد اعتدال پر رکھنے کے لیے انتظامات بھی کر رکھے ہیں اور آج اموات بھی اسی کثرت کے ساتھ ہو رہی ہیں، کہیں زلزلے ہیں، کہیں طوفان اور سیلاب کے تھپیڑے ہیں، کہیں آندھی کی ہلاکت خیزیاں ہیں، کہیں ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کے ہوش ربا حوادث ہیں، کہیں قتل عام کی وارداتیں ہیں اور کہیں میزائیل اور بم دھماکوں کی ہلاکت آفرینیاں ہیں اور اس طرح بہ یک وقت ہزار ہا انسان پردۂ عدم میں جا چھپتے ہیں،لہٰذا یہ خیال کہ انسانی نسل کا صرف اضافہ ہو رہا ہے اور معاشی تنگی پیش آ رہی ہیں صحیح نہیں ۔

ہاں! معاشی تنگی جو اس وقت اپنی ہلاکت خیزیوں سے انسانی معاشرے کو تہ وبالا کر رہی ہے، اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ تقسیمِ دولت کا نظام صحیح نہیں ہے،حق دار محروم ہیں اور غیر موج اڑا رہے ہیں۔ چناں چہ عوام پریشان وتنگ حال ہے اور اہلِ حکومت اپنی عیاشیوں اور لذت کوشیوں میں مست ہیں،جس کی وجہ سے حق دار تک ان کا حصۂ رسدی نہیں پہونچ رہا ہے اور وہ پریشان ہیں ۔

اب رہا عورت کی صحت وتندرستی کا مسئلہ،تو اس کی بنیاد پر برتھ کنٹرول البتہ قابل غور ہوسکتا ہے؛مگر یہ ایک استثنائی ہوگی اور کسی عورت کے حالات بیماری وکم زوری کی وجہ سے اس کا تقاضا کرتے ہوں،تو اہل فتوی علما کے سامنے پوری حالت وکیفیت پیش کر کے فتوی لیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے؛لیکن محض آئندہ کے خطرہ اور خدشہ سے کہ کہیں آئندہ کثرتِ اولاد صحت پر اثر انداز نہ ہوجائے ، برتھ کنٹرول وضبط تولید کی اجازت نہیں ہوسکتی؛اس لیے کہ ایسے خطرات وخدشات،تو ولادت وکثرت ہی پر

کیا موقوف ہیں بغیر اس کے بھی انسان بیمار ہوسکتا ہے اور عمر ڈھلتی ہے تو انسان بیٹھے بٹھائے بھی کم زوریوں اور بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ کہنا کہ کثرت ولادت سے صحت ضرور خراب ہوتی ہے، مشاہدہ اور تحقیق کے خلاف ہے۔ آج بھی ہزاروں ایسی عورتیں ہیں جو کثیر العیال ہونے کے باوجود پوری طرح صحت مند ہیں۔ اور خوبصورتی اور حسن و جمال میں کمی آجانے کا عذر اوپر کے عذر سے بھی زیادہ لنگ ہے اور بالکل نا قابلِ التفات، پھر یہ عورتیں کب تک اپنے حسن و جمال کی آبیاری کرتی رہیں گی؟ اور کب تک اس کی نمائش کرتی رہیں گی؟ جب عمر ڈھلے گی تو یہ ساری لیپ پوت ہی کیا؟ اصل حسن و جمال بھی منھ موڑ لیتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ جو عارف کامل گذرے ہیں، انہوں نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

زلف جعد و مشکبار و عقل بر
آخر او دم زشت پیر خر

(یعنی یہ حسین گھونگر والے اور مشک بار اور عقل و ہوش ربا زلفیں جن پر لوگ دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔ انجام کار بوڑھے گدھے کی بری دم معلوم ہوتی ہیں)

اور نذیر اکبر آبادی مرحوم کے اشعار ہیں۔

کئی بار ہم نے دیکھا کہ جن کا
مشین بدن تھا معطر کفن تھا

جو قبر کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضو بدن تھا نہ تار کفن تھا

غرض یہ کہ یہ عذر کوئی قابل توجہ و التفات نہیں کہ اس کی بنا پر ایک حرام و ناجائز امر جائز قرار پائے۔

رہا یہ کہنا کہ کثرتِ اولاد کے ساتھ تعلیم وتربیت صحیح نہیں ہوسکتی یہ بھی صحیح نہیں جس کو تربیت کرنا آتا ہے وہ تو بہت سوں کی کر دیتا ہے اور جو تربیت کرنا نہ جانتا ہو وہ ایک کی بھی نہیں کرسکتا۔ پھر جب اللہ نے تعلیم وتربیت کا حکم دیا ہے، تو ہمارا کام ہے کہ تربیت وتعلیم کا صحیح انتظام کریں۔ آج لوگ صرف فیشن پرستی ،دنیا داری، مال داری اور دنیوی عہدے ومناصب کے حصول کو صحیح ومعقول تعلیم وتربیت سمجھتے ہیں، ورنہ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم وتربیت کے لیے کوئی پریشانی نہیں۔

غرض یہ کہ یہ تمام باتیں ازقبیل عذر لنگ ہیں، لہذا عورت کو اس طرح کی باتوں سے خلاف شرع کو یہ حرکت نہ کرنا چاہئے۔

فصل سابع

عورت کیا کچھ کر سکتی ہے؟

عورت اسلامی نقطۂ نظر سے، کیا کچھ کر سکتی ہے، اس کی تفصیل کے لیے بلا مبالغہ ایک ضخیم جلد چاہیے؛ لیکن یہاں ہم اس موضوع پر نہایت اختصار کے ساتھ چند اہم پہلوؤں کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایک حدیث کی عجیب تشریح

عام طور پر عورتوں میں ایک احساس کم تری پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہم مردوں کے مقابلہ میں کم تر وابتر ہیں اور اس سلسلے میں بعض حدیثوں سے بھی ان کو اور بعض پڑھے لکھے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ اِمْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَفَضْلُ عَائِشَةِ عَلٰى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ »(۱)

(مردوں میں سے بہت کامل ہوئے ہیں اور عورتوں میں سے کوئی کامل نہیں ہوئی؛ مگر مریم بنت عمران رضی اللہ عنہا اور فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت دوسری تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی

(۱) بخاری: ۵۳۲/۱

دوسرے تمام کھانوں پر ہے)

اس حدیث سے بہ ظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورتوں میں کمال نہیں پایا جا سکتا؛ مگر یہ صحیح نہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقصد ہے۔ اگر عورتوں میں کمال نہ پایا جا سکتا تو بعض عورتوں کے کمال کا ذکر کیوں کیا جاتا؟ بل کہ اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ کمال تو دونوں میں پایا جاتا ہے؛ لیکن عام طور پر عورتیں اس کی تحصیل کی کوشش نہ کرنے کی وجہ سے صاحب کامل نہیں بنتیں، ورنہ وہ بھی محنت کریں، تو حضرت مریم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح صاحب کمال بن سکتی ہیں۔ غرض یہ کہ یہ حدیث عورتوں کی تنقیص کے لیے نہیں؛ بل کہ ترغیب کے لیے آئی ہے اور ترغیب اسی چیز کی ہوتی ہے جس کا حاصل ہونا ممکن ہو، ناممکن چیز کی ترغیب نہیں دی جاتی۔

غرض عورتوں کو نہ مایوس ہونا چاہئے اور نہ احساس کم تری کا شکار ہونا چاہیے؛ بل کہ اس حدیث کے پیش نظر ان کو کمال کی تحصیل کے لیے محنت و مجاہدہ کرنا چاہیے۔ اس حدیث کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، اگر کسی مدرسہ یا اسکول میں مثلاً پانچویں جماعت کے طلبہ محنت و مجاہدہ کے ذریعہ کام یاب ہو جائیں اور چھٹی جماعت کے طلبہ محنت نہ کرنے کی وجہ سے ان میں سے اکثر ناکام ہو جائیں اور اساتذہ ان سے یوں کہیں کہ پانچویں جماعت میں اکثر طلبہ کام یاب ہوئے اور چھٹی میں دو چار کے سوا سب ناکام ہوئے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چھٹی جماعت میں کمال پیدا ہی نہیں ہو سکتا، لہٰذا اب محنت نہ کی جائے؛ بل کہ اس سے چھٹی جماعت والوں کو بھی ترغیب دینا مقصود ہے کہ تم بھی محنت کرو گے، تو کام یاب ہو سکتے ہو جیسے تمہاری ہی جماعت میں دو چار افراد کام یاب ہو گئے۔ اسی طرح حدیث میں عورتوں کو مردوں کی طرح صاحب کمال بننے کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

نا قصۃ العقل و الدین ہونے کی تشریح

اسی طرح ایک اور حدیث سے بھی عورتیں غلط فہمی کا شکار ہو گئیں، وہ یہ کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ فرمایا:

”میں نے تم (عورتوں) سے زیادہ عقل و دین میں ناقص ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جو بڑے بڑے عقل مندوں پر غالب آجائیں، کسی عورت نے پوچھا کہ ہمارے دین و عقل میں نقصان کیا ہے؟ تو فرمایا کہ عقل کا نقصان یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور دین کا نقصان یہ ہے کہ حیض کی وجہ سے دو چار دن وہ نماز نہیں پڑھ سکتی اور رمضان میں روزہ نہیں رکھ سکتی۔(۱)

مگر اس حدیث سے بھی یہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ عورت کسی کام کے لائق نہیں اور ہر طرح ناکارہ ہے؛ کیوں کہ حدیث کا منشا بعض اعتبارات سے عورت کے دین و عقل میں کم زوری و نقصان کو بتانا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بعض اعتبارات سے مردوں کی کم زوری و عیب کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خود اسی حدیث میں بتایا گیا کہ مرد باوجود عقل مند ہونے کے عورت سے مغلوب ہو جاتا ہے اور عورت اس کی عقل و فہم پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ مرد کی ایک کم زوری اور عیب ہے؛ مگر اس کی وجہ سے مرد کو ہر اعتبارات سے کیا کم زور اور ناقص قرار دیا جا سکتا؟

اسی طرح عورت بھی بعض اعتبارات سے عقل و دین میں ناقص ہے؛ لیکن اس کا ہر لحاظ سے ناقص ثابت نہیں ہوتا۔ غرض یہ کہ عورت کو احساس کم تری کا شکار نہیں ہونا چاہیے،؛ بل کہ اپنی بساط اور اپنے حدود اور دائرۂ کار کے موافق کام کرنا چاہیے۔

---

(۱) بخاری:۱/۴۴، ترمذی :۲/۸۹، مسلم:۱/۶۰،ابو داؤد:۲/۶۴۳

اب رہا یہ سوال کہ عوت کیا کچھ کرسکتی ہے؟ اس کی مختصر توضیح وتفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جارہی ہے۔

عورت اور تعلیمی سرگرمیاں

عورت کی خدمات اور سرگرمیوں کا ایک اہم اور نسبتاً آسان، زیادہ بارآور ومفید میدان ''تعلیمی میدان'' ہے۔

اس میں ایک تو یہ کہ عورت خود اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی جستجو کرے اور دوسرے یہ کہ دوسروں کو تعلیم دینے اور تربیت دینے کی کوشش کرے۔

اسلام نے علم کے باب میں عورتوں اور مردوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کی ہے؛ بل کہ جس طرح مردوں کو اس کا مکلّف بنایا ہے کہ وہ علم سے آراستہ ہوں، اسی طرح عورتوں پر بھی لاگو کیا کہ وہ علم سیکھیں۔

چناں چہ فرمایا گیا:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ »(۱)

(یعنی علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے)

اس میں مرد وعورت کی تفریق کے بغیر علم کی طلب وتحصیل کو ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا بھی احادیث میں ذکر ملتا ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''جس نے تین لڑکیوں یعنی بیٹیوں کی کفالت کی اور ان کو عمدہ تعلیم دی اور ان سے حسن سلوک کیا اور ان کی شادی کردی تو اس کے لیے

(۱) جامع العلم :۱/۱۳۱

جنت ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی ضروری ہے کہ علم سے آراستہ ہوں۔ اسلام نے اس پر زور دیا ہے اور اس کے لیے راہ کو کشادہ فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور اول کی عورتوں نے علم میں رسوخ وکمال حاصل کیا اور اس میں نام ور ہوئیں اور اس مقام پر فائز ہوئیں کہ ضرورت پر مرد بھی ان سے رجوع کرتے اور بسا اوقات علمی بحث ومباحثہ میں عورتیں مردوں پر فوقیت لے جاتیں۔

اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ کتب احادیث میں مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں فرمایا کہ عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہ باندھا جائے اگر کسی نے اس سے زیادہ مہر باندھا تو میں اس زیادتی کو بیت المال میں ڈال دوں گا، مجلس میں ایک عورت، عورتوں کی صف سے کھڑی ہوئی اور کہنے لگی کہ امیر المؤمنین! آپ کو یہ حق نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیوں؟ تو کہا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ:

﴿ وَ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ﴾

(النساء:۲۰)

(اگر تم نے عوت کو ایک قنطار بھی دیا تو اس میں سے واپس کچھ نہ لو)

(اس سے معلوم ہوا کہ ایک قنطار بھی دیا جا سکتا ہے)

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عورت نے صحیح کہا اور مرد نے خطا کی۔(۲)

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان

---

(۱) ابو داؤد:۲/۷۰۰

(۲) جامع العلم:۱/۱۳۱

کے سامنے ذکر کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کو اس کے اہل وعیال کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا تھا؛ بل کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ کافر کے عذاب میں زیادتی کردی جاتی ہے، جب کہ اس کے اہل وعیال روتے ہیں، پھر آیت پڑھی:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (النجم: ۳۸)

(کوئی کسی کا گناہ نہیں اٹھائے گا)

اس سے اندازہ کیجیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم کس قدر گہرا اور راسخ تھا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے فرمایا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس پر سکوت اختیار کیا؛ بل کہ تائید فرمائی۔ (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق تاریخ گواہ ہے کہ بہت بڑی عالمہ اور فاضلہ تھیں، دینی علوم میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے صحابہ کرام ان سے استفادہ کرتے تھے، ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بہت سے مشکل مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

حضرت مسروق تابعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ میراث کے مسائل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرمایا کرتے۔

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم صحابہ پر جب بھی کوئی مشکل مسئلہ آپڑتا تو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے اور ان کے پاس اس بارے میں ضرور کوئی علم ہوتا۔

---

(۱) بخاری: ۱/۱۷۲

حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں میں سب سے بڑی خواتین کا علم تھیں۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر تمام ازواج مطہرات کا اور تمام خواتین کا علم جمع کیا جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم سب پر بھاری ہوگا۔ (۱)

یاد رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف علوم شرعیہ تک ہی اپنے کو محدود نہیں فرمایا تھا؛ بل کہ دیگر علوم میں بھی انہوں نے مہارت حاصل کی تھی۔ حضرت عروہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہوتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ میں نے علم طب (ڈاکٹری) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ نیز فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا عالم تفسیر میں کسی کو دیکھا، نہ میراث میں، نہ فقہ میں، نہ شعر و شاعری میں، نہ طب میں، نہ تاریخ عرب میں اور نہ علم نسب میں۔ (۲)

اسی طرح حضرات ازواج مطہرات میں سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بلند پایہ محدثہ وفقیہ ہوئی ہیں، ان سے (۳۷۸) احادیث مروی ہیں اور انہوں نے جو فتوے دئے وہ بھی اتنے ہیں کہ بہ قول ابن قیم رحمہ اللہ ان سے ایک رسالہ بن سکتا ہے۔ (۳)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بڑے بڑے حضرات نے حدیث کی روایت کی ہے، جیسے حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت سلیمان بن یسارؒ، سعید بن المسیبؒ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؒ، عروہ بن الزبیرؒ، کریبؒ، نافعؒ وغیرہ۔ (۴)

حضرت عمرہ بنت عبد الرحمٰن ایک تابعی خاتون ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

---

(۱) تهذيب التهذيب: ۱۲/ ۴۳۵، تذكرة الحفاظ: ۱/ ۲۸

(۲) تذكرة الحفاظ: ۲۸، تهذيب التهذيب: ۱۲/ ۴۳۵، المنهل الراوی: ٦

(۳) اعلام الموقعين: ۱/ ۱۳

(۴) تهذيب التهذيب: ۱۲/ ۴۵٦

خصوصیت کے ساتھ علم حاصل کیا اور بہت بڑی محدثہ ہوئیں، علمائے محدثین نے ان کو بڑے قابل اعتماد علما میں شمار کیا ہے اور حضرت عبد الرحمٰن بن قاسم رحمۃ اللہ جیسے پایہ کے محدث ان سے حدیث کے بارے میں پوچھا کرتے تھے، ابن حبان رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والی یہی حضرت عمرہ تھیں۔ (۱)

اس کے بعد کے ادوار میں بھی عورتوں نے اپنے آپ کو علوم سے آراستہ کیا اور قابل قدر اور نا قابل فراموش کارنامے انجام دیے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ فقہ وحدیث اور علم کلام کے جلیل القدر عالم و امام گذرے ہیں اور ان کا شمار مجتہدین میں ہوتا ہے، انہوں نے جب اپنی مشہور و معروف کتاب ''شرح معانی الاثار'' تالیف کی تو اس عظیم وعجیب وغریب حدیثی تالیف میں ان کی صاحب زادی نے ان کا تعاون کیا، اس طرح کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ املا کراتے تھے اور صاحب زادی لکھتی جاتی تھیں۔ گویا اس حدیثی ذخیرہ کے وجود پذیر ہونے اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے میں ایک خاتون کا ہاتھ ہے۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ فن فقہ کے ایک ممتاز امام ہیں جن کی کتاب ''بدائع الصنائع'' فقہ کا ایک لاجواب ذخیرہ ہے، ان کی زوجہ محترمہ، بہت بڑی فاضلہ اور فقیہ تھیں۔ اور خود علامہ کاسانی کے استاذ محترم کی صاحب زادی تھیں، ان کے استاذ نے شاگرد کے علم وتقویٰ وطہارت کو دیکھ کر اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی تھی۔ اس پردہ نشین خاتون کے علم وتفقہ کا یہ عالم تھا کہ علامہ کاسانی رضی اللہ عنہ کے پاس آنے والے ہر فتویٰ پر ان کا بھی دست خط ہوتا تھا، اور لوگ اس فتویٰ کا اعتبار نہ کرتے تھے جس پر

(۱) ایضاً

ان کا دست خط نہ ہو۔

نویں صدی ہجری کی ایک ممتاز خاتون ام ہانی مریم بنت نورالدین ہیں، ان کا گھر علم وفن، شعروادب کا گھوارہ تھا اور متعدد افراد اس خاندان کے محدثین شمار ہوتے ہیں۔ان کے نانا قاضی فخر الدین رحمۃ اللہ نے ان کی تربیت کی تھی، سب سے پہلے انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا، پھر فقہ وادب میں دست گاہ بہم پہنچائی پھر ان کے نانا ان کو مکہ مکرمہ لے گئے جہاں شیوخ حدیث سے ان کو حدیث کا سبق دلایا، مصر وحجاز کے بیشتر ممتاز محدثین سے استفادہ کیا، صحاح ستہ کی تمام کتب انہوں نے محدثین سے سنی تھیں پھر مسند درس پر فائز ہوئیں، حافظ سخاوی رحمۃ اللہ جیسا بلند پایہ امام حدیث ان کا شاگرد ہے۔(۱)

غرض یہ کہ عورت اگر چاہئے تو علمی میدان میں بہت کچھ کر کے اپنا نام روشن کر سکتی ہے، اور مخلوق کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

ایک انتباہ؛ مگر ایک بات پر تنبیہ کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ تحصیل علم خواہ دینی ہو یا دنیوی، شرعی حدود کے دائرہ میں ہونا چاہئے۔مثلاً عورت کے لیے چوں کہ پردہ ضروری ہے، اس لیے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو بے پردگی اور بے حیائی اور لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط ہو رہا ہے، اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

غرض اسلام تعلیم کا مخالف نہیں ؛ بل کہ وہ تو ترغیب دیتا ہے، ہاں! حدود شرعیہ میں رہنے کی وہ ضرور تاکید کرتا ہے۔

---

(۱) بہ حوالہ خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ:۷۶

عورت اور سیاسی وملی خدمات

رہا عورت کا سیاسی وملی خدمات وسرگرمیوں کا مسئلہ تو اس میں کچھ تفصیل ہے۔ عورت کا امامت وامارت کے منصب پر فائز ہونا تو تقریباً بہ اتفاق علما حرام ونا جائز ہے جیسا کہ اوپر اس پر کلام کر چکا ہوں؛ بل کہ امارت کے لیے انتخاب میں جن اہل حل وعقد لوگوں کو اختیار حاصل ہے، بہ اتفاق علما اس میں بھی عورت کا کوئی حصہ نہیں۔ امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی رحمۃ اللہ نے ''غیاث الامم'' میں لکھا ہے:

فما نعلمه قطعاً، إن النسوة لا مدخل لهن في تخيير الإمام وعقد الإمامة فا نهن ما روجعن قط ولو استشير في هذا الأمر امرأة لكان احرى النساء وا جد رهن بهذا الأمر فاطمة رضي الله عنها ثم نسوة رسول الله صلى الله عليه وسلم أمهات المؤمنين ونحن بابتداء الأذهان نعلم أنه ما كان لهن في هذا المجال مخاض في منقرض العصور ومكر الدهور. (۱)

(یہ بات قطعی طور پر جانتے ہیں کہ عورتوں کو امام کے انتخاب میں اور امارت کے قائم کرنے میں کوئی دخل نہیں ہے؛ کیوں کہ ان سے کبھی اس سلسلہ میں رجوع نہیں کیا گیا، اگر اس معاملہ میں کسی عورت سے مشورہ کیا جاتا تو اس کے لیے عورتوں میں سب سے زیادہ لائقہ وفائقہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہوتیں پھر حضرات ازواج مطہرات امہات المؤمنین رحمہن اللہ حالاں کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں ان کو کسی زمانہ میں بھی کوئی دخل نہ تھا)

---

(۱) غیاث الامم:۶۲ فقرہ ۷۳

غرض امارت اور اس کے انتخاب میں تو عورتوں کو اسلام نے الگ ہی رکھا ہے اور آج کا جدید ذہن بھی اور جدید تجربات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں، ہم یہاں اس سلسلے میں صرف ایک حوالہ نقل کرتے ہیں جس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) نے اپنی اشاعت بابت ۱۴/اگست ۱۹۸۷ء میں یہ خبر شائع کی ہے کہ:

> ۱۹۸۷ء میں امریکہ میں خاص اس مسئلے پر لوگوں کی رائے معلوم کی گئی، معلوم ہوا کہ امریکی ووٹروں کی تقریباً ایک تہائی تعداد خیال کرتی ہے کہ امریکہ کا صدر بننے کے لیے عورت کے مقابلہ میں مرد زیادہ موزوں ہیں۔ رائے دینے والوں میں صرف آٹھ فی صد تعداد ایسی تھی جس کا خیال تھا کہ وائٹ ہاؤس کے عہدہ کے لیے عورت زیادہ بہتر ہوسکتی ہے، ۴۹/فی صد نے کہا کہ دونوں جنسوں میں کوئی فرق نہیں اور ۳۱/فی صد نے خیال ظاہر کیا کہ مرد صدر بننے کے لیے زیادہ اکمل و موزوں ہے۔(۱)

بہ ہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالی نے مرد وعورت کے درمیان بہت سے اعتبارات سے فرق رکھا ہے، اس کا بھی تقاضا بھی یہی ہے کہ عورت جیسی نازک صنف اس ذمے داری سے دور ہی رکھی جائے۔ البتہ دیگر ملی مسائل میں ان کی رائے اور مشوروں کا احترام کیا جائے گا اور بعض ایسے کام وخدمات بھی ان کے سپرد کیے جاسکتے ہیں جو وہ حدود شرعیہ کے اہتمام کے ساتھ اور ان کے دائرے میں رہتے ہوئے سرانجام دے سکتی ہیں۔

---

(۱) بہ حوالہ خاتون اسلام: مولانا وحید الدین خان: ۱۷۳

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض ازواج مطہرات، خلفائے راشدین کے زمانہ میں برابر ملی مسائل میں حصہ لیتی تھیں اور اپنی قیمتی آرا سے فائدہ بھی پہنچاتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقعہ پر ان کے قصاص کے سلسلے میں جو موقف اختیار کی ہوئی تھیں اور اپنے موقف پر دیگر اصحاب الرائے کو جس طرح پر جمع فرمایا تھا اور اس میں وہ جیسی کچھ مضبوط تھیں، تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں، پھر انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جہاد بھی اسی مسئلے پر کیا تھا جس کو تاریخ میں ''جنگ جمل'' سے یاد کیا جاتا ہے۔

نیز یہ واقعہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ عورتوں کا مہر زیادہ نہ باندھو۔ تو ایک عورت جو مجمع میں تھی، اس نے اس پر ٹوک دیا اور کہا کہ آپ کو اس کا حق نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ عورت نے سچ کہا اور مرد نے غلطی کی۔ (۱)

یہ ایک ملی مسئلہ تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملی بہبود کے پیش نظر لمبے چوڑے مہر باندھنے سے منع فرمارہے تھے؛ مگر ایک عورت نے اپنی رائے قرآن کی روشنی میں اس سے مختلف پیش کی اور وہ دربار خلافت میں منظور کرلی گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گشت کرتے جارہے تھے، رات کا وقت تھا، ایک گھر سے ایک عورت کے اشعار پڑھنے کی آواز آئی جن میں عشقیہ مضمون تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے پوچھا کہ تجھ کو کیا ہوا کہ زور سے اشعار پڑھ رہی ہے؟ اس نے بتایا کہ میرا شوہر آپ کے حکم پر جہاد میں گیا ہوا ہے، اس کی یاد میں یہ اشعار پڑھ رہی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو صبر کے لیے کہا اور حضرت ام المؤمنین حفصہ

---

(۱) جامع العلم:۱/۱۳

رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور مشورہ کیا، پوچھا کہ عورت اپنے شوہر کے بغیر کتنے دن صبر کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے شرم سے سر جھکا لیا، آپ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ حق بولنے سے نہیں شرماتا، بولو، کہ عورت بغیر شوہر کتنے دن رہ سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ چار یا چھ مہینے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام علاقوں میں فرمان بھیج دیا کہ فوجیوں کو چار ماہ سے زیادہ نہ روکا جائے۔ (۱)

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو اسلام نے حق رائے دہی دیا تھا اور وہ دور اول میں پوری آزادی کے ساتھ اس کو استعمال کرتی تھی اور اس کی رائے کا احترام بھی کیا جاتا تھا اور اس کو قبول بھی کیا جاتا تھا۔

اسی طرح حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے وہ ملی خدمت بھی انجام دینے کی اہل مانی گئی ہے، حضرت شفا رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ خاتون ہیں جن کو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے ایک جگہ مہاجرات میں سے بتایا ہے، ابن حبان رحمۃ اللہ نے کہا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت حاصل ہے، یعنی وہ صحابیہ تھیں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وہ روایت کرتی ہیں، ان کے بارے میں ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو مشورہ میں مقدم رکھتے اور ان کے مشوروں کو قبول کرتے اور بسا اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بازار کے معاملات کا نگران بھی مقرر کیا ہے۔ (۲)

نیز ہمارے فقہا نے لکھا ہے کہ عورت اوقاف کی نگران ہو سکتی ہے اور یتیموں کی وصی بھی اس کو بنایا جا سکتا ہے۔ (۳)

---

(۱) کنز العمال:۸/۳۰۸

(۲) تہذیب التہذیب:۱۲/ ۴۲۸

(۳) البحر الرائق:۷/ ۵،در مختار مع شامی:۵/۴۴۰

غرض یہ کہ عورت کو ایسے مناصب اور عہدے سپرد کیے جا سکتے ہیں جن کو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے انجام دے سکتی ہے اور وہ ان مناصب میں آزاد نہ ہو؛ بل کہ کسی کے زیر نگرانی اور مشورہ کرنے کی پابند ہو، یہی وجہ ہے کہ عورت کو قاضی بنانے کی اجازت نہیں۔ چوں کہ اس عہدے میں عورت حدود شرعیہ کی پوری رعایت نہیں کر سکتی، پھر وہ کوئی غلط فیصلہ کر دے، اس لیے قضات کا عہدہ عورت کے لیے جائز نہیں قرار دیا گیا۔

آج کل جو کونسلر (COUNSELER) یم، یل اے وغیرہ کی عہدے داریاں ہیں، ان میں بھی ظاہر ہے کہ عورت حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے ان خدمات کو انجام نہیں دے سکتی، پھر ان میں ایک قسم امارت کا بھی شائبہ ہے، لہذا عورت کو ان مناصب و عہدوں کے لیے ووٹ میں حصہ لینا بھی جائز نہیں اور نہ اس کو ووٹ دینا جائز ہے۔

عورت اور ووٹ، ایک واقعہ

یہاں ایک اس واقعہ کا ذکر کرنا بھی عبرت کا سبب ہوگا کہ ۱۹۹۶ء میں جب بنگلور میں سٹی کارپوریشن انتخابات ہونے جا رہے تھے، تو بعض حضرات نے احقر سے اس بارے میں فتویٰ پوچھا کہ عوت کا ووٹ میں حصہ لینا اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے اس کے حق میں ووٹ دینا کیسا ہے؟ احقر نے عدم جواز کا فتویٰ تحریر کر دیا، اس الیکشن میں بنگلور کے شواجی نگر حلقہ سے ممتاز بیگم نامی خاتون نے بھی حصہ لیا تھا جو ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۵ء کے دوران ڈپٹی میر بھی رہ چکی تھیں، میرا فتویٰ بعض حلقوں کی طرف سے اسی دوران کثیر تعداد میں عوام کے درمیان تقسیم کیا گیا، خیر الیکشن کے چند دنوں بعد ممتاز بیگم کی طرف سے ان کے وکیل محمود پٹیل نے میرے نام ایک لیگل نوٹس جاری

کیا جس میں کہا گیا تھا کہ میرے اس فتویٰ کی وجہ سے ممتاز بیگم کی عزت وحرمت پر داغ آیا اور یہ کہ اسی فتویٰ کی وجہ سے یہ معروف ومقبول عورت ہار گئی اور یہ انڈیا جیسے سیکولر ملک میں اس طرح کا فتویٰ جاری کرنا، دراصل یہاں کے قانون کو چیلنج کرنا اور اس میں دخل دینا ہے، جس کا کوئی جواز نہیں، پھر آخر میں اس بات کا مطالبہ (ڈمانڈ) کیا تھا کہ ممتاز بیگم کو اس انتخابات میں ناکامی کی وجہ سے جو نقصان اٹھانا پڑا ہے، اس کے تدارک میں ایک لاکھ روپے ادا کروں، ورنہ وہ اس مسئلے کو عدالت میں لے جائیں گے ان دنوں ''روزنامہ پاسبان'' نے بھی ایک مضمون میرے خلاف لکھا جس پر بعد میں اس کے ایڈیٹر عبیداللہ شریف کو معافی نامہ بھی شائع کرنا پڑا، احقر نے ممتاز بیگم کا جواب مدلل طور پر دیا، جس کے بعد اب تک کوئی جواب نہیں آیا۔

یہ سب جو ہوتا ہے دنیا داری کا نشہ اس کا باعث ہے۔ غور کریں کہ ملک کو سیکولر بتانے کے بعد شرعی فتویٰ کے خلاف آواز اٹھانا کیا عقل وانصاف کی موت نہیں؟ سیکولر آخر کس کو کہتے ہیں؟ اس کو جہاں شرع کا قانون نہ بیان کیا جا سکے؟ پھر جو عورت یا مرد شرعی قانون سے ٹکر لینے کی کوشش کرے اور اس کو نقصان دہ قرار دے، اس کے ایمان کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عورت اور سماجی خدمات

عورت کی خدمات کا ایک وسیع دائرہ سماجی خدمات کا میدان ہے، سماج اور معاشرہ کی فلاح وبہبودی کے لیے جدوجہد اور سعی وکوشش ہر فردِ معاشرہ کا فریضہ ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، لہٰذا سماجی خدمات کا میدان جس طرح مردوں کے لیے کشادہ ہے، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی اس میں پوری پوری گنجائش ہے۔

اگر عورت نے میڈیکل کر رکھا ہے تو اس کے لیے مریضوں کی خدمات کا بہترین

موقعہ ہے، خصوصاً عورتوں کے امراض اور مشکلات میں وہ اس کی پوری مدد ونصرت کرسکتی ہے۔ حضرات صحابیات کے بارے میں آتا ہے کہ وہ جہاد میں زخمی ہونے والوں کی مرہم پٹی کا کام کرتی تھیں، نیز زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں اور مقتولوں کو میدان سے اٹھا کر لایا کرتی تھیں۔

چناں چہ حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں جاتی تھیں، پس لوگوں کو پانی پلاتی اور ان کی خدمت کرتی اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور مقتولوں کو اٹھا لاتی تھیں۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا (والدہ انس) اور انصار کی چند عورتوں کو غزوہ میں لے جاتے تھے جو پانی پلایا کرتی تھی۔ (۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنگ احد کے دن جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر ہٹ گئے، تو میں نے دیکھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اپنے دامن کو اٹھائے ہوئے پانی کی مشکیں اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے لا رہی تھیں پھر پیاسے لوگوں کو پلاتی تھیں پھر لوٹ کر پانی لاتی تھیں اور پلاتی تھیں۔ (۳)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی غزوات میں شرکت کی ہے، زخمیوں کی مرہم پٹی وعلاج کرتی اور غازیوں

---

(۱) بخاری:۱/۴۰۳

(۲) ترمذی:۱/۹۸۶، مسلم:۲/۱۱۶

(۳) بخاری:۱/۴۰۳، مسلم:۲/۱۱۶

کے لیے کھانا بناتی، ان کے سامان کی حفاظت اور مریضوں کی نگرانی کرتی تھی۔(۱)

ان روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ غزوات میں حضرات صحابیات متعدد خدمات انجام دیتی تھیں، غازیوں کے لیے کھانا بنانا، زخمیوں کا علاج کرنا، پانی کا بندوبست کرنا، شہیدوں کے لاشوں کو اٹھالانا غازیوں کے سامان کی حفاظت کرنا وغیرہ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے قبل جب فسادیوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کرلیا تھا اور ان پر ضروریات زندگی مسدود کردی گئی تھی، تو حضرت صفیہ بن حیّ بن اخطب رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مدد کے لیے خچر پر سوار ہوکر تشریف لے گئیں؛ مگر راستہ میں اشتر نے ان کو دیکھ کر راستہ روک لیا اور وہ واپس آگئیں اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور کیا، وہ ان کے مکان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس کھانا پانی لے جاتے تھے۔(۲)

بہ ہر حال عورت حدود شریعہ کی رعایت کرتے ہوئے سماجی خدمت انجام دے تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

ڈاکٹر کا ذکر یہاں ہم نے یہاں محض تمثیلاً کیا ہے ورنہ سماجی خدمات کے لیے بہت سارے شعبے ہیں عورت کے حالات اور مزاج سے جو ہم آہنگ ہو اور حدود شریعت کی رعایت وحفاظت بھی اس میں پورے طور پر ہوتی ہو۔ ایسا شعبۂ خدمت وہ خود انتخاب کرسکتی ہے۔

عورت اور معاشی سرگرمی

رہا عورت کے لیے معاشی سرگرمی کا مسئلہ، تو اس سلسلے میں اولاً ایک بات بہ طور

---

(۱) دارمی: ۱۷۳/۲

(۲) اہل کتاب صحابہ وتابعین: ۱۳۹

اصول سمجھ لینا چاہیے وہ یہ:

اسلام نے عورت کو معاشی ذمے داری سے سبک دوش کر دیا ہے اور اس کے معاش کی پوری ذمے داری مرد پر ڈالی ہے۔ چناں چہ عورت کبھی بیٹی کی حیثیت سے باپ کا نفقہ پاتی ہے اور کبھی بیوی کی حیثیت سے شوہر سے نفقہ وصول کرتی ہے اور باپ نہ ہو تو بھائی وغیرہ اس کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ اسلام نے اس کے معاش کا مسئلہ اس پر عائد ہی نہیں کیا۔ اسی طرح اس کے بچوں کا نفقہ وخرچہ بھی اس پر نہیں؛ بل کہ اس کے شوہر پر رکھا گیا۔ جب یہ بات ہے تو عورت کو خواہ مخواہ اس میدان میں کودنے اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

اصل میں یہ سوال ان حلقوں اور طبقوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے جو مغرب زدہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں اور مغربی تہذیب اور مغربی معاشرہ کی آزادی اور فکری بے راہ روی اور جنسی انارکی وعریانی وبے حیائی کو ایک فیشن سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ بات افسوس ناک دکھائی دیتی ہے کہ اسلامی معاشرہ گھر میں بند رہے اور شوہر اور بچوں کی خدمت کرتی رہے اور بازاری دنیا سے نیاز رہے۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ مغربی معاشرہ کی طرح ہماری عورتیں بھی باہر نکلیں اور آزادانہ گھومیں پھریں اور مردوں کے دوش بہ دوش کام کریں۔

مگر یہ بات ان کے ذہنوں سے یکسر فراموش ہو جاتی ہے کہ مغرب نے عورت کو باہر نکال کر اس کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی ہے؛ بل کہ اس پر ایک بہت بڑا ظلم کیا ہے، اسلام نے اس کو گھر بٹھائے کھانے پینے اور اس کی تمام ضروریات کا انتظام اس طرح کر دیا کہ ان سب کی ذمے داری مرد پر ڈال دی؛ مگر مغربی مکار ذہنیت نے یہ سوچا کہ عورت کو کیوں گھر بیٹھے کھلایا پلایا جائے؟ نہیں، اس کو بھی باہر نکالو، اس کے

دوفوائد ہیں، ایک تو یہ کہ عورت کی جنسی خواہشات کی پورا کرنے میں پوری آزادی ملے گی اور ہوس ناک طبیعتوں کو شکار بہ آسانی فراہم ہو جائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ عورت خود کمائے اور کھائے گی، مرد کے ذمے سے یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ یہ تھی وہ شاطرانہ وعیارانہ ذہنیت جس نے ''معاش'' کے عنوان پر عورت کو باہر نکالا۔ بتاؤ کہ یہ کیا اس پر ظلم عظیم نہیں ہے؟

دوسری بنا اس سوال کی یہ ہے کہ آج کل مادیت کو پورا پورا تسلط حاصل ہو گیا ہے اور لوگوں کے قلوب واذہان، دنیوی اسباب وسامان، مادی آرائش وزیبائش، مختلف قسم کے زرق وبرق لباس وپوشاک، قسم قسم کے ماکولات ومشروبات اور فلک بوس عمارت کے عادی اور ان سے مرعوب ومتاثر ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہر کس وناکس ان کی طلب وجستجو اور ان کی فکر میں لگا ہوا ہے اور زیادہ سے زیادہ کمانے اور جمع کرنے اور ان مادی اسباب وسامان کو حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کی وجہ سے عورتیں بھی مردوں کے دوش بہ دوش کام کرنا، کمانا چاہتی ہیں اور مرد بھی عورتوں کے ذریعہ معاشی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس سوال کی بنیاد مادیت کا غلبہ اور عیش پسندی کا جذبہ اور آخرت سے غفلت ہے۔ اور اسلام میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت تو کیا؛ بل کہ ان کی مذمت وبرائی ہے۔ لہٰذا ان چیزوں کی بنیاد پر جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ بھی کوئی قابل التفات ولائق توجہ نہیں۔

البتہ یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو فطری اور عقلی بنیادوں پر قائم ہے اور اس کا جواب اسلامی تعلیمات واحکامات کی روشنی میں تلاش کرنا ضروری ہے، وہ سوال یہ کہ بعض اوقات عورتوں کو ایسی مجبوریاں اور پریشانیاں آگھیرتی ہیں کہ معاشی جدوجہد ان کے لیے لازم ہو جاتی ہے، مثلاً کوئی لاوارث عورت ہے اور کوئی بھی اس

کا پرسان حال نہیں، یا کوئی عورت ایسی ہے کہ اس کا شوہر اس کا اور اس کے بچہ کا نفقہ اور خرچہ چلانے تیار نہیں، یا شوہر معذور ہے جو کمانے کی قوت واستعداد نہیں رکھتا اور ایسی عورت جو اپنے اور اپنے بچوں کی گزارے کا اور معذور شوہر کے گزارے کا بندو بست نہ کرے تو یہ عقل وفطرت کے بالکل خلاف ہے اور شریعت بھی اس کی تائید نہیں کرسکتی۔لہذا کیا ایسی عورت معاشی جدو جہد اور کوشش کرسکتی ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حجاب کے تمام ضروری شرائط وقیود کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی مجبوری اور پریشانی کا حل نکالنے کے لیے عورت معاشی سرگرمی اختیار کرسکتی ہے؛ مگر یاد رہے کہ ایک یہ استثنائی صورت ہوگی نہ کہ حکم عام۔

اس کی دلیل مندرجہ ذیل روایات ہیں:

حضرت رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندی کی کمائی سے منع فرمایا؛ مگر وہ جو وہ اپنے ہاتھ سے کمائے (اس کی اجازت ہے) پھر آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ جیسے روٹی پکانا، سوت کاتنا، روئی دھننا وغیرہ۔ (۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری خالہ مطلقہ ہوئیں، انہوں نے چاہا کہ اپنے باغ سے کھجور توڑیں، اس پر ان کو ایک شخص نے زجر کیا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور سوال کیا تو آپ نے اجازت دی اور فرمایا کہ امید ہے کہ تم اس سے صدقہ کرو یا کوئی اور نیک کام کرو۔ (۲)

علما نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ طلاق یافتہ عورت عدت میں حاجت وضرورت کے پیش باہر نکل سکتی ہے۔اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ضرورت کے موقع

(۱) ابو داود: ۲/۴۸۶

(۲) مسلم: ۱/۴۸۴، دارمی: ۲/ ۱۳۸، نسائی: ۲/ ۱۱۹، ابو داود: ۱/۳۱۴

پر معاش کی تلاش میں وہ باہر جا سکتی ہے۔ یہاں یہی صورت حال تھی کہ باغ پک چکا تھا اور کھجور توڑنے تھے جوان لوگوں کے معاش کا ذریعہ تھا۔ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کے پیش نظر اجازت مرحمت فرمائی۔

بطورِ تکمیلِ فائدہ یہاں عرض کردوں کہ یہ حدیث طلاق یافتہ عورت کے بارے میں ہے (جیسا کہ معلوم ہوا)؛ مگر امام نسائی نے اس پر باب وعنوان باندھا ہے کہ ''باب الخروج المتوفی عنہابالنہار'' (باب اس عورت کے دن میں نکلنے کا جس کے شوہر کا انتقال ہوگیا)

حالاں کہ حدیث میں بیوہ عورت کا ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ امام نسائی اس حدیث سے بیوہ عورت کا حکم بھی مستنبط فرما رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ مطلقہ عورت کو تو اسلام میں عدت کا نفقہ وخرچہ بھی ملتا ہے؛ مگر شوہر کی وفات پر بیوہ کو عدت کا نفقہ نہیں ملتا جب نفقہ ملنے کے باوجود مطلقہ عورت بہ ضرورتِ معاش باہر نکل سکتی ہے تو بیوہ کا نکلنا بہ درجہ اولیٰ درست ہے۔ (۱)

(۳) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی وہ اپنا قصہ سناتی ہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے نکاح کیا تو ان کے پاس سوائے ایک اونٹ اور ایک گھوڑے کے نہ کوئی مال تھا اور نہ کوئی غلام تھا اور نہ کوئی چیز تھی، میں ہی گھوڑے کے لیے گھاس لاتی تھی اور میں ہی پانی بھی لایا کرتی تھی اور ڈول سینچتی تھی اور آٹا گوندھتی تھی؛ لیکن روٹی پکانا ٹھیک سے نہ آتا تھا تو میری انصاری پڑوسن عورتیں پکا دیا کرتی تھیں اور میں زبیر کی اس زمین سے جو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو دی تھی، اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں اٹھا کر لایا

---

(۱) حاشیہ سندھی: ۲/۱۱۹

کرتی تھی ۔(پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک خادم دے دیا تو انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا تھا)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے باغ کی خدمت کرتی تھیں اور یہ ان کے معاش کا ذریعہ تھا ؛ مگر چوں کہ ضرورت تھی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ نہ تھا اس لیے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو بھی باہر نکلنا پڑا۔

غرض ان استثنائی مثالوں سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بہ ضرورتِ معاش تگ ودو میں عورت لگ سکتی ہے ؛مگر مغربی تہذیب کی طرح عورت کا معاشی سرگرمی کو مستقل اختیار کر لینا اسلامی مذاق ومزاج سے کوئی ہم آہنگی نہیں رکھتا۔

مغربی تہذیب نے آزادیٔ نسواں اور مساواتِ مرد وزن کے خوش نما دعووں اور نعروں سے محض دھوکہ دیا ہے۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کو اس معاشرہ میں نہ مرد کے مساوی کوئی درجہ حاصل ہے اور نہ معاشی اعتبار سے کوئی خاطر خواہ اور معقول کام اور معاوضہ ہے اور اگر کہیں معاوضہ ہے بھی تو کام انتہائی گھٹیا لیا جارہا ہے۔آخر میں ایک دل چسپ خبر کا ذکر کرنا بھی موزوں ومناسب رہے گا۔وہ یہ ہے کہ نیویارک کے ایک مشہور تاجر مورنی زیریٹس نے اپریل ۱۹۶۶ میں ایک اشتہار دیا تھا کہ:

> ’’ایک ایسی ماڈل ٹائپ گرل کی ضرورت ہے جو مرغی کے انڈوں پر بیٹھ کر مرغی کی طرح سینے کا کام کرے ، ایسی نوجوان خاتون کو روزانہ سوڈالر اجرت دی جائے گی اور کام کے ختم پر ایک ہزار ڈالر بہ طور انعام ملے گا‘‘۔

معلوم ہے کہ اشتہار کے جواب میں ایسی جلیل القدر خدمت کے لیے سات سو

---

(۱) بخاری :۷۸۶/۲

سے زائد درخواستیں موصول ہوئیں۔(۱)

مولانا تقی امینی حفظہ اللہ نے مغرب کے اس حیاسوز معاشرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کو (عورت کو) بزمِ عیش کا کھلونا بنایا، اس کے شیشہ دل کو اپنی مشین کا پرزہ بنایا، اس کے آبگینہ عصمت کو فولاد کی مسان پر چڑھایا، اس کے معصوم حسن کو نمائش کے بازار میں فروخت کیا اور جب ان سب میں وہ بے زبان نکلی تو مرغیوں کی طرح اس کو انڈے سینے پر لگایا۔(۲)

عورت اور دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں

اسلام کی تبلیغ واشاعت کی طرف دعوت اہل اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور اس ذمے داری میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں، لہٰذا عورت کی خدمات کا ایک اہم دائرہ اور میدان دعوت وتبلیغ بھی ہے اور اس ذمے داری میں بھی ان کے شریک اور سہیم ہونے پر یہ آیت بڑی ہی واضح ہے۔

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِوَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (التوبۃ :۷۱)

(مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں

(۱) اسلام اور دور جدید کے مسائل، مولانا تقی امینی: ۲۷۲

(۲) ایضاً

اور زکاۃ دیتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی وہ لوگ
ہیں جن پر اللہ رحم کرتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے)

اس آیت میں مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں دونوں کی صفات واعمال کا ذکر ہے اور ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر سب سے مقدم ہے۔

معلوم ہوا کہ مؤمن مرد اور عورت کی یہ اولین ذمے داری ہے کہ اپنی اصلاح کے بعد سب سے پہلے دوسروں تک پیغام حق کو پہونچانے اور معروفات کی اشاعت کرنے اور منکرات کے ختم کرنے کی فکر کریں۔ البتہ مرد کی اس خدمت کا دائرہ اور ہوگا اور عورت کا دائرہ خدمت اور ہوگا۔ عورت کو زیادہ تر اپنے گھر کے افراد، بچوں، شوہر، بھائی، بہن کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ بچوں کی اصلاح سب سے مقدم ہے کہ وہ اس کے ماتحت ہیں اور اس پر ہم گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔

شوہر کو معروف کی راہ پر ڈالنا اور منکرات سے بچانا بھی عورت کی ذمے داری ہے اور یہ کام کرنے والی عورت اللہ و رسول کی نظر میں بہت ہی بڑے مقام و مرتبہ کی عورت ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ رحم کرے اس عورت پر جو رات کے ایک حصہ میں بیدار ہو اور نماز پڑھے، پھر اپنے خاوند کو بیدار کرے اور اگر نہ اٹھے، اس کے چہرے پر پانی چھڑک دے"۔(۱)

---

(۱) ابو داود: ۱/ ۱۱۵، نسائی: ۱/ ۲۳۹

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے سوال کیا گیا کہ آدمی کے لیے دنیا میں بہترین دولت کیا ہے، جس کو وہ اپنائے۔ آپ نے فرمایا:

« لِسَانٌ ذَاكِرٌ وَقَلْبٌ شَاكِرٌ وَزَوْجَةٌ مُّؤْمِنَةٌ تُعِينُهُ عَلٰى إِيْمَانِهٖ »

(سب سے بہترین دولت یہ ہے کہ ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور مؤمن بیوی، جو ایمان کے راستے میں تعاون کرے۔[1])

غرض عورت کو چاہیے کہ شوہر کو نیک راہ پر ڈالنے کی کوشش کرے۔ (یہ جب ہے کہ شوہر نیک نہ ہو، اگر وہ نیک ہے تو پھر اس کی نیک روی میں اس کا ساتھ دے رکاوٹ نہ پیدا کرے)

اس کے بعد اپنے احباب، رشتے دار، پڑوسی وغیرہ کی طرف بھی توجہ کرے اور خوش اسلوبی، محبت والفت اور تہذیب واخلاق کے ساتھ لوگوں میں معروفات کی اشاعت اور منکرات کی اصلاح کی فکر و کوشش کرتی رہے۔

دعا و اختتام

آخر میں گزارش ہے کہ دین وشریعت کے اس پیغام کو جو عورت کی اصلاح و تربیت کا نظام ہے، اپنانے اور اپنی عورتوں اور بچیوں میں پیدا کرنے کی فکر کریں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین اسلام سے سچی عقیدت ومحبت اور اس پر پکا ایمان وایقان اور اس پر عمل کی پوری صلاحیت وتوفیق عطا فرمائے، آمین۔

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

---

(۱) ترمذی: ۱/۱۴۰

شفاء القلوب

بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا
نہنگ واژ دھا وشیر نر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

تقریظ

حضرت استاذی محمد سلمان صاحب گنگوہی دامت برکاتہم

استاذ حدیث جامعہ اشرف العلوم گنگوہ وخلیفہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدالانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین. امابعد

زیرنظر رسالہ ''شفاء القلوب'' مؤلفہ مولانا شعیب اللہ صاحب زیدمجدھم مہتمم مدرسہ مسیح العلوم بیدواڑی بنگلور کا مسوّدہ مختلف مقامات سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رسالہ اصلاحِ قلب کی ضرورت واہمیت اوراس مسئلہ میں قرآن وحدیث اور بزرگانِ سلف کی تعلیمات وہدایات پر مشتمل ہے جواس دور پرفتن میں ازحد ضروری ہے، کیونکہ آج اصلاحِ قلب کے بارے میں عوام تو عوام علما بھی غافل ہیں۔ رسالہ کے تمام مضامین ماشاءاللہ مفید ومستند ہیں۔

احقر نے مؤلف کی دیگر متعدد تالیفات کا بھی مطالعہ کیا ہے جو ماشاءاللہ خواص وعوام کے لیے بہت ہی مفید ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دیگر تالیفات کی طرح اس کو بھی مقبول ومفید فرمائے۔

فقط

محمد سلمان عفی عنہ گنگوہی

۳/۲۵/۱۴۲۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اولین

حامداً و مصلیا. زیرِنظر کتابچہ ''شفاء القلوب'' اصلاحِ باطن وتزکیۂ نفس کی ضرورت واہمیت اوراس کے طریق کار کے متعلق قرآن وحدیث واقوالِ صحابہ وعلما پر مشتمل ایک مختصر تحریر ہے، ابتدا میں محض ایک آٹھ دس ورقی رسالہ کا خیال تھا جو خصوصا طلبائے مدارس کواصلاحِ باطن کی طرف متوجہ کرنے کے جذبہ کے تحت پیدا ہوا تھا؛ مگر جب لکھنا شروع کیاتواس مضمون کی عام ضرورت کابھی احساس ہوااور کچھ تفصیل ووضاحت کی ضرورت بھی محسوس ہوئی، کیونکہ سلوک وتصوف کے نام پر جاہل وملحد پیروں نے عوام کو گمراہ کرر کھاہے، اورشریعت وطریقت کودوالگ الگ خانوں میں بانٹ کرلوگوں کوشریعت سے آزادکرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔

لہٰذا یہ آٹھ دس ورقی، پچاس ساٹھ ورقی بن گیا، گویاسمجھنا چاہئے کہ آٹھ دس ورقی متن کی شرح پچاس ساٹھ صفحات میں پیش کی گئی ہے۔

دعاہے کہ اللہ تعالیٰ اس نا کارۂ علم وعمل کواورتمام مسلمانوں کو ہرقسم کی جسمانی وروحانی بیماریوں سے نجات عطافرمائے اوراس تحریر کوشرفِ قبولیت سے مشرف فرمائے اورنافع ومفید بنائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۱۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۷؍اگست ۲۰۰۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن وحدیث سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح بدنی امراض، انسان کو لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح قلبی امراض کا بھی وہ شکار ہوتا ہے اور اس پر ضروری ہے کہ ان امراض کے ازالہ کی فکر کرے اور اپنے قلب کو صحت مند بنائے؛ مگر آج عجیب حالت ہے کہ ہم کو بدنی امراض کے لاحق ہونے پر اس کے علاج وازالہ کی جتنی فکر ہوتی ہے، اس کی عشر عشیر بھی روحانی قلبی بیماریوں کے علاج معالجہ اور اس کے ازالہ واصلاح کے لیے نہیں ہوتی؛ بل کہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی طرف کوئی توجہ والتفات ہی نہیں ہوتا؛ بل کہ ہم ہزاروں امراض روحانیہ وقلبیہ کا شکار ہونے کے باوجود، اپنے آپ کو بیمار ہی نہیں سمجھتے؛ بل کہ بہتوں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ روحانی بیماریاں کیا ہیں؟ جن کی اصلاح اور علاج کی ضرورت ہے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہی ہے اور ہونا چاہئے کہ روحانی بیماریوں کی معاشرے میں بہتات ہو اور معاشرہ ان بیماروں سے متعفن وفاسد ہو جائے، نیز یہ بیماریاں متعدی ہو کر ان کے شکار ہونے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے، پھر صحت مند بھی ان کی لپیٹ میں آتے رہیں۔ چنانچہ یہی سب کچھ ہو رہا ہے، اور ان بیماریوں کے اثرات مساجد، مدارس، خانقاہوں، علماء، حفاظ، مشائخ اور دینداروں سب تک پہنچ رہے ہیں۔ یہ صورت حال کس قدر لرزہ خیز اور تباہ کن ہے، اس کا اندازہ بھی وہی کر سکیں گے، جو ان قلبی امراض کی ہلاکت خیزیوں سے واقف ہوں، ورنہ ان امراض کی وجہ سے جن کے قلوب واذہان ماؤف وبے حس ہو چکے ہوں، وہ اس کا اندازہ بھی نہ کر سکیں گے۔

الغرض امراضِ قلوب کا معلوم کرنا اور پھر ان کے ازالہ وعلاج کی تدبیر کا جاننا اور اس پر عمل کر کے اپنے قلوب کو پاک وصاف، مجلی ومصفّٰی بنانا ضروری ہے۔
اس مختصر تحریر میں اسی سے متعلق چند گذارشات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔
واللّٰہ الموفق والهادی الی سواء السبيل.

قلبی امراض کا ثبوت

قرآن وحدیث سے پتہ چلتا ہے کہ امراض جس طرح بدنی ہوتے ہیں، اسی طرح قلبی بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ﴾ (البقرۃ : ۱۰۱)
(ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے۔)

اس آیت میں منافقین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے دلوں میں مرض ہے، اس مرض سے مراد شک ونفاق یا انکار وتکذیب ہے۔ (۱)
اسی طرح متعدد آیات میں منافقین کے بارے میں یہ بات بتائی گئی ہے۔
ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ﴾
(الاحزاب : ۲۲/۶۰)
(اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے باز نہ آئیں۔)

اس جگہ منافقین کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے دل بیماری میں مبتلا ہیں، معلوم ہوا کہ یہاں ان لوگوں سے مراد منافقین کے علاوہ دوسرے لوگ ہیں۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جن کے اندر ایمان قوی ومضبوط

---
(۱) قرطبي : ۱/۱۹۷

نہیں ہوا تھا، بلکہ ضعفِ ایمان کا وہ شکار تھے۔ (۱)

اور عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد زنا کار لوگ ہیں۔ (۲)

معلوم ہوا کہ ضعفِ ایمان اور شہوت پرستی کا جذبہ قلبی مرض ہے، جس کو یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

اور ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهِ مَرَضٌ﴾

(الاحزاب: ۲۳/۲۲)

(عورتیں (غیر مردوں سے) بات چیت میں نرمی اختیار نہ کریں کہ کہیں وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے طمع ولالچ نہ کرے۔)

اس آیت میں مرض سے مراد فسق وفجور کی طرف میلان اور شہوت رانی کی ہوس ہے۔ (۳)

نیز حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« اَلاَ إِنَّ فِيْ الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، اَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ. » (۴)

(خبردار کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد وخراب ہوجاتا ہے تو سارا جسم فاسد وخراب ہوجاتا ہے اور خبردار کہ وہ دل ہے۔)

---

(۱) روح المعاني: ۹۰/۲۲
(۲) ابن كثير: ۵۳۵/۳
(۳) قرطبي: ۱۷۷/۱۴
(۴) بخاري: ۱۳/۱، مسلم: ۲۸/۲

اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جسم کی طرح قلب بھی صلاح وفساد، صحت و بیماری سے متصف ہوتا ہے، نیز حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ، اَلْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ. لَا أَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ. » (۱)

(تم میں پہلے گذری ہوئی امتوں کی بیماری سرایت کرگئی ہے، یعنی حسد وبغض، وہ مونڈنے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ بال مونڈتی ہے، بلکہ دین کومونڈتی ہے۔)

اس حدیث میں حسد وبغض کو بیماری فرمایا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ بیماری اگر ہے تو دل کی بیماری ہے نہ کہ جسم کی بیماری۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

« اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدأُ كَمَا يَصْدأُ الْحَدِيْدُ إذا أَصَابَهُ الماءُ قِيْلَ يَارَسُولَ اللهِ! وَمَاجِلائُهَا قَالَ كَثرةُ ذِكْرِالمَوْتِ وَتِلاوَةِ الْقُرْآنِ. » (۲)

(یہ دل اس طرح زنگ آلود ہوجاتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہوجاتا ہے جب کہ اس کو پانی پہنچے، عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! اس کی صفائی کیا ہے؟ فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن شریف کی تلاوت کرنا۔)

یہ حدیث بتارہی ہے کہ دل پر زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے

---

(۱) مشکوٰۃ: ۴۲۸

(۲) مشکوۃ شریف :۱۸۹

معلوم ہوا کہ دل کو بھی روگ و بیماری لگتی ہے۔ اس حدیث میں دل کے زنگ سے کیا مراد ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقات میں لکھتے ہیں۔

"أي يعرض لها دنس بتراكم الغفلات وتزاحم الشهوات".

(یعنی دل پر غفلتوں کے ڈھیر لگنے اور شہوتوں کی بھیڑ لگنے سے میل آجاتا ہے۔)[1]

غرض یہ کہ قرآن سے بھی اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا دل مختلف امراض کا شکار ہوتا ہے۔

امراضِ قلوب کی فہرست

یہاں مختصر طور پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ امراض قلوب کیا ہیں؟ امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں ایک فہرست احوال مذمومہ کی پیش کی ہے، وہ سارے احوال مذمومہ ہی دراصل امراض قلوب ہیں۔ یہاں ان کی تلخیص پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) کینہ (۲) حسد (۳) اپنے لیے علو مرتبہ کی طلب (۴) اپنی تعریف کی خواہش (۵) دنیا میں لذت اندوزی کے لیے زیادہ رہنے کی خواہش (۶) تکبر و بڑائی (۷) ریاکاری (۸) لالچ و حرص (۹) بخل و کنجوسی (۱۰) دنیا کی رغبت و چاہت (۱۱) لوگوں سے نفرت وعداوت (۱۲) اترانا (۱۳) مالداروں کی عظمت کرنا (۱۴) فقیروں کی توہین کرنا (۱۵) فخر وغرور کرنا (۱۶) دنیوی چیزوں میں ایک دوسرے پر سبقت (۱۷) حق سے اکڑنا (۱۸) لایعنی باتوں میں دلچسپی (۱۹) بہت بولنے کی خواہش (۲۰) ڈینگ مارنا (۲۱) مخلوق کے لیے بناؤ سنگار (۲۲) دین کے بارے میں

---

(۱) مرقات شرح مشکاۃ: ۴/۳۷۲

مداہنت (۲۳) خود پسندی (۲۴) اپنے عیوب کو چھوڑ کر دوسروں کے عیوب تلاش کرنا (۲۵) دل سے آخرت کا غم زائل ہو جانا (۲۶) دل سے خوف وخشیت کا نکل جانا (۲۷) لوگوں کی طرف سے کوئی ذلت کی بات پیش آئے تو سختی سے بدلہ لینا (۲۸) حق کے لیے بدلہ لینے میں کمزوری دکھانا (۲۹) چھپی دشمنی کے باوجود دوستی ظاہر کرنا (۳۰) نعمتوں کے سلب ہو جانے کا اندیشہ نہ کرنا اور بے خوف ہو جانا (۳۱) خدائی فیصلہ سے ناراضگی (۳۲) اپنی نیکیوں اور عبادتوں پر بھروسہ کرنا (۳۳) مکروفریب سے کام لینا (۳۴) خیانت کرنا (۳۵) لمبی لمبی آرزوئیں باندھنا (۳۶) دل کی سختی (۳۷) بے ہودہ گوئی (۳۸) دنیا پر شاداں وفرحاں اور دنیا کے فوت ہو جانے پر غمگین ہونا (۳۹) مخلوق سے انس اور ان کی جدائی سے وحشت محسوس کرنا (۴۰) ظلم وزیادتی (۴۱) عجلت پسندی (۴۲) شرم وحیا کی کمی (۴۳) لوگوں پر رحم وکرم کا فقدان۔

امام غزالی رحمۃ اللہ ان احوال وامراض کا ذکر کرکے فرماتے ہیں کہ یہ اور اس جیسی کیفیتیں اور حالتیں، بے حیائیوں کے اگنے کی جگہیں اور ناجائز اعمال وحرکات کے جنم لینے کے مقامات ہوتے ہیں۔ (۱)

بعض حضراتِ صوفیا نے ان تمام امراض کو دس اصول میں جمع کر دیا ہے۔ چناں چہ امام غزالی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ''الاربعین'' میں اور ''کیمیائے سعادت'' وغیرہ میں ایسا ہی کیا ہے۔ میرے مرشد اول حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''شریعت وتصوف'' میں دس چیزوں کا ذکر کیا ہے اور وہ سب اس شعر میں درج ہیں۔

(۱) احیاء العلوم: ۱/۲۰-۲۱

خواہی کہ شود دل تو چوں آئینہ ده چیز بروں کن ازدروں سینہ
حرص وامل وغضب دروغ وغیبت حسد وبخل وریا وکبر وکینہ

(ترجمہ: اگرتو چاہتاہے کہ تیرادل مثل آئینہ کے صاف وشفاف ہو جائے،تو دس چیزوں کواپنے دل سے نکال دےاوروہ دس چیزیں یہ ہیں۔
حرص، وطول امل (لمبی آرزو) غصہ، جھوٹ، غیبت، حسد، کنجوسی، ریاکاری،تکبراورکینہ۔)

اورامام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ اربعین میں جن دس امراض کواصل اورجڑقراردیاہےوہ یہ ہیں: (۱) کھانے کی حرص وکثرت (۲) بولنے کی حرص وکثرت (۳) غصہ (۴) بخل وکنجوسی (۵) حسدوکینہ (۶) دولت کی محبت (۷) فخروشہرت وجاہ طلبی (۸) تکبروبڑائی (۹) خودپسندی (۱۰) ریاکاری۔

غرض یہ کہ یہ چند بہت ہی قابلِ توجہ امراض قلبی ہیں۔جن سے اوربہت سی روحانی بیماریاں؛ بل کہ ظاہری بیماریاں بھی پیداہوتی ہیں۔

باطنی امراض،ظاہری گناہوں کاسبب

چناں چہ مثال کے طورپرحرص وکثرت کلام کولیجئے،اس ایک روحانی بیماری سے جھوٹ،فضول گوئی، غیبت، بہتان طرازی، مذاق واستہزاوغیرہ امراض جنم لیتے ہیں،اسی طرح بخل وکنجوسی کی بناپرآدمی زکوۃ وصدقات میں کوتاہی کامرتکب ہوتاہے حبِّ مال وحبِّ دنیاسےحرام وحلال کی پرواہ کیےبغیرمال ودولت کےجمع کرنے میں لگ جاتاہے،حسدوکینہ ظلم وزیادتی کاسبب بن جاتے ہیں،اسی طرح غصہ بھی ظلم وزیادتی کاباعث بن جاتاہےاورطول امل (لمبی آرزو) سےکئی بیماریاں جنم لیتی ہیں،

مثلاً طاعت وعبادت میں سستی، گناہوں سے توبہ میں غفلت، مال کی حرص، دل کی قساوت، آخرت سے غفلت وغیرہ ان تمام کی تفصیل کے لیے امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ کی کتاب "منهاج العابدين" بے نظیر کتاب ہے اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

غرض یہ کہ ایک روحانی بیماری کئی اور روحانی وظاہری بیماریوں کا سبب وباعث بن جاتی ہے۔

مرض کی حقیقت

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مرض کی حقیقت کیا ہے:

علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ نے اس مقام پر جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ بدن کا مرض یہ ہے کہ بدن کی صحت وصلاح کے خلاف ہو اور وہ بدن میں ایک قسم کا فساد ہے، جس سے بدن کی قوت ادراک وحرکت طبعی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے، کبھی ادراک ہی ختم ہو جاتی ہے، جیسے اندھا یا بہرا ہو جانا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس مرض کی وجہ سے اشیاء کو کچھ کا کچھ ادراک کرتا ہے، جیسے میٹھی چیز کو کڑوا محسوس کرتا ہے یا ایسی چیزوں کا تخیل کرتا ہے جن کی خارج ونفس الامر میں کوئی حقیقت نہیں (جیسا کہ بیمار کو ہوتا ہے۔)

اور رہا حرکتِ طبعی کا فساد تو وہ جیسے قوت ہاضمہ کا کمزور ہونا یا جیسے ان غذاؤں سے نفرت کرنا جن کی ضرورت ہے اور نقصان دہ چیزوں کو پسند کرنا (جیسے عموماً بخار کے وقت ہوتا ہے کہ کھانے کی چیز سے نفرت ہو جاتی ہے اور نقصان دہ چیزوں سے الفت ومحبت ہو جاتی ہے۔)

علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ کہتے ہیں:

"دل کا مرض بھی ایک قسم کا فساد ہے جس سے دل کی قوت ادراک

وقوت ارادہ فاسد ہوجاتی ہے، دل کے تصور وادراک کا فساد شبہات وشکوک کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے حتی کہ آدمی کو حق نظر نہیں آتا یا حق کو اس طرح دیکھتا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہے (یعنی حق باطل نظر آتا ہے اور باطل حق نظر آتا ہے جیسے بعض وقت بیمار میٹھے کو کڑوا اور کڑوے کو میٹھا محسوس کرتا ہے) اور ارادہ کا فساد اس طرح ہوتا ہے کہ نفع بخش حق بات سے بغض ہوتا ہے اور نقصاندہ باطل سے پیار ہوجاتا ہے۔''(۱)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دل جب بیمار ہوتا ہے تو اس میں دو قسم کا فساد پیدا ہوتا ہے، ایک فساد دل کی قوت ادراک واحساس میں پیدا ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی حِس وادراک یا تو ختم ہوجاتا ہے، پھر وہ حق کو دیکھ ہی نہیں سکتا، جیسے اندھا کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿فَاِنَّهَا لاَ تَعْمَى الأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِيْ الصُّدُوْرِ﴾ (الحجر: ۴۶)

کیوں کہ بے شک (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہیں، ہاں (ان کے) دل اندھے ہوگئے ہیں جو سینوں میں ہیں۔)

ایک جگہ اور فرمایا گیا:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْراً مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَاوَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُوْلٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ (الأعراف: ۱۷۹)

---

(۱) فتاوی ابن تیمیه: ۱۰:۹۲-۹۳

(اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں، جن کے دل ایسے ہیں، جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں، جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے، یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں؛ بل کہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں، یہ لوگ غافل ہیں۔)(۱)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ دل کا ایک فساد یہ ہے کہ اس کے اندر سے حق کو دیکھنے کی اور قبول کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور دل اندھا ہو جاتا ہے، یا حس و ادراک ختم تو نہیں ہوتا، البتہ اس میں ایسا فساد آ جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی حقیقت کے خلاف محسوس کرتا ہے، حق اس کو باطل نظر آتا ہے اور باطل حق نظر آتا ہے، نافع کو ضار سمجھتا ہے اور ضار کو نافع خیال کرتا ہے، اسی بیماری سے آقائے نامدار حضرت سید الاولین والآخرین صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پناہ مانگی ہے اور دعا فرمائی ہے:

" اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقاً وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ."

(اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھایئے اور اس کی اتباع کی توفیق مرحمت فرمایئے اور باطل کو باطل ہی دکھایئے اور اس سے بچنے کی توفیق دیجیے۔)

اور دوسرا فساد، دل کی قوتِ ارادہ میں پیدا ہو جاتا ہے جس سے قوتِ ارادہ ضعیف و کمزور ہو کر طاعت و عبادت، نیکی و بھلائی کی طرف نہیں چلتا اور اس کے برعکس اس بات کو پسند کرتا ہے کہ شہوات ولذات فانیہ اور برائیوں اور خبائث کی

(۱) ترجمہ از بیان القرآن

طرف چلے، جیسے بیمار آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ نقصان دہ چیزوں کی طرف راغب ہوتا ہے۔

فسادِ قلبی سے شیطانیت، حیوانیت و درندگی پیدا ہوتی ہے

یہیں سے ایک اہم بات یہ سمجھنا چاہئے کہ اس فسادِ قلبی کی وجہ سے انسان میں شیطانیت، حیوانیت و درندگی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ فسادِ قلبی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے دراصل ایک بے اعتدالی کا نام ہے۔ جیسے جسمانی فساد بھی دراصل بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتا ہے جب کہ اخلاطِ اربعہ (خون، بلغم، صفرا، سودا) میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے تو اس سے بیماریاں جنم لیتی ہیں۔

اسی طرح یہ فسادِ قلبی بھی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے جو انسان کی قوتِ عقلیہ اور قوتِ غضبیہ اور قوتِ شہویہ میں بے اعتدالی پیدا کرتی ہے اور ساری برائیاں یہیں سے جنم لیتی ہیں، جب قوتِ عقلیہ میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے اور وہ حد سے باہر ہوتی ہے تو انسان میں دھوکہ بازی، چالاکی و تلبیسی پیدا ہوتی ہے اور یہ شیطانی کام ہے، کیوں کہ شیطان کا کام یہی ہے کہ دھوکہ اور فریب دہی اور تلبیس و ملمع سازی کرتا رہے اور انسان بھی عقل کے حد سے باہر ہونے سے زیادہ چالاکی اور چالبازی کے کام کرتا اور شیطانی افعال و حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسی طرح جب قوتِ غضبیہ حدِ اعتدال سے نکلتی ہے تو انسان یا تو بزدلی اور جبن کا شکار ہو جاتا ہے، اگر قوتِ غضبیہ کم ہوگئی۔ یا انسان درندہ اور خون خوار جانور بن جاتا ہے، اگر قوتِ غضبیہ حد سے بڑھ گئی۔ چناں چہ جن کی قوتِ غضبیہ بڑھ جاتی ہے وہ موقعہ بے موقعہ غصہ سے مغلوب ہو جاتے اور قتل و غارت گری، ظلم و زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ یہی درندگی ہے۔

اور اگر قوتِ شہویہ حد سے نکلی تو انسان جانوروں کی طرح صرف کھانے پینے اور

شہوات ولذات کے پورا کرنے میں لگا رہے گا، جیسے جانوروں کی حالت ہوتی ہے، اس طرح انسان میں شیطانیت، حیوانیت اور درندگی کی خصلتیں اور خوبو پیدا ہو کر بے شمار بیماریوں اور خبائث کا وہ مجموعہ بن جاتا ہے۔

شیطانیت سے پیدا ہونے والی برائیاں

مثلاً شیطانیت جس میں ہوگی تو اس سے اس میں مکاری، عیاری، چالبازی، دھوکہ دہی، حیلہ بازی، آپس میں لڑادینا، عداوت وبغض ڈالنا، کینہ اور حقد پیدا کرنا، چغل خوری کرنا، خیانت کرنا وغیرہ امراض و بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کا حرام وناجائز ہونا کس پر مخفی ہوگا؟

حیوانیت سے پیدا ہونے والی برائیاں

اور حیوانیت جو نام ہے قوت شہوانیہ کی بے اعتدالی کا، اس سے بھی بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں، جیسے اسراف وتبذیر، حرص ولالچ، بے حیائی و بے شرمی، خباثت و پردہ دری، عبث وفضول کاری، چاپلوسی وتملق، حسد وحقد وغیرہ۔

درندگی کے کارنامے

اور درندگی سے جو برائیاں جنم لیتی ہیں اور کارنامے انجام پاتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں۔ تکبر و بڑائی، نڈرپن و بے خوفی، عجب وخود پسندی، دوسروں کا استہزا واستخفاف، ظلم وزیادتی، ڈینگ مارنا، گالم گلوچ کرنا، لوگوں کی بے عزتی کرنا وغیرہ۔

اصلاحِ قلب اور اس کی برکت

یہ تو ہوا دل کا فساد اور خرابی، جو بہت ساری خرابیوں اور بیماریوں کا سبب

وباعث بنتی ہے، لیکن اگر اس دل کی اصلاح وعلاج ہوجائے اور اس میں اعتدال پیدا کر کے اس کو شیطانیت وحیوانیت ودرندگی سے بچالیا جائے تو وہ ملکوتی صفات سے متصف ہوکر ایک لطیفۂ ربانی بن جاتا ہے۔

جب قلبِ ربّانی وملکوتی صفات سے متصف ہوجاتا ہے تو اس کے اندر علم وحکمت، یقین وایمان، عفت وعصمت، زہدوقناعت، ورع وتقویٰ، شرم وحیا، شرافت ونجابت، صبر وحلم، شجاعت وبہادری، رحم وکرم، شفقت ورحمت، عفوودرگذر، جودوسخاوت، تواضع وانکساری وغیرہ وغیرہ اوصاف وکمالات پیدا ہوجاتے ہیں، اور یہ اوصاف قلب کی حیات وصحت کی علامت ہیں، جس طرح اوپر کی خرابیاں دل کے مریض ہونے کی علامت ہیں۔

ایک حدیث کی تشریح

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ دل کا صلاح وفساد، اعضا وجوارح کے صلاح وفساد کا سبب بنتا ہے؛ اس لیے دل کی اصلاح بہت ہی مہتم بالشان کام اور نہایت ضروری واہم ہے، چناں چہ حدیث بھی اسی سلسلہ میں وارد ہوئی ہے:

« اَلاَ اِنَّ فِيْ الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، اَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ. » (۱)

(خبردار کہ بلاشبہ جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ سنور جاتا ہے تو پورا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور ہاں وہ دل ہے۔)

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مضغہ، گوشت کے

(۱) بخاري: ۱/۱۳، مسلم: ۲/۲۸

ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ گوشت کے ٹکڑے کو مضغہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے منہ میں چبایا جا سکتا ہے (اور مضغ کے معنی چبانے کے ہیں) علما فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مقصود دل کا بنسبت باقی جسم کے چھوٹا ہونا بیان کرنا ہے، حالاں کہ جسم کا صلاح وفساد، دل کے تابع ہے۔ اس حدیث میں دل کی اصلاح کے سلسلہ میں سعی وکوشش کی تاکید ہے۔ (۱)

مشہور محدث علامہ عبدالرؤف المنادي رَحِمَهُ اللهُ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ ہدایت سے درست ہوتا ہے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے، یعنی اعضا طاعت ونیکی میں استعمال ہوتے ہیں اور جب وہ لوتھڑا خراب ہو جاتا ہے، یعنی ضلالت وگمراہی سے خراب ہو جاتا ہے تو پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ منکرات میں اعضا کو استعمال کرتا ہے اور وہ لوتھڑا دل ہے کیوں کہ وہ بدنی حرکات اور نفسانی ارادوں کا مبدأ ہے۔ اگر دل سے نیک ارادہ صادر ہوتا ہے تو بدن بھی صالح حرکت سے متحرک ہوتا ہے اور اگر دل سے فاسد ارادہ صادر ہوتا ہے تو بدن بھی فاسد حرکت سے متحرک ہوتا ہے، پس دل بادشاہ ہے اور اعضا اس کی رعیت، اس لیے بادشاہ کے صلاح سے یہ اعضا بھی صالح ہوتے ہیں۔ اور اس کے فساد سے فاسد ہوتے ہیں۔ (۲)

ملا علی قاری رَحِمَهُ اللهُ شرح مشکوٰۃ شریف میں اس حدیث کی شرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

---

(۱) شرح مسلم: ۲/ ۲۸

(۲) فیض القدیر للمناوي: ۳/ ۴۲۴

”فعلى المكلف أن يقبل عليها ويمنعها عن الانهماک في الشهوات حتى لايبادر إلى الشبهات ولايستعمل جوارحه باقتراف المحرمات.“

(مکلّف انسان پر ضروری ہے کہ وہ دل پر توجہ کرے اوراس کو شہوات میں انہماک سے روکے تاکہ وہ شبہات کی طرف نہ بڑھے اور اپنے اعضا کومحرمات کے کے ارتکاب میں استعمال نہ کرے۔)(۱)

ان تمام علما وائمہ کی عبارات سے معلوم ہوا کہ جسم اوراعضا جسم کے سدھار و بگاڑ میں اصل اور بنیادی کردار قلب کا ہوتا ہے، وہ اگر صلاح سے آراستہ ہو، ایمانی ایقانی وعرفانی انوار سے معمور ومنور ہو تو سارے اعضاء وجوارح ، طاعت وعبادت نیکی وبھلائی اورتقویٰ وطہارت سے معمور ہوں گےاوراگر وہ فساد سےملوث ہوکر ضلالت وجہالت کی اندھیریوں میں بھٹک جائے تو اعضا وجوارح بھی برائی وگمراہی کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

قلبی امراض، جسمانی امراض سے زیادہ خطرناک

اس لیےقلبی امراض وبیماریاں ، جسمانی امراض وبیماریوں سے زیادہ شدید وخطرناک ہوتے ہیں۔اسی لیےعلامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہ نےفرمایا:

”فله موت ومرض وحياة وشفاء، وحياته وموته ومرضه وشفائه اعظم من حياة البدن وموته ومرضه وشفائِه.“ (۲)

---

(۱) مرقات شرح مشکوۃ: ۶/ ۳۷

(۲) فتاویٰ ابن تیمیه: ۱۰/۹۴

(قلب کی بھی موت وحیات، مرض وشفا ہوتی ہے اور دل کی حیات وموت اور مرض وشفاء بدن کی حیات وموت اور مرض وشفاء سے عظیم الشان ہے۔)

مطلب یہ کہ دل کی حیات وشفا، بدن کی حیات وشفا سے اعلیٰ وافضل ہے اور دل کی موت ومرض، بدن کی موت وبیماری سے زیادہ خطرناک ہے؛ اس لیے اس کی زیادہ فکر کرنا چاہیے۔ مگر ہم لوگوں کی یہ حالت یہ ہے کہ جسمانی بیماری ہو جائے تو ہم بہت پریشان ہوتے اور معالجوں کے پاس دوڑتے اور روپیہ پیسہ خرچ کر کے اس کا علاج کرواتے ہیں، لیکن جب دل بیمار ہوتا ہے اور وہ خدا کی نافرمانی ومعصیت کا مرتکب ہوتا ہے، طاعت وعبادت سے بھاگتا ہے، شر وفساد کی طرف لپکتا ہے خیر وبھلائی کی باتوں سے دور ہوتا ہے، قساوت وشقاوت کے کام کرتا ہے اور رحمت وشفقت، ہمدردی وغمخواری کے جذبات سے خالی وعاری ہو جاتا ہے تو ہم کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی، کوئی پریشانی کا احساس نہیں ہوتا، اور ہم صحت مندوں کی طرح پورے طور پر مطمئن ہوتے ہیں، گویا کہ ہم کو کچھ ہوا ہی نہیں، یہ بڑی خطرناک بات ہے؛ کیوں کہ بیمار اپنے آپ کو صحت مند سمجھ کر مطمئن رہے تو بیماری میں اور اضافہ ہوگا اور خطرہ لاحق ہوگا۔

اصلاح قلب کی اہمیت

پھر اصلاح قلب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ قلب وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مہبط اور انوار کا مسکن قرار دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِنَّ لِلّٰهِ آنِيَةً مِنْ أَهْلِ الْاَرْضِ، وَآنِيَةُ رَبِّكُمْ قُلُوْبُ

عِبَادِهِ الصَّالِحِيْنَ وَاَحَبُّهَا إِلَيْهِ أَلْيَنُهَا وَأَرَقُّهَا. »[1]

(بلاشبہ اللہ کے لیے اہل زمین کے برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن، اس کے نیک بندوں کے قلوب ہیں۔ اور اس کے نزدیک پسندیدہ قلوب وہ ہیں جو نرمی ورقّت والے ہیں۔)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قلب وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلیات وانوار کا ظرف بنتا ہے اور یادرہے کہ اس قسم کی احادیث سے نعوذ باللہ یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ دل میں سما جاتا ہے۔ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف اور باطل ہے۔

مثلاً ایک حدیث ان الفاظ سے آئی ہے:

« مَا وَسِعَنِيْ سَمَائِيْ وَلاَ اَرْضِيْ وَلٰكِنْ وَسِعَنِيْ قَلْبُ عَبْدِيْ الْمُوْمِنِ. »

(میں نہ میرے آسمان میں سما سکتا ہوں نہ میری زمین میں سما سکتا ہوں؛ لیکن میں میرے مومن بندہ کے دل میں سما سکتا ہوں۔)

محدثین کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور اگر یہ کسی کا قول ہے، تو علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ بندۂ مومن کے دل میں میری

---

(۱) علامہ سخاوی وعلامہ عراقی رحمہما اللہ نے طبرانی کے حوالہ سے اس حدیث کی تشریح کرکے فرمایا ہے کہ اس کی سند میں بقیۃ بن الولید ہے اور وہ مدلس ہے؛ لیکن اس حدیث میں انھوں نے تحدیث کی صراحت کی ہے۔ (المقاصد الحسنة: ۴۳۹، تخريج الاحياء للعراقي: ۱۵/۳) یہ معلوم ہے کہ مدلّس اگر تحدیث کی صراحت کردے تو اس کی حدیث قابل قبول ہوتی ہے اور ان حضرات کا اس حدیث پر کوئی اور اشکال نہ کرنا اس کے قابل احتجاج ہونے کی دلیل ہے۔

محبت ومعرفت سماجاتی ہے۔[1]

غرض یہ کہ اس قسم کی احادیث یا اقوال سے یہ مقصود ہے کہ دل اللہ کی تجلیات وانواراور معرفت ومحبت کا گھر ہے۔

بہ ہر حال اس سے دل کا مقام ومرتبہ واضح ہوگیا، جب یہ واضح ہوگیا تو یہ بات خود بہ خود معلوم ہوگئی کہ قلب کی اصلاح وتزکیہ انتہائی ضروری ہے تاکہ وہ معرفت ومحبتِ الٰہیہ کا مسکن بن سکے اوراس میں کوئی گندگی وپلیدی ، روگ وبیماری نہ ہو، ظاہر ہے کہ وہی قلب خدائی محبت والٰہی معرفت کا گھر بن سکتا ہے جوگندگی وآلائش سے پاک ہواوردل کی گندگی وہی روحانی قلبی بیماری ہے جس کا اوپر سے ذکر چلا آرہا ہے، اس لیے قلب کا تزکیہ واصلاح ضروری؛ بل کہ اشد ضروری ہے۔

اصلاحِ قلب کا طریق

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قلب کو ان بیماریوں اور برائیوں، گندگیوں اور پلیدیوں سے پاک وصاف کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ قرآن پاک اور حدیث شریف میں دل کی پاکی وصفائی کا طریقہ مذکور ہے، اس کے مطابق قلب کی اصلاح کرنا چاہئے،اسی لیے قرآن کریم نے اپنے بارے میں فرمایا کہ وہ ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ ہے۔

چناں چہ ارشادربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ تْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (يُوْنُس : ۵۷)

(۱) فتاوی ابن تیمیہ: ۱۲۲/۱۸

(اے لوگو! تحقیق کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا اور مومنین کے لیے ہدایت ورحمت آچکی ہے۔)

اس میں ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ جو آیا اس کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد شرک، نفاق وشک، جہل و لاعلمی ہے کہ قرآن ان سب امراضِ قلبیہ کے لیے شفا ہے۔

علامہ آلوسی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ قرآن شفا دیتا ہے، ان بیماریوں سے جو ہلاکت تک پہنچانے والے ہیں، جیسے جہالت، شک، شرک، نفاق وغیرہ۔(۱)

اسی طرح علامہ اسماعیل حقی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے روح البیان میں لکھا ہے کہ قرآن امراضِ قلوب جیسے جہل، شک، شرک، نفاق وغیرہ عقائدِ فاسدہ سے شفا دیتا ہے۔(۲)

غرض یہ کہ قرآن پاک، قلبی امراض کے لیے شفا ودوا ہے، اسی طرح حدیث پاک بھی دواوشفا ہے، اس طور پر کہ ان میں بیان فرمودہ احکامات وتعلیمات، ہدایات وتلقینات پر عمل کرنے سے یہ امراض دفع وزائل ہوتے اور انسان کا قلب صحت مند ودرست ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اصلاحِ قلب کا اجمالی طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل پیرا ہوا جائے۔ چناں چہ ایک حدیث میں اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد گرامی ہے:

« تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهِ. »(۳)

---

(۱) روح المعاني: ۱۱/۱۳۹

(۲) روح البیان: ۴/۵۴

(۳) مشکوٰۃ: ۳۱

(میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان کو تھامے
رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ، دوسرے اس کے رسول کی
سنت۔)

یہ حدیث عام ہے جو انسان کے تمام حالات ومعاملات اور تمام حرکات وسکنات اور تمام اعمال وافعال سب کو شامل ہے۔ لہٰذا جس طرح اعمالِ ظاہرہ متعلق بہ اعضا وجوارح کو شامل ہوگی، اسی طرح اعمالِ باطنہ متعلق بہ قلب وروح کو بھی عام وشامل ہوگی، حاصل یہ ہوا کہ تمام معاملات میں قرآن وسنت کی ہدایت کے مطابق جو کام کرے گا وہ ہی صحیح ہوگا۔ ورنہ گمراہی میں پھنس جائے گا اور اس میں اصلاحِ قلب کے متعلق ہدایات وتعلیمات بھی داخل ہیں۔

تفصیلی جواب

اور اس سوال کا تفصیلی جواب یہ ہے کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ میں روح وقلب کی بیماریوں کا جو ذکر آیا ہے اور ان کا علاج بتایا گیا ہے، پھر حضرات علما وصوفیا نے جو اس موضوع پر تحقیق کر کے قرآنی وحدیثی ہدایات کو مشرح ومفصل کیا ہے، ان کو کسی اللہ والے سے برتنا سیکھے اور ایک ایک اپنی روحانی وقلبی بیماری کا عملی طور پر علاج کرائے، کیوں کہ کسی چیز کے صرف جان لینے، پڑھ لینے یا سن لینے اور سمجھ لینے سے بیماری کا علاج نہیں ہوتا؛ بل کہ علاج تو ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہوتا ہے۔

مثلاً کسی کو ملیریا بخار ہو جائے اور وہ ملیریا بخار کے متعلق ڈاکٹروں کے لکھے ہوئے بلند پایہ مضامین بشوق ورغبت مطالعہ کرے اور ان کو خوب اچھی طرح سمجھ لے، یا کسی ڈاکٹر سے ملیریا بخار پر کوئی لکچر سن لے تو ظاہر ہے کہ اس کا بخار ختم نہ ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اور بڑھ جائے۔ ہاں وہ ڈاکٹر کی تجاویز وہدایات پر بلا کم وکاست عمل

کرے تو ضرور اس کو فائدہ ہوگا اور بخار اتر جائے گا۔

اسی طرح روحانی وقلبی امراض کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب ہدایات وتعلیمات قرآنی ونبوی پر عمل ہوگا اور اصول وقواعد کے مطابق عمل ہوگا تو ضرور فائدہ ہوگا اور یہ روحانی امراض دفع وزائل ہوجائیں گے۔

مگر جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ کام کسی اللہ والے کی نگرانی وسرپرستی میں ہونا چاہیے؛ کیوں کہ ہر ایک کو ان ہدایات پر از خود عمل کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ پھر نفس بڑا چالاک وچالباز ہوتا ہے۔ کبھی ایک برائی و بیماری سے ہٹتے ہی دوسری میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی بیماری کو صحت مندی کے لباس میں دکھاتا ہے، لہٰذا کسی رہبر و مصلح کی نگرانی اور سرپرستی میں اصلاحِ قلب کا کام ہو تو یہ خطرہ نہیں رہتا (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) الغرض اصلاحِ قلب کے لیے عملی طور پر کچھ کرنے کا بیڑہ اٹھانا چاہیے۔

مجاہدہ کی ضرورت

اسی عملی جد وجہد اور اصلاحی کوشش کا نام مجاہدہ ہے، جس کا ذکر قرآن اور حدیث اور علما وصوفیا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(اور جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کے لیے ہمارے راستے کھول دیتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

روح البیان میں ہے کہ اس آیت میں مجاہدہ کو مطلقاً ذکر فرمایا ہے تاکہ ظاہری دشمنوں اور باطنی دشمنوں دونوں سے جہاد کو عام رہے۔ ظاہری دشمنوں سے جہاد جیسے کفار محاربین سے جہاد ہے۔ اور باطنی دشمنوں سے جہاد جیسے نفس اور شیطان سے

جہاد ہے۔(۱)

نیز علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں رقمطراز ہیں:

''واطلقت المجاهدة لتعلم مجاهدة الأعادي الظاهرة والباطنة بأنواعهما''.

(مجاہدے کو (آیت میں) مطلقاً ذکر کیا گیا تا کہ ظاہری و باطنی تمام دشمنوں کو ان کی اقسام کے ساتھ شامل ہو جائے۔)(۲)

معلوم ہوا کہ آیت میں صرف قتال مع الکفار مراد نہیں ہے؛ بل کہ یہ بھی مراد ہے اور اس کے ساتھ جہاد مع النفس بھی مراد ہے۔

اور امام ترمذی اور ابن حبان رحمہما اللہ نے حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي اللّٰهِ. »

(مجاہد وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے نفس سے جہاد کرے۔)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''الجامع الصغیر'' میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ مناوی رحمہ اللہ نے لکھا کہ علامہ علائی رحمہ اللہ محدث نے فرمایا کہ حدیث حسن ہے اور اس کی سند جید ہے۔ اس حدیث میں مجاہد کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔ علامہ مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نفس سے جہاد باہر کے دشمن (کفار) سے جہاد کی اصل ہے، کیوں کہ جو شخص اپنے نفس سے جہاد نہ کیا ہوتا کہ وہ حکمِ خدا کی اتباع کرے اور منہیات

---

(۱) روح البیان: ۶/۴۹۷

(۲) روح المعاني: ۱۴/۲۱

کو چھوڑ دے تو اس کے لیے خارجی دشمن سے جہاد ممکن نہیں، اور اس کے دشمن سے جہاد و مقابلہ اس کے لیے کیسے ممکن ہے جب کہ اس کا دشمن اس کے بازو میں ہے جو اس پر مسلط ہے؟(۱)

غرض یہ کہ اپنے نفس کی لذات وخواہشات کا مقابلہ کر کے اس کو اطاعت خداوندی پر لگانا اور محرمات سے پرہیز کا خوگر بنانا، بہت بڑا جہاد ہے، اسی کو مجاہدہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

مجاہدہ کیوں؟

رہا یہ سوال کہ مجاہدہ کیوں ضروری ہے؟ اور یہ کہ اس سے فائدہ ونفع کیا ہے؟ اس کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کی بجا آوری اور اعمالِ فاسدہ سے اجتناب و پرہیز چوں کہ نفس وطبیعت کے خلاف ہے، اس لیے نفس ہمیشہ اس سلسلہ میں منازعت و مقابلہ کرتا ہے اور نیکی وصلاح سے روکنے اور شہوات ولذات میں ملوث کرنے کی فکر کرتا ہے جیسے قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول مذکور ہے کہ:

﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ (یُوْسُفْ : ۵۳)

(یعنی بلاشبہ نفس بہت زیادہ برائی کا حکم دینے والا ہے۔)

اس لیے نفس کے خلاف اعمالِ صالحہ کی بجا آوری اور ان پر پابندی اور اعمال واخلاقِ فاسدہ سے اجتناب و پرہیز ایک مجاہدہ چاہتا ہے تا کہ نفس اپنی روش سے باز آجائے حتی کہ وہ امّارہ سے مطمئنہ ہو جائے اور یہ کام بغیر مجاہدہ کے نہیں ہوسکتا؛ اس سے مجاہدہ کا نفع بھی معلوم ہو گیا کہ یہ خوگر لذات وشہوات، مجاہدہ کی وجہ سے طاعت

(۱) فیض القدیر : ۲۶۲/٦

وعبادت اور صلاح وتقویٰ کا عادی ہوجاتا ہے۔

ایک عمدہ مثال

اگر نفس کو اس کی مرضی پر چلنے سے نہ روکا جائے اور مجاہدہ کی بھٹی میں اس کو تپایا نہ جائے تو اس کی برائی وشرارت ختم نہیں ہوتی۔ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ ایک بزرگ گذرے ہیں، انہوں نے ایک عجیب قصیدہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھا ہے؛ اس میں انہوں نے نفس کی ایک عمدہ مثال دی ہے؛ ان کا شعر ہے ۔

وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلىٰ
حُبِّ الرَّضَاعِ وَ إِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

محترم فیاض الدین نظامی رحمۃ اللہ نے اس کا منظوم ترجمہ اس طرح کیا ہے ۔

نفس کی ہیں عادتیں مانندِ طفل شیر خوار
دودھ پیتا جائے گا جب تک چھڑائیں گے نہ ہم (۱)

حاصل شعر یہ ہے کہ نفس کو جب تک اس کی خواہشات سے نہ روکیں گے، اس وقت تک وہ گناہوں اور لذات وشہوات میں انہماک سے باز نہیں آتا جیسے شیر خوار بچہ جو ماں کی چھاتیوں سے دودھ پیتا ہے، اس کو اگر دودھ نہ چھڑائیں تو وہ کبھی دودھ نہیں چھوڑے گا؛ بل کہ پیتا ہی چلا جائے گا حتی کہ بڑا ہو کر بھی اس سے باز آنا مشکل ہوگا؛ اس لیے بچہ کا دودھ بجبر واکراہ چھڑایا جاتا ہے اور اس کے رونے، چیخنے، چلانے، واویلا مچانے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی؛ بل کہ صبر کر کے اس کو سنبھالا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر بچہ دودھ چھوڑتا ہے اور ایسا چھوڑتا ہے کہ پھر اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا؛ بل کہ ماں کا دودھ پینے سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہی حال نفس کا ہے اس کو خواہشات

(۱) نفح الوردة في شرح البردة: ۱۷

ولذات سے جب تک چھڑائیں گے نہیں، وہ ان کو نہیں چھوڑ سکتا؛ اس لیے مجاہدہ کراتے ہوئے اس کو اس کی لذات وخواہشات سے دور رکھا جائے۔ جب یہ مجاہدہ ہوگا تو پھر وہ ان کو چھوڑ دے گا؛ بل کہ ان سے نفرت کرنے لگے گا۔

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ

یہیں سے ان لوگوں کی غلط فہمی ظاہر ہوگئی جو نفس کی خواہشات کو بلا کسی قید وشرط پورا کرکے یہ خیال کرتے ہیں کہ جب نفس کو اس کی خواہش کی چیز مل جائے گی تو وہ اس کی طلب میں سر دپڑ جائے گا اور پھر مطالبہ وتقاضا نہ کرے گا۔ یہ خیال عام تجربات ومشاہدات کے خلاف ہے۔ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ نے اپنے قصیدہ میں نفس کی چالبازیوں پر کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ؎

فَلَا تَرُمْ بِالْمعَاصِيْ كَسْرَ شَهْوَتِهَا
إنّ الطَّعَامَ يُقَوِّيْ شَهْوَةَ النَهِمِ

فیاض الدین نظامی اپنے منظوم ترجمہ میں اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں؎

نفس کی خواہش گناہوں سے نہیں ہوتی دور
جس طرح جوع البقر میں پُر نہیں ہوتا شکم

یعنی نفس امارہ کی مثال ایسی ہے جیسے جوع البقر کا مریض کہ جس طرح پانی پینے اور کھانا کھانے سے اس کا پیٹ بھرتا نہیں؛ بل کہ بھوک پیاس اور بڑھ جاتی ہے، اسی طرح نفس امارہ بھی گناہوں سے کبھی سیر نہیں ہوتا؛ بل کہ اور زیادہ اس کا طالب وعادی ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ گمان کرنا کہ نفس کو اس کی خواہش کی چیز دیدینے سے اس کا تقاضا ضعیف ہو جائے گا؛ صحیح نہیں ہے۔

غرض یہ کہ نفس کو مجاہدہ کی بھٹی میں ڈال کر جب تک تپایا نہ جائے اور اس کی

خواہشات ولذات اور مطالبوں اور تقاضوں پر پابندی نہ لگائی جائے ،اس کی اصلاح نہیں ہوتی اور وہ نیکی وطاعت ،عبادت وانابت کی خصوصیات سے متصف نہیں ہوسکتا؛ اس لیے مجاہدہ ضروری ہے۔

نفس کی تین قسمیں

انسانی نفس اپنے احوال واوصاف کے لحاظ سے تین قسم پر ہے۔ایک نفس امّارہ دوسرے نفس لوّامہ اور تیسرے نفس مطمئنّہ ،چناں چہ قرآن مجید میں ان تینوں اقسامِ نفس کا ذکر آیا ہے۔ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿إِنَّ النَّفْسَ لأمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ (یُوسُف : ۵۳)

(حضرت یوسف رحمۃ اللہ نے فرمایا) بلاشبہ نفس امارۃ بالسوء (برائی کا بہت حکم دینے والا) ہے۔)

اس میں نفس امارہ کا ذکر آیا ہے اور دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿وَلاَ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (القِیَامَة : ۲)

(میں قسم کھاتا ہوں نفسِ لوّامہ کی۔)

اس آیت میں نفس لوّامہ کی قسم کھائی گئی ہے؛ معلوم ہوا کہ ایک نفس لوّامہ بھی ہوتا ہے۔اور ایک جگہ نفسِ مطمئنہ کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے۔

﴿ يَآأَيَّتُهَاالنَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِیْ اِلیٰ رَبِّکِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾

(اے نفس مطمئنہ !اپنے رب کی طرف لوٹ جا، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہو۔)

اس جگہ نفس مطمئنہ کا ذکر فرمایا گیا ہے؛ غرض یہ کہ نفس تین قسم کا ہے، یہ اس کے احوال واوصاف کے لحاظ سے تقسیم ہے، نفس امارہ سے، نفس کو نفس مطمئنہ بنانا ہے:

اس کے لیے مجاہدہ ہوتا ہے۔

نفس امارہ کیا ہے؟

نفس امارہ وہ ہے جو انسان کو برائی اور معصیت کا حکم دیتا ہے اور اس کا وسوسہ ڈال کر انسان کو اس میں ملوث کر دیتا ہے۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

''نفسِ انسانی اپنی ذات کے لحاظ سے بہت زیادہ برائی کا حکم دیتا ہے۔''

اور مراد (نفس امارہ سے) یہ ہے کہ وہ شہوتوں اور لذتوں کی طرف بہت زیادہ میلان کرتا ہے اور اپنی قوتوں اور آلات کو ان کی تحصیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ (۱)

اور تفسیر روح البیان میں ہے:

''نفس امارہ قبائح و معاصی کا حکم دیتا ہے؛ اس لیے کہ وہ باطل باتوں اور شہوتوں سے بہت زیادہ لذت پانے والا ہے اور مختلف قسم کے منکرات کی طرف بہت میلان کرنے والا ہے''۔ (۲)

نفس لوّامہ کی تعریف

رہا نفس لوامہ، تو اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ گناہ و تقصیر ہو جانے پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور گناہوں پر پشیمان اور تقصیرات پر پریشان ہوتا ہے۔

اس کی تائید حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ کے قول سے ہوتی ہے کہ انہوں نے نفس لوامہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ خیر و شر پر ملامت کرتا ہے کہ میں کاش ایسا کرتا، اے کاش میں ایسا کرتا۔ (۳)

---

(۱) روح المعانی: ۱/۱۳

(۲) روح البیان: ۴/۲۷۵

(۳) ابن کثیر: ۴/۴۴۸

نیز حضرت مجاہد رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ وہ نفس ہے جو اپنے اوپر ملامت کرتا ہے ان باتوں کے متعلق جو اس سے فوت ہوگئیں اور شر پر ندامت محسوس کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کیوں کیا اور خیر پر ندامت محسوس کرتا ہے کہ میں نے اس کو کیوں نہ کیا یا اس میں زیادتی کیوں نہ کی۔(۱)

غرض یہ کہ نفس لوامہ وہ ہے جو برائی ہو جانے پر ندامت و پشیمانی میں مبتلا ہوتا ہے اور خیر میں تقصیر و کمی ہونے پر پریشان ہوتا ہے؛ تو گویا اس نفس کو امّارہ و مطمئنہ دونوں کے بین بین درجہ حاصل ہے۔

نفس مطمئنہ کی حقیقت

تیسرا نفس، نفس مطمئنہ ہے جس کی تعریف میں حضرات صوفیائے کرام نے فرمایا:

یہ وہ ہے کہ جو نورِ قلب سے پورے طور پر منور ہو جائے حتی کہ صفاتِ مذمومہ سے الگ اور اخلاق حمیدہ سے متخلق ہو جائے اور طبعی منازعت سے سکون پا جائے (یعنی طبیعت و شریعت کے درمیان اس کا نفس جھگڑنے سے باز آ جائے۔)(۲)

اس نفس کو نفس مطمئنہ کس وجہ سے کہا جاتا ہے؟ اس میں متعدد اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ نفس وصول اِلی اللہ سے قبل مضطرب رہتا ہے، جب وہ وصول اِلی اللہ کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے تو اس کا یہ اضطراب ختم ہو کر اس کو اطمینان و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کو نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔

بعض علما نے فرمایا کہ نفس جب واصل اِلی اللہ ہوتا اور یقین کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا ہے تو اس کا نفس شک و ریب کی بیماری سے پاک ہوتا ہے اور اس کو شرع کی

---

(۱) روح المعاني: ۱۵۶/۲۹

(۲) روح المعاني: ۱۵۶/۲۹

ہر بات پر پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نفس مطمئنہ، ہر قسم کے خوف وحزن سے قیامت کے دن محفوظ و مامون ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔

بہ ہر حال یہ تیسری قسم کا نفس ہے، جو نفس مطمئنہ کہلاتا ہے، غرض نفس کو لوّامیت سے نکال کر اطمینان کی کیفیت سے متصف کرنا ضروری ہے؛ مجاہدہ اسی لیے کیا جاتا ہے۔

مجاہدہ اجمالی

مجاہدہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک اجمالی، ایک تفصیلی، مجاہدہ اجمالی یہ ہے کہ قلت کلام، قلت منام، قلت طعام اور قلت اختلاط مع الانام کا اپنے کو عادی بنائے، یہ مجاہدہ مقامات کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ شیخ المشائخ عارف باللہ امام سہروردی رحمۃ اللہ ''عوارف المعارف'' میں فرماتے ہیں کہ تمام مقامات چار میں مندرج ہیں۔ ایک ایمان و یقین، دوسرے توبۂ نصوح، تیسرے زہد، چوتھے دوام عمل کے ساتھ ظاہراً و باطناً، اعمال قلبیہ وقالبیہ کے ذریعہ بلا کسی قصور فتور کے مقامِ عبودیت، پھر چار مقامات کی تکمیل و اتمام دوسری چار باتوں کی مدد سے متحقق ہوگی۔ اور وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ قلتِ کلام، قلتِ طعام، قلتِ منام، اور لوگوں سے علیحدگی؛ علماء زاہدین اور مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان چار باتوں سے ہی مقامات میں استقرار و استقامت اور احوال میں سدھار حاصل ہوتا ہے۔ (۱)

اب مختصر طور پر ان چار امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے تا کہ بصیرت حاصل ہو:

قلّتِ کلام: بات چیت اور گفتگو میں تقلیل و کمی بہت ضروری ہے؛ اس سے زبان قابو و قبضہ میں رہتی ہے اور بہت سی برائیوں اور خرابیوں اور بہت سے معاصی

---

(۱) عوارف المعارف: ۸۶

اور گناہوں سے انسان بچ جاتا ہے، اس لیے حدیث میں ہے کہ جب حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ نجات کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

« اَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ وَلْیَسَعْکَ بَیْتُکَ وَابْکِ عَلٰی خَطِیْئَتِکَ. »(۱)

(اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اپنے گھر میں پڑے رہو۔ اور اپنی خطاؤں پر روؤ۔)

نیز ارشاد نبوی ہے:

« مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالَا یَعْنِیْهِ. »(۲)

(انسان کے کمال الاسلام میں سے یہ ہے کہ لایعنی فضول بات کو چھوڑ دے۔)

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« مَنْ صَمَتَ نَجَا. »(۳)

(جو خاموش رہا وہ نجات پایا۔)

اس سلسلے میں احادیث بہت ساری وارد ہوئی ہیں۔ یہ بطور نمونہ چند نقل ہوئیں، ان سے معلوم ہوا کہ آدمی کو زیادہ کلام کرنے سے بچنا چاہئے، خاموشی کی عادت ڈالنا چاہئے، بلا وجہ و بے ضرورت کلام سے پرہیز کرنا چاہئے۔

---

(۱) ریاض الصالحین: ۴۵۰

(۲) مشکوۃ: ۴۱۳

(۳) مشکوٰۃ: ۴۵۰

قلّت طعام: کھانے پینے میں کمی کرنا بھی ایک اہم مجاہدہ ہے، اور مومن کی شان یہی بتائی ہے کہ وہ کم کھاتا ہے بنسبت اس کے جو کفر میں مبتلا ہو، چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« يَأْكُلُ الْمُسْلِمُ فِيْ مِعىً وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِيْ سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ. » (۱)

(مسلمان ایک آنت میں کھاتا اور اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔)

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ایک غلام خریدنے کا ارادہ فرمایا تو اس کے سامنے کچھ کھجور رکھے کہ وہ کھائے۔ غلام نے بہت زیادہ کھایا تو آپ نے یہ کہہ کر غلام واپس کر دیا کہ "إِنَّ كَثْرَةَ الْأَكْلِ شُوْمٌ" کہ زیادہ کھانا نحوست ہے۔ (۲)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ حَسْبَ الْآدَمِيِّ لُقَمَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَه. »

(اس پیٹ سے زیادہ برا کوئی برتن نہیں جو آدمی پُر کرے، آدمی کے لیے تو چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر درست رہے۔) (۳)

ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ کثرتِ اکل وحرصِ اکل کوئی اچھی چیز نہیں؛ بلکہ

---

(۱) بخاري: ۸۱۲/۲

(۲) مشکوة: ۳۶۸

(۳) ابن ماجه: ۲۴۰

بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے؛ اس لیے اس میں تقلیل وکمی کرنا چاہئے ؛ مگر کمی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بھوکا رہے اور امراض کا شکار بنتا جائے ؛ بل کہ مراد یہ ہے کہ حد سے زیادہ نہ کھائے ، ہاں بقدر کفایت وضرورت کھانا برا نہیں ہے، میرے مرشد اول حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ نے اس سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ آپ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''سالک کو چاہئے کہ نہ اتنی تقلیل (کمی) کرے کہ صحت برباد ہو جائے اور نہ اتنی زیادتی ہو کہ حد سے زیادہ کھالے ، بلکہ اوسط درجہ کا لحاظ رکھنا چاہئے ، اصل طریقہ یہ ہے کہ جس وقت بھوک لگے اس وقت کھانا کھائے اور اتنا کھا کر رک جائے کہ چند لقمے کھانے کو اور جی چاہ رہا ہو''۔ (۱)

قلتِ منام: کم سونے سے مراد یہ ہے کہ رات کی نیند میں کمی کر کے رات کا ایک حصہ اللہ کی یاد و مناجات میں گذارے اور اس کی فضیلت قرآن وحدیث میں منصوص ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَعَماً﴾ (السجدۃ : ۱۶)

(ان (نیک بندوں) کے بازو، بستروں سے الگ رہتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اپنے رب کو خوف سے اور ثواب کی امید سے پکارتے ہیں۔)

''پہلو کا بستر سے الگ رہنا'' محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سوتے نہیں ، بلکہ جاگتے ہوئے اللہ کو پکارتے اور یاد کرتے ہیں۔

(۱) شریعت وتصوف :۱/ ۱۳۶

اور یہ کم سونا اس لیے ضروری ہے کہ حد سے زیادہ سونے سے طبیعت میں، برودت میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس سے قوائے فکریہ کمزور ہو جاتے ہیں اور یہ بات دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے نقصان دہ ہے؛ لیکن اس میں بھی یہ ملحوظ ہونا چاہئے کہ اعتدال و توسط ہو، کہ نہ بہت زیادہ سونے کی عادت ڈالے اور نہ حد سے کم سوئے؛ بل کہ بہ قدر ضرورت سونا چاہئے؛ اور آج کل کے لحاظ سے بقول اطباء چھ سے سات گھنٹے اوسط درجہ ہے۔

اگر نیند کا غلبہ ہو تو ذکر و عبادت میں مشغول ہونے کے بجائے، سو جانا چاہئے۔ چناں چہ حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

« إِذَا نَعِسَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَاصَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لاَ يَدْرِىْ لَعَلَّهُ يَذْهَبُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهُ. »(۱)

(جب تم میں سے کوئی نماز کی حالت میں اونگھنے لگے تو وہ سو جائے حتیٰ کہ اس کی نیند چلی جائے کیوں کہ کوئی اونگھتے ہوئے نماز پڑھے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ استغفار کرنے کے بجائے اپنے کو گالی دینے لگے۔)

غرض یہ کہ بقدر ضرورت سونا چاہئے اور بے ضرورت خواہ مخواہ سوتے رہنا نقصان دہ ہے، اسی کو صوفیا قلتِ منام سے تعبیر کرتے ہیں۔

قلّتِ اختلاط مع الانام: یعنی لوگوں سے میل جول اور تعلقات میں کمی کرنا، یہ بھی سالک کے لیے ضروری مجاہدہ ہے۔ پہلے یہ حدیث نقل کر چکا ہوں کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے سوال پر کہ نجات کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) ریاض الصالحین: ٦٨

نے فرمایا کہ زبان کو قابو میں رکھو اور اپنے گھر میں پڑے رہو اور خطاؤں پر روؤ، اس حدیث میں گھر میں پڑے رہنے کا حکم اسی جانب اشارہ ہے کہ لوگوں سے زیادہ میل جول نہ کرو۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"(مراد یہ ہے کہ) تو اپنے گھر میں رہے اور بلا ضرورت گھر سے نہ نکلے اور گھر میں بیٹھے رہنے سے تنگ دل نہ ہو؛ بل کہ اس کو غنیمت جانے، کیوں کہ یہ شرّ وفتنہ سے خلاصی کا سبب ہے؛ اسی لیے کہا گیا ہے: "هٰذا زَمَانُ السُّكُوْتِ، وَمُلاَزَمَة الْبُيُوتِ وَالْقَنَاعَةُ بِالْقُوْتِ إِلىٰ أَنْ يَمُوْتَ" (یہ زمانہ سکوت کا اور گھروں میں پڑے رہنے کا اور بہ قدر ضرورت گذارہ پر قناعت کرنے کا زمانہ ہے، یہاں تک کہ موت ہو جائے۔)(۱)

غرض یہ کہ اگر کوئی خاص حاجت وضرورت، خواہ دینی حاجت وضرورت یا دنیوی حاجت وضرورت نہ ہو تو کسی سے ملنا جلنا نہ چاہئے؛ اس سے دینی ودنیوی دونوں قسم کے نقصانات ہوتے ہیں، کبھی غیبت یا چغلی وغیرہ گناہوں میں آدمی مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے آخرت کا نقصان متیقن ہے اور کبھی خواہ مخواہ کی وقت گذاری سے دنیوی امور میں کوتاہی ہو کر اس کا نقصان ہوتا ہے۔

یہ ہے اجمالی مجاہدہ، جس کو مقامات کے حصول کے لیے ذریعہ وسبب اور اتمام وتکمیل مراتب کے لیے لازم وضروری قرار دیا گیا؛ رہا تفصیلی مجاہدہ تو وہ دو بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ایک اخلاق حمیدہ کی تحصیل پر، ایک اخلاق رذیلہ سے تنزیہ وتزکیہ پر اور

(۱) مرقات: ۱۵۰/۹

اس کی تفصیل اخلاق وتصوف کی بڑی کتابوں میں دیکھنا چاہئے۔ جیسے احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، مدارج السالکین، منازل السائرین، قوت القلوب، رسالہ قشیریہ وغیرہ اور اردو میں حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی کتب، جیسے اصول الوصول، شریعت وطریقت، التکشف، انفاس عیسیٰ، بصائر حکیم الامت اور حضرت مسیح الامت کی کتاب شریعت وتصوف (جلد اول ودوم) وغیرہ۔

اس مختصر تحریر میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں، کیوں کہ اس رسالہ سے مقصود محض ترغیب ہے اس بات کی کہ اصلاحِ نفس کی فکر ہو۔ اس کے لیے بہت اختصار کے ساتھ چند امور پیش کے گئے ہیں۔

ضرورتِ شیخ

مگر جیسا کہ ظاہر ہے، اصلاح قلب وتزکیۂ نفس کوئی ایسا معمولی کام نہیں کہ آدمی خود ہی کرلے یا کتب بینی سے حل ہوجائے؛ بل کہ اس کے لیے ایک شیخ کامل وماہر کی ضرورت ہوگی جس کی رہبری میں تزکیۂ نفس واصلاح قلب کا کام ہو، کیوں کہ یہ کام شیخ کی رہبری کے بغیر ہوگا تو اس میں نشیب وفراز کی جن منزلوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان میں انسان ڈگمگا جاتا ہے اور بہت سے لوگ رجعتِ قہقری کا شکار ہوجاتے ہیں اور بعض لوگ راہ سے بے راہ بھی ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھیجے گئے اور پھر انبیا کے بعد ان کے نائبین کا سلسلہ قائم وجاری فرمایا گیا اور جس طرح دنیا میں ہر علم وفن کے لیے عادۃ اللہ یہی ہے کہ رہبر واستاذ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح یہ بھی ایک علم ہے اور ساتھ ساتھ فن بھی کہ آدمی اپنے قلب کو اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کرے، بعد اس کے اندر سے

اخلاق رزیلہ کو باہر نکالے اور دل کو معرفتِ الٰہیہ کے نور سے منور اور محبتِ خداوندی سے معمور کرے۔ اس لیے یہ بھی بغیر رہبر و شیخ کے حاصل نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا اس ادارہ میں قدم رکھنے کا ارادہ ہو تو اولاً کسی شیخ کامل سے رابطہ کرنا چاہئے۔

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر وپس بیا

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق　　عمر بگذشت ونشد آگاہِ عشق

اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ اور اس کے پیچھے چل، کیوں کہ جو بھی راہ عشق الٰہی میں بغیر رفیق و رہبر کے چلا، اس کی عمر گزر گئی مگر وہ عشق الٰہی سے آگاہ نہ ہوا۔

کسی نے اس سلسلے میں یہ شعر بہت ہی عجیب کہا ہے ؎

ان سے ملنے کی ہے یہی ایک راہ　　ملنے والوں سے راہ پیدا کر

شیخ کامل کی پہنچان

مگر شیخ و پیر کون ہوتا ہے؟ اور اس کی پہچان کیا ہے؟ اس کا جان لینا بہت ضروری ہے، کیوں کہ آج کل جاہل صوفیوں اور بے دین وملحد قسم کے پیروں نے عوام الناس کو دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے اور ہر قسم کی گمراہی وضلالت، بے دینی و جہالت کا نام تصوف ومعرفت رکھ کر لوگوں کو شریعت سے دور کرنے اور علما حق سے بدظن کرنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے، چناں چہ ایسے جاہل صوفی اور بے دین پیر، شریعت وطریقت کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر اس طرح دھوکہ دیتے ہیں کہ علمائے شریعت والے ہیں اور ہم طریقت والے ہیں، نیز طریقت کو شریعت پر فوقیت دیتے ہیں اور اپنے مریدین کو بھی دور رکھتے ہیں اور محرمات کا ارتکاب کرتے اور ہر گمراہی کو روا رکھتے ہیں اور ان میں ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جو زنا، شراب، جوا، اختلاطِ مرد و زن وغیرہ سب کو

حلال کیے ہوئے ہیں، معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ فاسق وفاجر ہیں اور اگر ان محرمات کو حلال سمجھتے ہیں تو مرتد و کافر ہیں، ان سے اصلاح وتزکیہ کا کام کس طرح ہو سکے گا؟ یہ خود گمراہ ہیں دوسروں کی کیا رہبری کریں گے؟

لہٰذا یہاں جان لینا چاہئے کہ شیخ کی پہچان کیا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللہ نے ''قصد السبیل'' میں فرمایا:

''پیر کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں (۱) ضرورت کے موافق دین کا علم ہو (۲) عقیدے، عمل اور عادتیں اس کی شرع کے موافق ہوں (۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو (۴) کسی پیر کامل کے پاس کچھ دنوں تک رہا ہو (۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش منصف مزاج ہوں، وہ اس کو اچھا جانتے ہوں (۶) عام لوگوں کی نسبت خاص لوگ یعنی جو سمجھدار اور دیندار ہیں وہ اس کے زیادہ معتقد ہوں (۷) اس کے مریدوں میں اکثر مرید شرع کے پابند ہوں اور ان کو دنیا کی طمع نہ ہو (۸) وہ پیر اپنے مریدوں کی تعلیم جی سے کرتا ہو، اور چاہتا ہو کہ یہ درست ہو جائیں اور اگر مریدوں میں کوئی بری بات دیکھتا ہو یا سنتا ہو تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے (۹) اس کے پاس چند روز بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی معلوم ہوتی ہو (۱۰) وہ خود بھی ذکر و شغل کرتا ہو۔''(۱)

اس کے بعد ایک ضروری بات پر حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہ نے تنبیہ فرمائی ہے کہتے ہیں کہ:

---

(۱) تسہیل قصد السبیل: ۱۶

''جس شخص میں یہ نشانیاں موجود ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کرامت بھی ہوتی ہے یا نہیں، یا پوشیدہ یا آئندہ ہونے والی باتیں اس کو معلوم ہوتی ہیں یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے وہ قبول ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ اپنی باطنی قوت سے کچھ کام کر دیتا ہے یا نہیں، کیوں کہ یہ باتیں پیر و ولی کے لیے ہونا ضروری نہیں۔''(۱)

غرض یہ کہ شیخ و پیر ایک طرف علمِ شریعت سے آراستہ ہو تو دوسری طرف اس علم کے موافق زندگی گذارتا ہو، اور مریدین کی تربیت کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو، ایسے شخص کو اپنی اصلاح و تربیت کے لیے منتخب کر لینا چاہیے، اور اس انتخاب میں تلاش و جستجو سے کام لینا چاہیے۔ حضرت شیخ قطب الدین دمشقی رحمۃ اللہ نے اپنے رسالہ مکیہ میں لکھا ہے کہ:

''مرید ہونے والے پر لازم ہے کہ شیخ کامل کی تلاش میں پوری کوشش کرے اور خوب جانچے کہ یہ شیخ شیخ بنانے کے قابل ہے یا نہیں، کیوں کہ بہتیرے طالب اس راستہ میں بد دینوں کا اتباع کر کے ہلاک ہو چکے ہیں۔''(۲)

شیخ سے استفادہ کا طریقہ

جب خوب جانچ پڑتال کے بعد شیخ کا انتخاب کر چکے تو اب ضروری ہے کہ اس سے استفادہ و استفاضہ کرے اور دلجمعی کے ساتھ اپنی اصلاح و تزکیہ کرائے۔

عام طور پر لوگ شیوخ سے بیعت تو ہو جاتے ہیں مگر اصلاح و تزکیہ نہیں کراتے،

---

(۱) تسهيل قصد السبيل: ۱٦

(۲) ارشاد الملوک: ۷

حالاں کہ بیعت کی اصل وحقیقت ہی یہ ہے کہ اپنے ظاہر وباطن کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے شیخ سے رہبری حاصل کرے، باقی ہاتھ میں ہاتھ دینا (جس کو عرفِ عام میں بیعت کہتے ہیں) وہ صورت بیعت ہے اور سنت ہے اور اس صورت کی حقیقت اصلاحِ احوال ہے، اگر صورت ہی پر اکتفا کر بیٹھیں تو اصلاح وتزکیہ کیسے ہوگا؟

رہا یہ سوال کہ شیخ سے استفادہ اور اصلاح وتزکیہ کرانے کا کیا طریقہ ہے؟ بعض عوام اس سلسلہ میں عجیب عجیب خیالات پکائے ہوئے ہیں، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ بس بیعت ہوتے ہی سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور کوئی یہ خیال کئے ہوئے کہ شیخ سے کچھ وظائف حاصل ہوں گے اور اس کو پڑھنے سے سارے کام بن جائے گے، کسی کا یہ خیال کہ شیخ کے مریدوں میں داخل ہونے اور ان کے شجرہ میں نام آنے سے بخشش کا پروانہ مل جائے گا، وغیرہ حالانکہ بیعت کا نہ یہ مقصود ہے اور نہ اس سے ایسا ہوتا ہے۔

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شیخ سے استفادہ ایک تو اس طرح ہوتا ہے کہ اپنے تمام امراض اور برائیوں کو اس کے سامنے پیش کر کے اصلاح لے اور جو کچھ شیخ تعلیم وہدایت دے، اس پر عمل کرے۔

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ نے اپنے ایک قطعہ میں فرمایا ہے کہ ؎

چار شرطیں لازمی ہیں استفاضہ کے لیے
اطلاع و اتباع واعتقاد و انقیاد
یہ مقفّی قول ہے رنگین بھی سنگین بھی
حضرت مرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد

اس میں شیخ سے فیض حاصل کرنے کے لیے چار شرائط بیان فرمائی ہیں اور یہ

دراصل حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا فرمان ہے جس کو خواجہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے منظوم فرمایا ہے۔

پہلی شرط اطلاع ہے، یعنی اپنے احوال کو بلاکم وکاست شیخ کے سامنے رکھ دینا اور اس سلسلہ میں خیانت بالکل نہ کرنا چاہئے اور نہ ہی شرم کرنا چاہئے، جیسے ڈاکٹر سے بیماری کو چھپایا نہیں جاتا بلکہ کچھ دیر کے لیے شرم وحیاء کو اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے اور بیماری کو صاف ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ طبیب وڈاکٹر بیماری کا معائنہ اور تشخیص کرے اور پھر علاج تجویز کرے۔

اسی طرح شیخ طبیب روحانی ہوتا ہے اس کے سامنے اپنے امراض کا اظہار کر کے علاج معلوم کرنا چاہئے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ شیخ جو علاج تجویز کرے اس کی اتباع کرے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے کی تجویز ہو یا کسی کام کو چھوڑنے کی تجویز ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک طبیب وڈاکٹر کی تجویز پر عمل نہ ہوگا، بیماری زائل نہیں ہوتی، اسی طرح جب تک شیخ کی تجویز پر عمل نہ ہوگا، بیماری ختم نہ ہوگی، پھر تجویز میں کبھی کسی کام کے اختیار کرنے کا حکم ہوگا اور کبھی کسی کام کے ترک کرنے کا حکم ہوگا، جیسے جسمانی بیماری کے علاج میں بھی کبھی تو ڈاکٹر کوئی دوا یا غذا تجویز کرتا ہے اور کبھی کسی چیز سے پرہیز تجویز کرتا ہے اور دونوں تجویزوں پر عمل ضروری ہے۔ اگر غذا ودوا والی تجویز پر عمل کیا مگر پرہیز والی تجویز پر عمل نہ کیا تب بھی پورا فائدہ نہ ہوگا بلکہ بعض اوقات پرہیز نہ کرنے سے بیماری بڑھ جاتی ہے؛ اسی طرح روحانی امراض میں شیخ کبھی تو کوئی عبادت، ذکر، وظیفہ ومراقبہ یا کوئی شغل وعمل تجویز کرتا ہے اور کبھی کسی بات سے احترازوپرہیز کا حکم دیتا ہے جیسے لوگوں سے میل جول یا زیادہ بات چیت، کھانے میں کمی وزیادتی وغیرہ

سے منع کر دیتا ہے؛ اتباع میں ان دونوں تجاویز پر عمل داخل ہے۔

تیسری شرط اعتقاد ہے کہ شیخ سے عقیدت ہو، محبت ہو، کیونکہ شیخ کی تشخیص اور تجویز پر اعتماد اور اس کے مطابق عمل اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ شیخ سے اعتقاد ہو، اگر اعتقاد ہی نہ ہوگا تو اس کی تشخیص وتجویز پر اعتماد کیسے ہوگا اور جب اعتماد نہ ہو تو عمل کیوں کر ہوگا؟ اسی لیے علماء تصوف وسلوک نے لکھا ہے کہ شیخ سے اعتقاد ومحبت اکسیر اعظم ہے۔

اور چوتھی شرط انقیاد ہے جس کے معنی ہیں خضوع، یعنی جھکنا، مطلب یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ انقیاد اور عاجزی وانکساری کا معاملہ کرے، اس کے سامنے اپنے آپ کو مٹادے اور پامال کردے جیسا کہ فرمایا گیا ہے ؎

قال را بگذار مردِ حال شود ☆ پیش مردِ کاملے پامال شود

اور خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ؎

پیش رہبر ذلیل ہو جاؤ ☆ متبع بے دلیل ہو جاؤ
پھر تو سچ مچ جمیل ہو جاؤ ☆ یعنی حق کے خلیل ہو جاؤ

غرض یہ کہ شیخ و پیر سے اس طرح استفادہ کیا جاتا ہے کہ اعتقاد وانقیاد کے ساتھ احوال کی اطلاع دے کر تشخیص وتجویز پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

اس کے لیے پہلے اندر کے عیوب اور نقائص، خرابیوں اور بیماریوں کو دیکھنا چاہئے کہ کیا کیا بیماریاں اور عیوب میرے اندر ہیں، پھر ان کو شیخ کے سامنے ظاہر کرنا چاہئے۔

ایک تو اس طرح شیخ سے استفادہ ہوگا، دوسرے اس طرح کہ شیخ کی معیت وصحبت میں رہ کر ان کی باتوں کو سنا جائے اور اپنے احوال پر ان کو منطبق کیا جائے، نیز

صحبت شیخ سے فیض روحانی و باطنی حاصل کرنے کی نیت بھی کی جائے، کیونکہ شیخ کامل وبابرکت کا فیض دل سے دل کی طرف منتقل ہوتا ہے بلکہ اس کے الفاظ اور کلام سے بھی اس کا نور باطن مرید کے دل پر منعکس ہوتا ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ نے فرمایا ؎

شیخ نورانی زره آگہہ کند　　نور را با لفظہا ہمرہ کند

گر تو سنگ خاره ومرمری بوی　　گر بصاحب دلے رسی گوہر شوی

(شیخ صاحبِ نور باطن، طالبین حق کو راہ حق بھی دکھاتا ہے اور اپنے نور باطن کو بھی اپنے الفاظ کے ذریعہ طالبین کے ہمراہ کردیتا ہے، اگر تو پتھر کی طرح بے قدر بھی ہوگا تو کسی صاحب دل بزرگ کے پاس جائے گا تو موتی کی طرح آبدار ہوجائے گا۔)

اس طرح شیخ سے فیض پا کر اپنے دل کو جو گناہوں کا عادی اور پتھر کی طرح قاسی ہوگیا ہے موتی کی طرح آبدار و بیش قیمت بنایا جاسکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قلب سے متعلق وارد بعض احادیث مع مختصر تشریح

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے دل پر ایک کالا نکتہ اور داغ بن جاتا ہے اگر توبہ کر لیتا ہے اور اس گناہ سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کا دل صاف وصیقل ہو جاتا ہے اور اگر مزید گناہ کرتا ہے تو یہ داغ بھی زیادہ ہو جاتا ہے (اور بعض روایات میں ہے کہ) یہ گناہ بڑھ کر اس کے پورے قلب کو گھیر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پاک کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾

(ہر گز نہیں، بل کہ ان کے دلوں پر زنگ ہے۔)(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ کی وجہ سے دل پر زنگ آجاتا ہے اور وہ توبہ کرنے سے زائل ہوتا ہے ورنہ بڑھ کر دل کو پوری طرح زنگ آلود کر دیتا ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ وہ زنگ گناہ پر گناہ ہے، جس سے دل اندھا ہو جاتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔(۲)

---

(۱) ترمذي: ۲/۱۷۱، قال الترمذي هذا حديث صحيح

(۲) ابن كثير: ۴/۴۸۵

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دل چار قسم کے ہیں، ایک صاف شفاف دل جس میں روشن چراغ ہو، یہ مومن کا دل ہے، دوسرے کالا دل جو الٹا ہو، یہ کافر کا دل ہے، تیسرے بے سمجھ دل جو غلاف سے بندھا ہوا ہو، یہ منافق کا دل ہے، چوتھا دوُرخا دل جس میں ایمان ہو، اس میں ایمان کی مثال ساگ سی ہے کہ جسے میٹھا پانی بڑھاتا ہے اور نفاق کی مثال پھوڑے کی سی ہے جسے پیپ بڑھاتی ہے جس پر جو مادہ غالب ہوگا اس پر وہی حکم لگایا جائے گا۔(۱)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قلب کی کئی قسمیں ہیں، اور مؤمن کا قلب صاف شفاف آئینہ کی طرح ہوتا ہے، اور اس میں معرفتِ الٰہی کا چراغ روشن ہوتا ہے اور کافر کا دل کالا اور الٹا ہوتا ہے اس لیے کوئی حق بات سمجھنے سے وہ بعید ہوتا ہے اور منافق کا دل، غلاف چڑھا ہوا ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ بھی قبولیتِ حق کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اور آخری قسم وہ ہے جس میں ایمان بھی ہو اور نفاق بھی؛ یہاں نفاق سے عملی نفاق مراد ہے کیوں کہ اعتقادی نفاق ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔

(۳) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ا نے فرمایا کہ دل کو قلب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اُلٹ پُلٹ ہوتا رہتا ہے؛ دل کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کھلے میدان میں درخت میں ایک پر لٹکا ہوا ہو، جس کو ہوا آگے پیچھے اُلٹ پُلٹ کر رہی ہو۔(۲)

اس کی شرح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دل شر سے خیر کی طرف

(۱) احمد: ۳/۱۷

(۲) جامع الصغیر: ۲۹۹۵

اور خیر سے شر کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے، اور اسی وجہ سے اس کا نام قلب (کہ قلب کے معنی بدلنے اور الٹ پلٹ کرنے کے ہیں۔)(۱)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے تھے کہ "اے اللہ! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں چار چیزوں سے، اس علم سے جو نفع نہ دے، اس قلب سے جو خشوع والا نہ ہو، اس نفس سے جو سیراب نہ ہو، اور اس دعا سے جو مقبول نہ ہو۔(۲)

بعض وقت آپ اللہ سے قلب خاشع کا سوال فرماتے۔ اس حدیث میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منقول ہے، جس میں آپ اس قلب سے پناہ مانگ رہے ہیں جس میں خشوع نہ ہو معلوم ہوا کہ اس میں خشوع کی کیفیت مطلوب ہے اور نہ ہونا مذموم ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

﴿ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾

(کیا مسلمانوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے لیے جھک جائیں؟)

بلاشبہ دل اس لیے بنایا گیا ہے کہ اپنے خالق و مالک کے سامنے جھک جائے اور سینہ اس کے لیے کھل جائے اور اس میں نور ڈالا جائے، پس اگر وہ ایسا نہ ہو تو وہ قلب قاسی (سخت دل) ہے، اور اس سے پناہ مانگنا واجب ہے۔(۳)

---

(۱) مرقات: ۱/۷٦

(۲) مشکوٰۃ: ۲۱۷

(۳) مرقات: ۵/۲۲۸

(۵) « عن أبی هریرة ﷺ قال قال رسولُ اللّٰہِ ﷺ "إنَّ اللّٰهَ لاَ يَنْظُرُ إلىٰ اَجْسَادِكُمْ وَلاَ إلىٰ صُوَرِكُمْ وَلكِنْ يَنْظُرُ إلىٰ قُلُوْبِكُمْ وَأَشَارَ إلىٰ صَدْرِهٖ بِأصَابِعِهٖ. » (۱)

(حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور صورتوں کونہیں دیکھتے لیکن وہ تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں (پھر آپ نے اپنے سینہ کی طرف انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔)

یہ حدیث بہت اہم مسئلہ کی طرف رہنمائی کررہی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جسموں اور صورتوں پر فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ قلب کے اعتبار سے فیصلہ ہوگا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ کے نظر فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جزاء عطا فرمائیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعمالِ ظاہرہ کی جزا، دل میں موجود اللہ کی عظمت وخشیت سے عطا فرمائیں گے۔ (۲)

علامہ عبد الروف المناوی رحمۃ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''یعنی ظاہر پر اللہ جزاء نہیں دیتا، اور نہ مالوں پر جو خیرات سے خالی ہیں، لیکن وہ قلوب کو دیکھتا ہے جو تقویٰ کا محل اور جواہر کا برتن اور معرفت کا خزانہ ہے (پھر فرماتے ہیں) نظر کے معنی یہاں احسان، رحمت اور مہربانی کے ہیں، اور نظر نہ کرنے کے معنی احسان ورحم نہ کرنے کے

---

(۱) مسلم: ۲/۳۱۷، ابن ماجه: ۳۰۶

(۲) مسلم: ۲/۳۱۷

ہیں، پس احسان و رحمت کو نظر سے مجازاً تعبیر کیا ہے، پھر فرمایا کہ لوگوں کی نظر و میلان اچھی صورتوں اور مالوں کی طرف ہوتا ہے اور اللہ کی ذات اس سے منزہّ ہے، لہٰذا اس کی نظر اس پر ہے جو سر و اصل مغز ہو، اور وہ قلب و عمل ہیں۔"(۱)

(۲) «عَنْ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لاَ تُكْثِرُوْا الْكَلاَمَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلاَمِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ وَإِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي.»(۲)

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بغیر ذکر اللہ کے زیادہ بات نہ کرو، کیوں کہ ذکر اللہ کے بغیر کثرتِ کلام دل کے لیے سختی ہے اور تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خدا سے دور وہ ہے جو سخت دل (والا) ہو۔)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ سے غافل ہوکر، دنیوی بات چیت سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے، جو کہ ایک روحانی و باطنی بیماری ہے، اور جس کے دل میں سختی و قساوت کی بیماری ہو، خدا کے نزدیک وہ تمام لوگوں میں سب سے دور ہے یعنی اس کی رحمت سے دور ہے، معلوم ہوا کہ دل کی سختی انتہائی قبیح روحانی بیماری ہے جس سے آدمی رحمت خداوندی سے محروم ہوجاتا ہے، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ بیماری، ذکر اللہ سے غفلت اور دنیوی فضول گوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے بچنا چاہیے اور ذکر اللہ کی کثرت کرنا چاہیے تا کہ دل میں نرمی پیدا ہو۔

(۱) فيض القدير: ۲/۲۸٦
(۲) ترمذي: ۲/٦٦

(۷) « عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِنَّ الَّذِیْ لَيْسَ فِيْ جَوْفِهٖ شَيْءٌ مِنَ الْقُرآنِ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ. »(۱)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ نہ ہو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہ دل ویران گھر کی طرح اس لیے ہے کہ دلوں کی آبادی ایمان وقرأتِ قرآن سے ہوتی ہے اور باطن کی زینت وبہار، عقائد حقہ اور اللہ کی نعمتوں میں تفکر سے ہوتی ہے، اور اس میں قرآن سے خالی دل کو ویران گھر سے تشبیہ اس طور پر ہے کہ قرآن جب دل میں ہوگا تو کم یا زیادہ ہونے کے اعتبار سے وہ مزین ومعمور ہوگا اور جب وہ اس چیز سے خالی ہوگا جو اس کے لیے ضروری ہے، یعنی ایمان واعتقادِ حق اور اللہ کی نعمتوں اور اس کی صفات میں تفکر وتدبر، تو وہ اس گھر کی طرح ویران ہوگا جو اسباب وسامان اور زیب وزینت سے خالی ہو۔ (۲)

اس حدیث اور اس کی تشریح سے معلوم ہوا کہ دل کی آبادی، قرآن اور اس پر ایمان وعمل سے ہے، اس کے بغیر دل آباد نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ویران گھر کی طرح ہوتا ہے۔

(۸) « عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: "اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِمَاءِ الثَّلْجِ

---

(۱) ترمذي: ۲/۱۱۹، دارمي: ۲/۲۰

(۲) مرقات: ۴/۳۵۴

وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِي كَمَا يُنَقَّي الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ.» (۱)

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دعا میں) فرماتے تھے، اے اللہ! میری خطاؤں کو برف اور اولے کے پانی سے دھودے اور میرے قلب کو اس طرح صاف کردے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کردیا جاتا ہے۔)

اس حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا نقل کی گئی ہے جس میں ایک درخواست آپ نے یہ فرمائی ہے کہ اے اللہ! میری خطاؤں کو برف اور اولے کے پانی سے دھودے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ گناہ اور خطائیں جہنم کی تیزی اور گرمی ہوتی ہے، لہٰذا اس کو انتہائی ٹھنڈے پانیوں سے دھونے کی درخواست فرمائی ہے۔

یا اس لیے کہ گناہ میں سیاہی ہوتی ہے اور برف اور اولے سفید، تو اس طرف اشارہ ہے کہ مغفرت سے گناہ کی سیاہی، سفیدی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور دوسری درخواست یہ فرمائی کہ اے اللہ! میرے دل کو اس طرح صاف کردے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ ملّا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! میرے دل کو باطنی گناہوں اور خطاؤں سے صاف کردے اور یہ باطنی گناہ، برے اخلاق اور اور گندی عادات ہیں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''میرے دل کو اس طرح صاف فرمادے جیسے سفید کپڑے کو میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قلب اصل فطرت کے اعتبار سے سلیم، نظیف اور سفید ہوتا ہے؛ لیکن گناہوں کے

(۱) بخاري: ۹۴۳/۲، مسلم: ۳۴۷/۲

ارتکاب اور عیوب سے اپنے آپ کوملوث کر لینے کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے۔"(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دل گناہوں کی وجہ سے کالا اور سیاہ ہو جاتا ہے اور اخلاق رذیلہ اور ردی عادات سے اس کا اصلی رنگ وروپ بگڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی اصلاح کے لیے جہاں محنت ومجاہدہ درکار ہے، وہیں اللہ سے دعا کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ کسی کی محنت ومجاہدہ اور عمل وتدبیر اس وقت تک کارگر نہیں جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب نہ فرمائے۔ لہٰذا سنت نبوی کے مطابق دل کی صفائی کے لیے الحاح وزاری کے ساتھ اللہ سے دعا بھی کرنا چاہئے۔

دعا واختتام:

ان چند گذارشات پر اس مختصر تحریر کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ظاہر وباطن دونوں کو سنوارنے اور شریعت کے مطابق ان کو ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائے اور ظاہر سے زیادہ باطن کی طرف توجہ کی توفیق عطا فرمائے۔ جیسا کہ حدیث میں دعا ہے کہ:

« اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْراً مِنْ عَلاَ نِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً. »

(ترجمہ: اے اللہ میرے باطن کو ظاہر سے بہتر بنادے اور میرے ظاہر کو صالح بنادے۔)

فقط

محمد شعیب اللہ

یکم ربیع الاول ۴/ جون ۲۰۰۰ء

مرقات: /۲۲۵

تحفۃ السالک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

الحمد لولیه والصلوۃ علی نبیّه وعلی آله وصحبه اجمعین.

امّا بعد: ایک مسلمان پر جہاں نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ ضروری وفرض ہیں اور جھوٹ، دھوکہ دہی، رشوت، وسود جیسی برائیاں حرام ہیں، اسی طرح اس پر اخلاص، حب الٰہی، خوف الٰہی، صبر وشکر، اعتماد وتوکل علی اللہ، وغیرہ قلبی اعمال بھی ضروری ہیں اور حب مال، حب جاہ، کینہ، حسد، تکبر، ریا کاری وغیرہ روحانی برائیاں حرام ونا جائز ہیں، شریعت میں ظاہری اعمال کے احکام کے ساتھ باطنی اعمال کے احکام بھی آئے ہیں، اپنے آپ کو ان دونوں قسم کے احکام کا پابند بنانے کے لیے جس راستہ پر چلتے ہیں اور وہ یقیناً صراطِ مستقیم ہے، اسی کو سلوک کہا جاتا ہے۔

زیر نظر رسالہ میں ''راہ سلوک'' کی ضرورت و اہمیت کے ساتھ، اس راہ کے مسافرین کے لیے مختصر پروگرام ونظام اور اس راہ کی ضروریات ولوازمات، اور اس راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور پریشانیوں کو قرآن، حدیث اور بزرگانِ امت کے اقوال وارشادات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

اگرچہ اس مضمون کا بہت پہلے سے خیال تھا؛ مگر ہجوم افکار وکثرتِ کار کے باعث اس خیال کو عملی جامہ پہنایا نہ جاسکا تھا۔ مگر قریب میں اللہ تعالیٰ نے ایک موقعہ

فرصت کا عطا فرمایا تو اس کو اس کام کے لیے غنیمت سمجھا، وہ یہ کہ جامعہ "مسیح العلوم" میں ششماہی امتحان کے بعد حسب معمول تعطیل ہوئی تو جامعہ کے استاذ مولوی آصف اقبال صاحب عمری نے ان کے گھر (گنگلیری، کرشنا گری) چلنے کی دعوت دی، تو ۵، ربیع الآخر ۱۴۲۲ھ بروز منگل، گنگلیری حاضری ہوئی۔ دل باغ و بہار ہوگیا کہ اس چھوٹی سی آبادی کے گاؤں میں باغات اور کھیتوں، پہاڑوں اور جھیلوں کے درمیان کھلی فضا اور خوش گوار موقعہ پر موصوف کا گھر واقع ہے، جو اپنی سادگی اور قدامت کے ساتھ ساتھ، صفائی، ستھرائی، سلیقہ مندی اور تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہے۔ دو دن یہاں گذارنا تھا تو خیال ہوا کہ اس فرصت میں اُس خیال کہن کو لباس تازہ پہنا کر عملی شکل دیدوں۔ الحمد اللہ اس رسالہ کا بنیادی مسودہ دو دن کے مابین مختلف اوقات میں جن کی مجموعی مقدار پانچ چھ گھنٹے ہوگی، تیار ہوگیا۔ پھر گھر واپسی کے بعد حوالجات وضروری تشریحات کے ساتھ اس کو مرتب کر کے پیش کیا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو مفید و نافع بنائے اور ہم سب کو اپنے قرب و رضا کی نعمت سے مالا مال فرمائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

(الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم)

۵، جمادی الاولی ۱۴۲۲ھ ۲۷، جولائی ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر مومن، قانون شرع کا پابند ہے

ہر مومن کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا مکلّف وپابند بنایا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے قانون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ وطریقہ کے مطابق گذارے، اس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْٓ اَطِیْعُو اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ (النساء:۵۹)

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اور اولی الامر (یعنی علما وحکام کی اطاعت کرو۔)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

﴿وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً مُّبِیْنًا﴾ (الاحزاب:۳۶)

(کسی مومن مرد یا عورت کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو ان (مومنین) کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی

نافرمانی کرتا ہے، وہ کھلی گمراہی میں ہے۔)

ایک جگہ کامیابی ونجات کے اصول کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰئِکَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ﴾ (نور: ۵۲)

(اور جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا اور تقوی اختیار کرتا ہے، ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر چارۂ کار نہیں اور مومن کو خدا اور رسول کے احکام وفیصلوں کا پابند رہنا ضروری ہے، وہ آزاد نہیں ہے اور اسی اطاعت میں اس کی کامیابی پوشیدہ ہے۔

اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

« لاَ يُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰى اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ. »(۱)

(تم میں سے کوئی (کامل) مومن اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔)

ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ:

« لاَ يُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰى يَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ. » (۲)

---

(۱) بخاري: ۵، مسلم: ۶۳، نسائي: ۴۹۲۷، ابن ماجه: ۶۶، احمد: ۱۳۴/۲

(۲) مشکوٰة: ۳۰، الاربعين النووية: ۴۱

(تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش،
میری لائی ہوئی تعلیم کے تابع نہ ہوجائے۔)

ایک حدیث میں ہے:

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ تین آدمی خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ ہیں ایک حرم میں الحاد یعنی ظلم کرنے والا، دوسرا اِسلام میں رہ کر جاہلیت کا طریقہ تلاش کرنے والا اور تیسرا بغیر حق کے کسی مسلمان آدمی کے خون کا مطالبہ کرنے والا تاکہ اس کا خون بہائے۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے:

« كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْ خُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلاَّمَنْ اَبٰى، قِيْلَ: وَمَنْ اَبٰى قَالَ: مَنْ اَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى. » (۲)

(میرے تمام امتی جنت میں داخل ہوں گے، سوائے اس کے جس نے انکار کیا، آپ سے پوچھا گیا کہ انکار کرنے والا کون ہے؟ فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے انکار کیا۔)

بہ طور نمونہ چند احادیث یہاں نقل کی گئی ہیں، ورنہ اس مضمون پر احادیث کا دفتر کا دفتر موجود ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اپنے ہر معاملہ میں اللہ اور رسول کے احکام وقوانین کو مدنظر رکھ کر کام کرنا چاہئے اور کسی بھی معاملہ میں اس کو من مانی وآزاد زندگی نہیں گذارنی چاہیے۔

---

(۱) بخاري: ٦٨٨٢

(۲) بخاري: ٧٢٨٠، احمد: ٨٣٧٣

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کی بندگی اور رسول اللہ کی پیروی، زندگی کے تمام احوال وامور میں کرنا ضروری ہے۔ظاہری امور میں بھی اور باطنی امور میں بھی عقائد وایمانیات میں بھی اور اعمال وعبادات میں بھی، معاشرت وسماجیات میں بھی اور اخلاق وکردار میں بھی، آپسی معاملات میں بھی اور سیاسی امور میں بھی، اس لیے کہ دین وشریعت مکمل ہیں، جن میں سب کچھ ہے۔لہٰذا تمام امور میں اللہ کی بندگی اور رسول اللہ کی پیروی لازم وضروری ہے۔

شریعت میں ظاہری وباطنی دونوں قسم کے احکام ہیں

دین کے دو اہم اور بنیادی حصے ہیں، ایک کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے اور دوسرے کا تعلق باطنی اعمال سے ہے۔

ظاہری اعمال جیسے نماز، روزہ، حج، زکاۃ، وغیرہ، اور باطنی اعمال جیسے اخلاص تواضع، حُب خداوندی، عشق محمدی، خوفِ الٰہی، توکل، انابت، خشیت، تقویٰ وغیرہ، جس طرح ہم کو ظاہری عبادات واعمال کا مکلّف بنایا گیا ہے، اسی طرح ہم کو باطنی عبادات واعمال کا بھی مامور کیا گیا ہے اور قرآن وحدیث میں بے شمار نصوص، اس پر دلالت کرتی ہیں۔

مثلاً اخلاص کی ضرورت واہمیت اور اس کے بالمقابل ریاء وسمعہ کی مذمت اور برائی، قرآن وحدیث میں جگہ جگہ آئی ہے۔اور یہ اخلاص قلبی عمل وعبادت ہے اور ریاءکاری قلبی مرض وبیماری ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ﴾

(البینۃ : ۵)

(اور لوگوں کو حکم نہیں دیا گیا؛ مگر اس بات کا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ دین کو خالص اللہ کے لیے کردیں اور یہ کہ اسی کی طرف توجہ کرنے والے ہوں۔)

اس آیت میں بتایا گیا کہ عبادت میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے۔

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْن ، اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَاؤُنَ﴾ (الماعون: ۵)

(پس ان نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں اور جو ریا کاری کرتے ہیں۔)

اس آیت میں ریا کاری سے عبادت کرنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے اور وعید سنائی گئی ہے۔

اسی طرح حدیث کی طرف آیئے، ایک حدیث میں فرمایا:

”اللہ تعالیٰ اعمال میں سے نہیں قبول کرتا؛ مگر صرف وہ جو خالص اس کے لیے ہو۔“(۱)

اور ریا کاری کی مذمت میں آیا ہے:

”رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اور لوگوں میں شہرت کے لیے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن لوگوں میں ذلیل ورسوا کریں گے۔“(۲)

---

(۱) الترغیب: ۱/۵۵

(۲) الترغیب: ۱/۶۵-۶۶

اسی طرح محبت خداوندی اور عشق نبوی ضروری ہے، بغیر اس کے ایمان کا تحقق ہی نہیں ہوسکتا، پھر یہ اللہ ورسول کی محبت، ساری محبتوں پر غالب ہونا بھی لازم ہے، بغیر اس کے ایمان کامل نہیں ہوتا، چناں چہ قرآن وحدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرة : ١٦٥)

(جولوگ ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔)

اور حدیث میں ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ (حوالہ اوپر گذر چکا)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عرض کیا کہ یارسول اللہ:

« لَاَنْتَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِلَّانَفْسِيَ الَّتِيْ بَيْنَ جَنْبِي. »

(کہ آپ میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میرے نفس کے جو کہ میرے پہلو میں ہے۔)

آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مجھے اپنے نفس سے زیادہ محبوب نہ سمجھے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب اُتاری ہے۔ میرے نزدیک آپ میرے نفس سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ نے اس پر فرمایا کہ: اَلْاٰنَ يَا عمر رضی اللہ عنہ ! کہ ہاں اب بات بنی اے عمر رضی اللہ عنہ۔(١)

---

(١) بخاري :٦٦٣٢، احمد: ٣٥٥ / ٤

معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت شدید و غالبہ ہونا، مطلوب ہے اور یہ بھی عملِ قلب ہے۔

اسی طرح حیا ہے، جس کے بارے میں حدیث میں ہے:

« اَلْحَيَاءُ مِنَ الْإِيْمَان. »

(کہ حیاء ایمان کا جزء ہے۔)(۱)

اور اس کے بالمقابل بے حیائی کی مذمت آئی ہے، چناں چہ آپ نے فرمایا کہ انبیاء سابقین کی جو بات لوگوں تک پہنچی ہے ان میں سے ایک یہ کہ اگر تجھے حیا ہی نہ ہو تو جو چاہے کر۔(۲)

معلوم ہوا کہ حیاء اسلام میں پسندیدہ عمل ہے۔ اور بے حیائی و بے شرمی، ناپسندیدہ عمل ہے۔ اور اس عمل کا تعلق بھی قلب و دل سے ہے۔

اسی طرح خوف خداوندی ایک محبوب و مطلوب عمل ہے۔ اور بے خوفی ایک خوفناک عمل، قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَاخْشَوْنِيْ ﴾ (البقرۃ: ۱۵۰)

(کہ مجھ سے ڈرو۔)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے:

« مَنْ خَافَ اَدْلَجَ وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ، اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ. » (۳)

---

(۱) بخاري الايمان: ۲۴، مسلم: ۵۲، ترمذي: ۲۵۴۰، نسائي: ۴۹۴۷

(۲) بخاري: ۳۴۸۳، ابو داؤد: ۴۱۶۴، ابن ماجه: ۴۱۷۳، احمد: ۱۶۴۷۰

(۳) ترمذي: صفة القيامة: ۲۳۷۴

(جس نے خوف کیا، وہ رات ہی سے چلنا شروع کردیا۔اور جو
رات سے چلا تو منزل کو پہنچ گیا، سن لو کہ اللہ کا سودا گراں ہے۔اور سن لو
کہ اللہ کا سودا جنت ہے۔)

اس میں خوف کا فائدہ بتایا ہے کہ خوف کرنے والا پہلے ہی تیار ہو کر چل پڑتا ہے، اسی طرح اللہ سے خوف کرنے والا، پہلے ہی سے نیکی کی طرف چل پڑتا ہے، نیز ایک طویل حدیث میں ان سات افراد کا ذکر کیا گیا ہے، جن کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دی جائے گی، ان میں سے ایک وہ بھی ہے جو اللہ کے ڈر سے روتا ہو۔[۱]

معلوم ہوا کہ خوف خداوندی، ایک پسندیدہ اور مطلوب عمل ہے، اسی طرح توکل رضا بالقضاء، تواضع، وغیرہ صفات حمیدہ مطلوب ہیں اور ان کے بالمقابل بری صفات مذموم وممنوع ہیں، جن کی تفصیل قرآن وحدیث میں موجود ہے، غرض کہ جس طرح ہم ظاہری عبادات واعمال کے مکلّف ہیں اسی طرح ہم باطنی عبادات واعمال کے بھی مکلّف ہیں، جیسا کہ اوپر کی وضاحت وتفصیل سے معلوم ہو گیا۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب یہ بات سمجھ لیں کہ شریعت کے اسی باطنی حصہ کی تحصیل اور ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کا نام سلوک وتصوف ہے۔

میرے مرشد اول حضرت مسیح الامت رَحِمَہُ اللّٰہُ اپنی کتاب شریعت وتصوف میں فرماتے ہیں:

''شریعت کا وہ جُز جو اعمال باطنی سے متعلق ہے، تصوف وسلوک
کہلاتا ہے......گویا کہ تصوف دین کی روح ومعنی یا کیف وکمال کا نام

(۱) بخاري، الرقاق: ۶۴۷۹، مسلم الزكاة: ۱۷۱۲، ترمذي، الزهد: ۲۳۱۳، نسائي: آداب القضاء: ۵۲۸۵، احمد: ۹۲۸۸، مالک: ۱۵۰۱

ہے، جس کا کام باطن کو رذائل یعنی اخلاق ذمیمہ، شہوت، آفات لسانی، غضب، حقد، حسد، حب دنیا، حب جاہ، بخل، حرص، ریاء، عُجب، غرور سے پاک کرنا اور فضائل یعنی اخلاق حمیدہ، توبہ، صبر، شکر، خوف، رجا، زہد، توحید وتوکل، محبت، شوق، اخلاص، صدق، مراقبہ، محاسبہ وتفکر سے آراستہ کرنا ہے، تاکہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے جو مقصود حیات ہے۔‘‘(۱)

سلوک کی ضرورت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ دین کے دو اجزا ہیں اور دونوں ہی کے ہم مکلّف ہیں۔ تو اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دین کے ان دونوں اجزا پر جب تک عمل نہ ہوگا ہماری دین داری نامکمل وناقص ہے؛ لہٰذا دینداری میں کمال بدون سلوک میں داخل ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضروری ہے کہ ہر مومن اعمال وعبادات ظاہرہ کے ساتھ ساتھ، اعمال وعباداتِ باطنہ کی تحصیل میں بھی لگے؛ اس لیے کہ دونوں ہی فرض وضروری ہیں۔ بل کہ فی الواقع اعمال باطنہ، اعمال ظاہرہ کے لیے بمنزلہ روح کے ہیں مثلاً نماز کے ظاہری ارکان، (قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، وغیرہ) اور آداب وسنن کے ساتھ، اگر روحِ اخلاص نہ ہو اور خشوع وخضوع نہ ہو تو وہ نماز، بے روح ڈھانچہ کی طرح ہے۔ اسی طرح اور عبادات واعمال کا مقصود بھی وہی باطنی اعمال ہیں۔ اس لیے اس کی تحصیل کے لیے آدمی کو پوری توجہ اور ہمت سے کام لینا چاہئے۔

(۱) شریعت وتصوف:۱/۹۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلوک میں مجاہدہ کی اہمیت

اوپر کی تفاصیل نے یہ واضح کر دیا کہ کوئی آدمی اس راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر و باطن کو شریعت کے مطابق کرنے اور بنانے کا عزم و ارادہ کر کے قدم آگے بڑھا رہا ہے، جو کہ ایک مبارک عزم اور خوش آئند اقدام ہے، اسی قصد و عزم اور کوشش و محنت کو شریعت میں مجاہدہ کہتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدۂ کامیابی ہے۔ چناچہ فرمایا گیا:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (العنکبوت: ٦٩)

(جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ضرور ان کو ہمارے راستے دکھاتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔)

اس آیت کے بارے میں علما کے دو قول ہیں، بعض نے اس سے کفار سے جہاد کرنا مراد لیا ہے۔ (۱)

اور بہت سے علما نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ جہاد نہیں؛ بل کہ اس سے مراد جہاد با لنفس ہے؛ چناں چہ حضرت ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا یہ آیت عرفی جہاد کے حکم سے

(۱) تفسیر قرطبي: ۱۰/۱٦۱

پہلے نازل ہوئی ہے اور اس سے مراد اللہ کے دین اور اللہ کی مرضیات کی طلب میں کوشش ومجاہدہ ہے اور ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ آیت میں صرف جہاد بالکفار مراد نہیں ہے؛ بل کہ دین کی نصرت اور باطل پرستوں کی تردید اور ظالموں کا قلع قمع کرنا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی اس میں داخل ہے اور اس میں اللہ کی اطاعت میں نفس کا مجاہدہ بھی داخل ہے۔ اور یہ جہاد اکبر ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ہماری اطاعت میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو ہمارے ثواب کا راستہ بتاتے ہیں۔ (۱)

غرض یہ کہ اس آیت میں مجاہدہ کا ذکر ہے اور اس پر وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راستہ کھولے گا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ منزل مقصود تک اس کو پہنچایا جائے گا؛ کیوں کہ راستہ دکھانا اور کھولنا تو اسی لیے ہوتا ہے کہ منزل تک رسائی ہو ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَقُوْلُ اللهُ تَعَالىٰ: اَنَا عِنْدَظَنِّ عَبْدِیْ ، فَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ نَفَسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ وَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَكَرْتُهٗ فِیْ مَلَاءٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ وَاِنْ تقَرَّبَ اِلَیَّ بِشِبْرٍ تقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِ رَاعاً وَاِنَّ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعاً تقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعاً وَاِنْ اَتَانِیْ يَمْشِیْ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً. »

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں میرے بندے کے گمان کے پاس ہوں جو وہ مجھ سے رکھتا ہے۔ (یعنی میں اس کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں) اگر وہ مجھ کو یاد کرتا ہے تو اس کے ساتھ

---

(۱) تفسیر قرطبي: ۱۳/۳۶۴-۱۳/۳۶۵

ہوتا ہوں، اگر وہ مجھ کو دل میں یاد کرتا ہے، تو میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ کو کسی مجمع میں یاد کرتا ہے، تو میں اس کو اس سے بہتر (فرشتوں کے) مجمع میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے، تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ (۱)

اس حدیث پاک میں جو فرمایا کہ جو اللہ کی طرف قریب ہوگا یا چلے گا تو اس سے مراد وہی مجاہدہ ہے: کہ آدمی مجاہدہ کے ذریعہ جب اللہ سے قریب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے قریب ہوتے ہیں یعنی اپنی رضا و ثواب سے نوازتے ہیں علمائے سلوک و اولیائے اللہ نے فرمایا کہ بغیر مجاہدہ کے اس راہ میں کامیابی نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ۔

چناں چہ امام قشیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”جان لو کہ جو آدمی اپنے ابتدائی مرحلہ میں صاحب مجاہدہ نہیں ہوتا وہ اس راہ کی بُو بھی نہیں پا سکتا۔“(۲)

امام قشیری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”جس آدمی نے یہ گمان و خیال کیا کہ بغیر مجاہدہ و ریاضت کے اس راہ میں سے کچھ اس پر کھول دیا جائے گا تو وہ غلطی میں ہے۔“(۳)

اسی سلسلے میں حضرت حسن القزاز رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

---

(۱) بخاري: ۷۴۰۵، مسلم: ۴۸۳۲، ترمذي: ۳۵۲۷، احمد: ۸۹۸۳، ابن ماجه مختصراً: ۳۸۱۲

(۲) رساله قشيريه: ۱۳۳

(۳) رساله قشيريه: ۱۳۴

''یہ راستہ (سلوک وتصوف کا) تین باتوں پر مبنی ہے، ایک یہ کہ بغیر سخت حاجت کے نہ کھائے، دوسری یہ کہ بغیر نیند کے غلبہ کے نہ سوئے اور تیسری یہ کہ بغیر ضرورت کے نہ بولے۔ (۱)

غرض یہ کہ آدمی جب تک کھانے پینے اور نیند کی قربانی دے کر اور زبان کو قابو میں رکھ کر مجاہدہ نہ کرے گا، اس وقت تک یہ راستہ طے نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اے سالک اگر تو نے اس راہ کو طے کرنا پسند کیا ہے اور اللہ کا قرب اور اس کی رضا چاہتا ہے تو مجاہدہ کر اور آگے بڑھ۔

مجاہدہ کی حقیقت

مجاہدہ کے معنی ہیں ''نفس کی مرادات اور مرضیات کے بہ جائے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرادات و مرضیات پر چلانے کی کوشش کرنا'' اس کے دو اجزاء ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر نفس کو چلانا، اگر چہ نفس ان پر چلنا نہ چاہے اور ایسی باتوں کو مامورات کہتے ہیں۔ پھر یہ مامورات بھی دو قسم کے ہیں: ایک ظاہر سے متعلق دوسرے باطن سے متعلق، جن کی تفصیل اوپر عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے یہ کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے نفس کو بچانا اور دور رکھنا، ایسی باتوں کو منہیات کہتے ہیں، پھر یہ منہیات بھی دو قسم کے ہیں ایک ظاہر سے متعلق جیسے: سود، جھوٹ، رشوت، شراب نوشی، زنا کاری

(۱) رسالہ قشیریہ: ۱۳۴

وغیرہ، دوسرے باطن سے متعلق جیسے ریاء کاری، بے خوفی، تکبر، حسد، کینہ، بغض وعداوت، حبِ دنیا، حب جاہ، حرص، بخل، غرور وعجب وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ اللہ ورسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جن باتوں کو اختیار کرنے اور بجالانے کا حکم دیا ہے۔ان پر نفس کو چلانا اور پابند بنانا اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے بچانا اور دور رکھنا، مجاہدہ کہلاتا ہے اور اس کو جہاد اکبر بھی کہتے ہیں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

« اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ لِلّٰهِ. » (۱)

(مجاہد وہ ہے جو اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرے۔)

علامہ مناوی رَحِمَهُ اللهُ نے علامہ علائی رَحِمَهُ اللهُ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور اس کی سند جید ہے۔(۲)

اس حدیث میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مجاہد اس کو قرار دیا ہے جو اپنے نفس سے اللہ کے لیے جہاد کرے اور ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک دفعہ جہاد سے واپسی پر صحابہ کرام سے فرمایا کہ:

« رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ. » (۳)

(ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔)

غرض یہ کہ کفار کے ساتھ جہاد سے بھی بڑا جہاد نفس کا مقابلہ کرنا ہے کیوں کہ جو آدمی نفس کے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ غیروں کو اللہ کے دین کی طرف لانے کی

---

(۱) كتاب الزهد لابن المبارك: ۴۶۳، ترمذي: ۱۵۴۶، احمد: ۲۲۸۲۶

(۲) فيض القدير: ۲۶۲/۶

(۳) تخريج الاحياء للعراقي: ۷/۳

کیا کوشش کرے گا اوران کا کس طرح مقابلہ کرے گا؟

لہٰذا سالک کو چاہئے کہ نفس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کو اللہ کے اوامر پر آمادہ کرے اور شہوات وخواہشات سے اس کو روک کر رکھے یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے حضرت ابوالعباس السیاری رَحمۃُ اللہ سے پوچھا گیا کہ مرید اپنے نفس کے ساتھ کس چیز کے ذریعہ مجاہدہ وریاضت کرے؟ فرمایا کہ اوامر پر جمے رہے ممنوعات سے بچنے اور صالحین کی صحبت اور فقراء کی خدمت سے۔(۱)

یہیں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سالک کو جہاں اوامر کی اطاعت وتعمیل ضروری ہے وہیں ممنوعات ومحرمات سے پرہیز بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ نیکیاں تو کر لیتے ہیں؛ مگر گناہوں سے نہیں بچتے سالک کے لیے یہ سخت مضر ہے۔ اگر نیکیاں غذا اور دوا کی طرح ہے تو گناہوں سے بچنا پرہیز کی طرح ہے۔ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کی بتائی ہوئی غذا اور دوا تو پابندی سے کھائے؛ مگر جو پرہیز کی چیزیں بتائی گئیں ان سے نہ بچے تو اس کو کب صحت ہوسکتی ہے؟ اس لیے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ نیک کام تو اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگ کر لیتے ہیں، چناں چہ نماز جس طرح نمازی پڑھتا ہے، بہت سے شرابی، کبابی بھی پڑھ لیتے ہیں؛ مگر گناہ سے بچنا صرف متقی وپرہیزگار لوگوں کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اللہ کی ولایت صرف متقی لوگوں کو ملتی ہے۔ چناں چہ فرمایا گیا:

﴿اِنْ اَوْلِیَاءُ وہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الأنفال: ۳۴)

(اللہ کے دوست صرف وہ ہیں جو گناہ سے پرہیز کرتے ہیں۔)

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نیکی وعبادت کا نور اسی وقت باقی رہتا ہے جب کہ

(۱) رسالہ قشیریہ: ۷۰

گناہوں سے بچا جائے ،ورنہ وہ نور زائل ہوجاتا ہے ؛بل کہ بعض گناہوں کے اثر سے نیکیاں سوخت ہوجاتی ہیں، جیسے حسد کہ اس کے بارے میں حدیث میں ہے:

« إِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ. »[1]

(حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔)

مرشدنا حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب رحمہ اللہ ایک دفعہ کار میں بیٹھ کر تشریف لے جارہے تھے، سخت گرمی تھی اور کار میں اے۔سی۔(A.C) بھی چالو کردیا گیا؛ مگر بہت دیر ہونے کے باوجود ٹھنڈک پیدا نہیں ہوئی تو ڈرائیور نے کہا کہ کوئی دریچہ کا گلاس پوری طرح بند نہیں ہوگا اسی لئے اے،سی کام نہیں کررہا ہے۔ چناں چہ دیکھا گیا تو ایک طرف کا گلاس تھوڑا سا کھلا ہوا تھا جب اس کو بند کیا گیا تو اے،سی نے فوراً اپنا کام شروع کردیا۔اور کار میں ٹھنڈک آگئی اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ اس واقعہ سے عبرت لیجئے کہ جب تک یہ دریچہ کھلا تھا کار میں ٹھنڈک نہیں آئی اسی طرح اگر آنکھوں اور کانوں وغیرہ کے یہ دریچے اور شیشے کھلے رہیں گے تو دل میں ایمان کی ٹھنڈک محسوس نہیں ہوسکتی۔لہٰذا حرام چیزوں سے ان آنکھوں اور کانوں اور زبان وغیرہ کو بند رکھنا چاہیے۔غرض گناہوں سے بچنا بھی سالک کا اہم کام اور مجاہدہ کا اہم جز ہے۔خواہ وہ ظاہری گناہ ہوں یا باطنی گناہ ہوں۔

---

(۱) ریاض الصالحین: ۴۷۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سالک کا پہلا قدم-توبہ

جب کسی اللہ کے بندے کو اللہ تعالیٰ اس راستہ کی طرف رہنمائی فرمائیں اور اس کے دل میں اس کا جذبہ پیدا فرمائیں تو سب سے پہلے اس کو اپنی پچھلی زندگی سے توبہ کرنا چاہیے، توبہ سالکین کے منازل میں سے اول منزل اور طالبین کے مقامات میں سے اولین مقام ہے۔

توبہ کی فضیلت وضرورت بے شمار آیات واحادیث سے ثابت ہے؛

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَتُوبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّہَ الْمُوْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (نور:۳۱)

(تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو، اے مومنو! تاکہ تم کامیاب ہوسکو۔)

اور حدیث میں ہے کہ:

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو اور اس سے گناہوں کی معافی چاہو کہ میں بھی دن میں سو دفعہ توبہ کرتا ہوں۔ (۱)

ایک اور حدیث میں ہے:

---

(۱) مسلم: ۱۴۸۷۱، احمد: ۱۷۱۷۳

« اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوْبَ مُسِيْئُ النَّهَارِ، وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوْبَ مُسِيْئُ اللَّيْلِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا. »

(اللہ تعالے رات میں (اپنی رحمت کا ہاتھ) پھیلاتے ہیں تاکہ دن کا گنہ گار توبہ کرلے اور دن میں ہاتھ پھیلاتے ہیں تاکہ رات کا گنہ گار توبہ کرلے (یہ توبہ کا سلسلہ چلتا رہے گا) یہاں تک کہ سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہو۔)(۱)

لہٰذا سب سے پہلے آدمی کو اپنے تمام صغیرہ و کبیرہ کھلے و چھپے ظاہری و باطنی گناہوں سے توبہ کرنا چاہئے، توبہ کی حقیقت تین چیزیں ہیں:

(۱) اپنے گناہوں پر ندامت و پشیمانی کا احساس۔

(۲) تمام گناہوں سے فی الفور فی الحال دوری و علاحدگی۔

(۳) آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم اور پختہ ارادہ۔(۲)

جب آدمی سچے دل سے اس طریقہ پر توبہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس بندہ کو معافی و بخشش عطا فرماتے ہیں اور اس سے راضی و خوش ہوجاتے ہیں، چناں چہ حدیث میں ہے کہ:

اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ پر جب کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کرے، اس آدمی سے زیادہ خوش ہوتے ہیں جو جنگل میں اپنی سواری پر تھا اور اس پر اس کا کھانا پینا بھی تھا پس وہ سواری گم ہوگئی، وہ آدمی مایوس ہوکر ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گیا۔ اسی

(۱) مسلم: ۴۹۵۴، احمد: ۱۸۷۰۸

(۲) رياض الصالحين: ۱۱، رساله قشيريه: ۱۲۸

درمیان اس نے دیکھا کہ اس کی وہ سواری اس کے پاس کھڑی ہے۔ اور خوشی میں اس اونٹنی کو پکڑا اور خوشی کے غلبہ میں غلطی سے کہنے لگا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب۔

(اس بندے کی خوشی سے زیادہ اللہ کو توبہ پر خوشی ہوتی ہے۔)(۱)

ایک حدیث میں ہے:

« اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لاَ ذَنْبَ لَهُ. »(۲)

(کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو۔)

غرض سچے دل سے توبہ کرنے کی ضرورت ہے بغیر اس کے آگے بڑھنا ممکن نہیں؛ بعض لوگ صحیح طریقہ سے توبہ کئے بغیر آگے بڑھنا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں پھر جب ترقی نہیں دیکھتے تو مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں؛ لہٰذا ہر سالک کو چاہیے کہ وہ سب سے اول قدم وسیڑھی سمجھ کر صحیح طور پر توبہ کرے۔

توبہ کے بارے میں علما فرماتے ہیں:

"گناہ دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن سے حقوق اللہ میں فتور وخلل پڑ جاتا ہے دوسرے وہ جن سے حقوق العباد میں خلل ہو جاتا ہے، جہاں تک حقوق اللہ سے متعلق گناہوں سے توبہ ہے تو وہ اللہ سے ندامت کے ساتھ سچے دل سے معافی مانگنے سے ہو جائے گی اور ان میں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج کے ادا کرنے میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کو اب ادا کر دینا چاہئے، نمازوں کا حساب لگا کر روزانہ کچھ نہ کچھ نمازیں

(۱) مسلم: ۴۹۲۹، بخاری: ۶۳۰۸، ترمذی: ۶۴۲۲

(۲) ابن ماجہ: ۴۲۴۰

قضاء پڑھ لے اسی طرح روزے جو چھوٹ گئے ہوں ان کی قضا کرے اور زکوٰۃ ادا کرنے میں غفلت ہوئی ہو تو جتنے سالوں کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو جلد اس کو ادا کردے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہ کیا ہو تو جلد سے جلد اس کو بھی ادا کردے۔ اسی طرح تمام عبادات کا جائزہ لیکر ان کی کوتاہیوں کا تدارک کرے۔''

اور رہے وہ حقوق جن کا تعلق بندوں سے ہے ان کی کوتاہیوں سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے معافی کے ساتھ ان لوگوں سے بھی معافی مانگنا چاہیے جن کی حق تلفی کی ہے۔ مثلاً کسی کی غیبت کی تھی تو اس سے بھی معافی مانگے جس کی غیبت کی ہے؛ اسی طرح اگر کسی کی کوئی چیز غصب یا چوری کی ہو تو اس کو معافی کے ساتھ واپس کرے، یہ ہے توبہ کا مکمل طریقہ جس کو حضرات علماء نے بیان کیا ہے۔

توبہ کرنے کے بعد (جیسا کہ اوپر حدیث کی روشنی میں بتایا گیا) آدمی گناہوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے؛ لیکن اس کے بعد اگر پھر کچھ گناہ ہو جائے تو سالک کو چاہئے کہ فوراً توبہ و استغفار کرے۔ مایوس ہو کر تعطلی کا شکار نہ ہو جائے۔ بعض سالکین توبہ کر کے کام شروع کرتے ہیں اور دوبارہ یا سہ بارہ گناہوں کا صدور ہو گیا تو شیطان ان کو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتا ہے وہ یوں سمجھاتا ہے کہ تو نے توبہ کی پھر توبہ کو توڑ دیا۔ اب پھر کس منہ سے اللہ کی جناب میں جائے گا؟ اور کیسے تیری معافی ہوگی؟

غالبؔ کو شیطان نے یہی پٹی پڑائی تھی، چناں چہ غالبؔ نے کہا تھا ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ شعر مایوسی بلکہ تعطلی پیدا کرتا ہے اور دراصل شیطانی وسوسہ ہے اس کے مقابلہ میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ کے یہ اشعار سالک کو مشعل راہ بنانا چاہئے فرماتے ہیں ۔

میں اسی منہ سے کعبہ جاؤں گا
شرم کو خاک میں ملاؤں گا
ان کو رو رو کے میں مناؤں گا
اپنی قسمت کو یوں بناؤں گا

لہٰذا سالک کو مایوس نہ ہونا چاہئے؛ بل کہ گناہ کے بعد پھر اسی در پر آنا اور گڑ گڑانا اور معافی مانگ کر اس اللہ کو منانا چاہئے اور رو رو کر منانا چاہئے اور شرم کو خاک میں ملانا چاہئے۔

ابو علی دقّاق رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرید نے توبہ کی پھر چند دنوں بعد برائی کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے بعد ایک دن غور کرنے لگا کہ اگر میں پھر توبہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس پر غیب سے آواز آئی کہ: یا فلاں!

’’ اَطَعْتَنَا فَشَکَرْنَاکَ، ثُمَّ تَرَکْتَنَا فَاَمْھَلْنَاکَ، وَاِنْ عُدْتَّ اِلَیْنَا قَبِلْنَاکَ‘‘.

(اے فلاں! تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم نے تجھے جزاء دی پھر تو نے ہم کو چھوڑ دیا تو ہم نے تجھ کو مہلت دی اور اگر تو پھر ہماری طرف لوٹ آئے گا تو ہم تجھے قبول کرلیں گے۔)

حضرت یحیٰ بن معاذ رحمۃ اللہ نے اللہ سے یوں عرض کیا:

’’اے اللہ! میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے توبہ کی اور پھر گناہ نہ کروں گا کیوں کہ میں میری فطرت کو جانتا ہوں اور نہ میں اس بات کی ضمانت

دیتا ہوں کہ گناہ چھوڑ دوں گا؛ کیوں کہ میں میرے ضعف وکمزوری کو جانتا ہوں؛ لیکن میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میں پھر گناہ نہیں کروں گا کہ ہوسکتا ہے کہ دوبارہ گناہ سے پہلے میں مرجاؤں۔ (اور وعدہ پر قائم رہ جاؤں۔)(1)

غرض یہ کہ اگر سالک سے گناہ ہوجائے تو مایوس نہ ہو اور اپنی عاجزی اور ضعف وکمزوری کو اللہ کے سامنے پیش کرے کہ اے اللہ میں اتنا کمزور ہوں اور بدخلقی و بد اطواری کا شکار ہوں کہ بار بار توبہ توڑ رہا ہوں اور پھر بھی وعدہ تو نہیں کرسکتا کہ پھر گناہ نہ کروں گا مگر عزم کیے لیتا ہوں کہ نہ کروں گا۔

بہ ہر حال! اللہ کے دربار کو چھوڑا نہیں جاسکتا بے شرم بن کر پھر وہیں آنا ہے اور اللہ کو یہ ادا پسند آتی ہے۔

سالک کے لیے علم دین ضروری ہے

اس راہ کے سالک کو علم شریعت کے حاصل کیے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ وہ جس راہ پر چلنے کے ارادہ وعزم سے قدم بڑھا رہا ہے وہ راستہ شریعت و دین ہی کا راستہ ہے اور وہ قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہے لہٰذا دین وشریعت کا علم جب تک نہ ہوگا کوئی اس راہ کو طے نہیں کرسکتا۔

جاہل صوفیوں نے اپنی جہالت سے یہ سمجھا اور سمجھایا ہے کہ یہ راہ سلوک وتصوف قرآن وحدیث سے ہٹ کر کوئی اور علم ہے اور وہ سینہ بسینہ آتا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے چالیس پارہ ہیں اور دس پارے تصوف ومعرفت کی

(1) رسالہ قشیریہ: ۱۳۱

باتوں پر مشتمل ہیں اور وہ عام لوگوں کو نہیں دئے گئے اور یہ تیس پارے شریعت کے علم پر مشتمل ہیں؛ مگر یاد رکھو یہ باتیں کافرانہ و جاہلانہ ہیں اور یہ لوگ دراصل صوفی نہیں شیطانی ہیں جو اولیائے اللہ اور صوفیائے کرام کے بھیس میں لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں جو اصلی و حقیقی صوفیاء کرام ہیں ان کے نزدیک قرآن و حدیث اور شرع شریف اصل ہے جس سے دین کے سارے امور نکلتے ہیں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ہمارا یہ راستہ و طریقہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے اصولوں سے مقید ہے۔

نیز فرمایا کہ ”جس نے قرآن پاک حفظ نہ کیا اور حدیث نہ لکھا اس کی اس راستہ میں اقتداء نہیں کی جائے گی۔ کیوں کہ ہمارا یہ (تصوف کا) علم کتاب و سنت سے مقید ہے۔(۱)

اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”شریعت کے تین جزء ہیں۔علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں جزء نہ پائے جائیں شریعت متحقق نہیں ہوتی اور جب شریعت متحقق ہوگئی تو حق تعالیٰ سبحانہ کی رضا جو تمام دنیوی و اخروی سعادتوں سے فائق و اعلی ہے وہ بھی متحقق ہوگئی یعنی حاصل ہوگئی اس لیے کہ شریعت تمام دنیوی و اخروی سعادتوں کی ضامن و کفیل ہے۔اور کوئی مطلب و مقصود ایسا نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان اس کا محتاج ہو طریقت و حقیقت جس سے صوفیہ ممتاز ہیں دونوں شریعت کی خادم ہیں ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جزء اخلاص کی تکمیل ہوتی ہے لہٰذا ان دونوں سے بھی مقصود شریعت کی تکمیل ہے۔نہ کوئی اور امر جو شریعت کے علاوہ ہو۔“(۲)

---

(۱) رسالہ قشیریہ: ۵۱

(۲) مکتوبات: ۱/۳٦

معلوم ہوا کہ علم شریعت اصل ہے اور اسی سے حقیقت و طریقت کے اسرار و رموز بھی معلوم ہوتے ہیں اور علم شریعت کے بغیر کوئی شخص اس راہ کو قطعاً طے نہیں کر سکتا۔ مشہور صوفی و بزرگ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں:

''علم و عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں لہٰذا علم کے ساتھ عمل ہمیشہ پیوست رہنا چاہیے۔ اسی طرح بغیر علم کے عمل رائیگاں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« اَلْمُتَعَبِّدُ بِلاَ فِقْهٍ کَالْحِمَارِ فِی طَاحُوْنَةٍ. »

(بے علم عبادت گذار اس گدھے کی مانند ہے جو آٹے کی چکی سے بندھا ہوا ہو) چکی سے بندھا ہوا گدھا اگرچہ دوڑتا ہے؛ مگر وہ اپنے محور ہی میں گھومتا رہتا ہے اور کوئی مسافت طے نہیں کر پاتا۔)(۱)

اسی طرح ایک اور بزرگ اور صوفی حضرت احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ نے بھی فرمایا ہے ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

''جو عمل و کوشش شریعت کے خلاف کسی اور طریقے پر ہو اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں اگر کوئی عابد پانچ سو برس تک خلاف شریعت عبادت کرتا رہا تو یہ عبادت اسی کے منہ پر ماری جائے گی اور اس کی گردن پر گناہ الگ ہوگا، جس شخص کو احکام دین کی سمجھ حاصل ہو اس کی دو رکعتیں اللہ کے نزدیک جاہل درویش کی دو ہزار رکعتوں سے افضل ہیں۔''(۲)

---

(۱) کشف المحجوب: ۳۷

(۲) ارشادات حضرت رفاعی: ٦٧

معلوم ہوا کہ حضرات صوفیا کے نزدیک بھی بغیر علم شریعت کے کوئی اس راستہ کو طے نہیں کرسکتا۔

نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے:

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ.» (۱)

(علم کا طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔)

اور علم کا حاصل کرنا مختلف صورتوں سے ہوتا ہے کسی عالم سے سبقاً سبقاً کوئی دینی کتاب پڑھے یا اس کی مجلس میں پابندی سے بیٹھ کر بغیر کتاب کے سن سن کر حاصل کرے یا کسی عالم سے پوچھ پوچھ کر حاصل کرے وغیرہ۔ غرض کسی بھی صورت سے علم دین ضرور حاصل کرے۔ حضرت احمد کبیر رفاعی رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا ہے اور اگر کسی جاہل کو ولی بناتے ہیں تو اس کو عالم بنا دیتے ہیں؛ ولی، دین کے علم سے جاہل نہیں ہوسکتا۔ بل کہ وہ خوب جانتا ہے کہ نماز کس طرح پڑھنا چاہیے، زکوٰۃ کس طرح دینا چاہیے، حج کس طرح کرنا چاہیے۔'' (۲)

اور جو بعض جاہل صوفی شریعت اور طریقت کو الگ الگ قرار دے کر دھوکہ دیتے ہیں؛ اس کے بارے میں بھی حضرت رفاعی رَحِمَہُ اللہُ کا ارشاد سُن رکھو کہ:

''طریقت'' شریعت کا عین ہے؛ مگر بعض لوگ اولیائے اللہ پر تہمت لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طریقت اور شریعت الگ الگ ہیں۔'' (۳)

(۱) ابن ماجہ: ۲۲۰، مشکوۃ: ۳۴

(۲) ارشادات رفاعی: ۷۰

(۳) رموز رفاعیہ: ۳

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

تم ایسا مت کہو جیسا بعض جاہل صوفی کہا کرتے ہیں کہ ہم اہل باطن ہیں اور علما اہل ظاہر ہیں۔ یہ بات غلط ہے، کیوں کہ دین ظاہر و باطن دونوں کا جامع ہے اس کا باطن، ظاہر کا مغز ہے۔ اور ظاہر، باطن کا ظرف ہے یعنی اس کا محافظ ہے۔ (۱)

اوپر کی تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ اس راہِ سلوک میں کتاب وسنت ہی کا علم رہبری کرے گا اور یہ کہ شریعت وطریقت آپس میں متخالف ومتضاد نہیں ہیں؛ بل کہ شریعت کے ایک جزء کا نام طریقت ہے، لہٰذا اے سالک ان جاہل صوفیا کی باتوں سے ہرگز دھوکہ نہ کھانا جو شریعت کو چھوڑ کر زندگی گزارتے اور احوال وکوائف اور وجد واستغراق کے دعوے کرتے اور کرتب دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو نماز و دیگر عبادات معاف ہوگئیں ہم معرفت والے ہیں، حضرات صوفیا نے بار بار اس پر تنبیہ کر دی ہے، کہ اس سلوک سے سوائے اتباع شریعت وحصول رضا کچھ مطلب نہیں ہے اور جو لوگ مذکورہ دعوے کرتے ہیں ان کی باتوں میں نہ آنے کی تلقین وہدایت کی ہے۔

حضرت ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ نے فرمایا:

”جو شخص اللہ کے ساتھ ایسے حال وتعلق کا دعویٰ کرے جو اس کو علم شرعی کی حدود سے باہر کردیتا ہے تو تو اس کے قریب بھی ہرگز نہ جانا۔“ (۲)

معلوم ہوا کہ شریعت کے خلاف کوئی حال وکیفیت کا دعویٰ کرے تو وہ صوفی نہیں ہے؛ بل کہ شیطانی ہے۔ لہٰذا اس کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے سامنے ایک شخص نے معرفت کی بات

---

(۱) ارشاد رفاعي: ٦٧

(۲) الرسالة القشيريه: ٥٣

چھیڑی اور کہا کہ اہل معرفت اس حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ نیکی وعبادت اور قرب خداوندی کے کاموں (نماز، ذکر، وغیرہ) کو ترک کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ عبادات ان سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا:

''یہ ان لوگوں کا کہنا ہے جو اعمال وعبادات کے ساقط ہونے کی بات کرتے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ بڑا گناہ ہے اور جو شخص چوری کرتا اور زنا کرتا ہے وہ اس کہنے والے سے اچھا ہے۔''

نیز آپ نے فرمایا کہ یہ راہ سلوک مخلوق پر بند ہے۔ سوائے اس شخص کے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی اتباع کرتا ہو۔ (۱)

غرض یہ کہ اصل چیز اتباع سنت وشریعت ہے، جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا اور اس کے بغیر کچھ بھی حاصل نہ ہوگا؛ لہٰذا سالک کو علم شریعت سے سستی وغفلت ہرگز نہ کرنا چاہیے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مدرسہ میں داخلہ لے کر مکمل مولوی و عالم بننا ضروری ہے بلکہ مراد ضروری امور کی تحصیل ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

عقائد سے متعلق توحید وصفات باری تعالیٰ آخرت، تقدیر، رسالت ونبوت کے مسائل جاننا ضروری ہے؛ پھر نماز وروزہ کے احکام اور اگر مالدار ہو تو زکوۃ کے مسائل واحکام اور جس پر حج فرض ہو، اس کو حج کے احکام اور جو تاجر ہو تو خرید وفروخت کے مسائل جاننا لازم ہے، اسی طرح صنعت پیشہ وملازمت پیشہ لوگوں پر اس کام سے متعلق احکام کا جاننا ضروری ہے، اسی طرح نکاح، طلاق کے مسائل جاننا اس پر ضروری ہے۔ جو نکاح کرنا چاہتا ہو، نیز اخلاق سے متعلق علم ضروری ہے جیسے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ: ۵۰

اخلاص، تواضع، وغیرہ تا کہ تکبر وریا سے بچ سکے، اسی طرح حسد، کینہ بغض وغیرہ کا جاننا بھی ضروری ہے تا کہ ان اخلاقی برائیوں سے بچ سکے۔(۱)

ان باتوں کی تفصیل علما سے پوچھ لینا چاہیے تا کہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور آدمی جاہل نہ رہے اور عبادت رائیگاں نہ جائے۔

(۱) شامی: ۴۲/۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ کامل کی تلاش

سلوک وطریقت کا یہ راستہ نازک ولطیف راستہ ہے جس کا مقصد قرب و رضائے حق کا حصول ہے؛ اس کے لیے کسی متبع سنت شیخ کامل کی رہبری ورہنمائی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ دین کے اور علوم اور دنیا کے مختلف فنون میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے کہ ان کا حصول اور ان میں مہارت، ماہر علم وفن کی رہبری ورہنمائی سے ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا حتیٰ کے بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز کوئی خوشنویس نہیں ہوسکتا۔ غرض بدون کسی کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں ہوسکتا؛ اسی کو کہا ہے:

صحبتِ صالح ترا صالح کند ☆ صحبتِ طالح ترا طالح کند
ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا ☆ گو نشیند در حضور اولیاء
یک زمانہ صحبتے با اولیاء ☆ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء
صحبتِ نیکاں اگر یک ساعت است ☆ بہتر از صد سالہ زہد وطاعت است

مطلب یہ کہ نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک بنادے گی، اسی طرح بد بخت کی صحبت تم کو بد بخت بنادے گی جو شخص خدا تعالیٰ کی ہم نشینی کا طالب ہو تو اس کو اولیائے کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہئے اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت سو سالہ بے ریا طاعت سے بہتر ہے نیکوں کی صحبت اگر ایک گھڑی بھی نصیب ہو جائے تو وہ سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ جس طرح دنیوی فنون اور دینی علوم سب میں سنت اللہ یہی ہے کہ رہبر واستاد کی رہنمائی میں حاصل ہوتے ہیں اسی طرح راہ سلوک بھی جو کہ لطیف ونازک راہ ہے کسی کی رہبری ورہنمائی میں طے ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ ﴾

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔)

اس میں اس جانب واضح اشارہ ہے کہ تقویٰ کا حصول جو کہ راہ سلوک کی اساس اور رأس ہے؛ صادقین کی معیت وصحبت کے ذریعہ ہوتا ہے اور صادقین وہ ہیں جو قولاً فعلاً وحالاً ہر طرح اپنے اندر صدق وسچائی رکھتے ہوں۔

حضرت مرشدی مسیح الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی، اقوال کو بھی اور احوال کو بھی، اقوال کا صدق یہ ہے کہ بات پکی اور سچی ہو، یعنی واقعہ کے مطابق ہو، جو شخص اس صفت سے موصوف ہو، اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو، حکم شرعی کے

(۱) شریعت وتصوف: ۱/۱۱۱

خلاف نہ ہو، پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہتے ہیں اور احوال کا صدق یہ ہے کہ احوال سنت کے مطابق ہوں پس جو احوال خلاف سنت ہیں وہ احوال کاذبہ ہیں اور جس کے احوال و کیفیات سنت کے مطابق ہوتے ہیں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔‘‘(۱)

پس جو شخص ایسا ہو کہ اس کی زبان بھی شریعت کے مطابق چلتی ہے۔ اس کا عمل بھی شریعت کے موافق ہے اور اس کے احوال و کیفیات بھی شریعت کے دائرہ میں ہیں تو ایسا آدمی ’’صادق‘‘ کہلاتا ہے، اس کی صحبت و معیت مفید و معین ہوگی اور تقوی کا راستہ اس سے معلوم ہوگا۔

یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے: خواہ اچھی صحبت ہو یا بری، چناں چہ حدیث میں ارشاد ہے کہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّمَا مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ وَ جَلِيْسِ السُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَنَافِخِ الْكِيْرِ فَحَامِلُ الْمِسْكِ، إِمَّا أَنْ يُّحْذِيَكَ وَإِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَ إِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيْحًا طَيِّبَةً وَنَافِخُ الْكِيْرِ إِمَّا اَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ وَإِمَّا اَنْ تَجِدَ رِيْحًا مُنْتِنَةً. »

(نیک اور برے ساتھی کی مثال ایسی ہے جیسے عطر والا اور لوہار، عطر والا یا تو تجھ کو عطر دے گا یا تو خود اس سے خرید لے گا۔ یا (کم ازکم) اس کی خوشبو پائے گا۔ اور رہا لوہار تو وہ یا تو تیرے کپڑے جلادے

(۱) شریعت وتصوف:۱/ ۱۸۳

گا،یا(کم ازکم)اس (کی بھٹی) کی بدبوتو محسوس کرے گا۔(۱)

اس حدیث سے صالح و نیک آدمیوں کی صحبت ومعیت کا فائدہ وفضیلت اور بُری اور گندی صحبتوں کی بُرائی ونقصان بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا اچھی و نیک صحبت اور اولیائے اللہ ومقربان خداوندی کی معیت اختیار کرنا چاہئے اور شریعت کے خلاف اور سنت کے خلاف چلنے والوں کی صحبت سے دور رہنا چاہیے۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی رحمہ اللہ نے اپنے شعر میں فرمایا کہ

تنہا نہ چل سکیں گے محبت کی راہ میں
میں چل رہا ہوں، آپ میرے ساتھ آیئے

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

یعنی اللہ سے قرب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے کہ اللہ سے قرب وتعلق رکھنے والوں سے تعلق وربط پیدا کیا جائے۔اس شعر میں ملنے سے مراد قرب وتعلق ہے نہ کہ ظاہری طور پر ملنا۔

بہ ہر حال یہ معلوم ہوا کہ راہ سلوک کے طے کرنے کے لیے، کسی کامل شیخ کی رہبری حاصل کرنا چاہیے۔

شیخ کامل کی پہچان

جب شیخ کامل کی تلاش کرو تو یہ نہ دیکھو کہ وہ صاحب کرامت وصاحب کشف

(۱) بخاري :۲۱۰۱،مسلم: ٦٨٦٢،احمد: ١٨٧٩٨،و اللفظ لمسلم

ہے یانہیں؛ بل کہ یہ دیکھو کہ وہ متبع سنت وشریعت ہے یانہیں؟ بعض لوگ اس نکتہ کو نہ جاننے کی وجہ سے بہت دھوکہ کھاتے اور آخرالامر محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے یہاں شیخ کامل کی پہچان کے لیے چند علامات لکھی جاتی ہیں، جو بزرگوں نے بیان فرمائی ہیں؛ ان کے مطابق کوئی مل جائے تو اس کو رہبر بنانا چاہیے۔

چناچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اپنے رسالہ ''قصد السبیل'' میں فرمایا کہ:

پیر کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں۔

(۱) ضرورت کے موافق دین کا علم ہو۔

(۲) عقیدے، عمل اور عادتیں اسکی شرع کے موافق ہوں۔

(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔

(۴) کسی پیر کامل کے پاس کچھ دنوں تک رہا ہو۔

(۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش (اللہ والے) منصف مزاج ہوں، وہ اس کو اچھا جانتے ہوں۔

(۶) عام لوگوں کی نسبت خاص لوگ یعنی جو سمجھدار اور دیندار ہیں۔ وہ اس کے زیادہ معتقد ہوں۔

(۷) اس کے مریدوں میں اکثر مرید شرع کے پابند ہوں اور ان کو دنیا کی طمع نہ ہو۔

(۸) وہ پیر اپنے مریدوں کی تعلیم دل سے کرتا ہو۔ اور چاہتا ہو کہ یہ درست ہو جائیں اور اگر مریدوں کی کوئی بری بات دیکھتا یا سنتا ہو تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۹) اس کے پاس چند روز بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی معلوم ہوتی ہو۔

(۱۰)وہ خود بھی ذکر و شغل کرتا ہو۔(۱)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے ان علامات کے بعد ایک اہم ضروری بات پر متنبہ کیا ہے۔فرماتے ہیں:

"جس شخص میں یہ نشانیاں موجود ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کرامت بھی ہوتی ہے یا نہیں، یا پوشیدہ یا آئندہ ہونے والی باتیں اس کو معلوم ہوتی ہیں یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے، وہ قبول ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ اپنی باطنی قوت سے کچھ کام کر دیتا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ یہ باتیں پیر و ولی کے لیے ہونا ضروری نہیں۔"(۲)

غرض یہ کہ پیر و شیخ میں جو اصل چیز دیکھنا ہے، وہ دین و شریعت کی پابندی واتباع ہے، ہاں اللہ والوں سے کرامت کا ہونا یا کبھی اللہ کی طرف سے کسی واقعہ کا کشف ہونا یا کسی بات کا الہام ہونا، حق ہے۔مگر ولایت کے لیے لازم نہیں ہے۔پھر بزرگوں نے کرامت وغیرہ کو ایسی اہمیت نہیں دی کہ اس پر ولایت کا مدار رکھا جائے۔

حضرت ابو محمد المرتعش رحمۃ اللہ کے سامنے ذکر ہوا کہ فلاں صاحب پانی پر چلتے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس و خواہش کے خلاف چلنے پر قدرت دے دیں، وہ ہوا میں چلنے والے سے زیادہ عظیم ہے۔(۳)

حضرت ابو یزید بُسطامی رحمۃ اللہ نے فرمایا:

"اگر تم کسی کو دیکھو کہ وہ کرامات دیا گیا ہے، حتیٰ کہ وہ ہوا میں اڑتا

---

(۱) از تسہیل قصد السبیل:۱۶

(۲) تسہیل قصد السبیل: ۱۶

(۳) رسالہ قشیریہ: ۴۷

ہے تب بھی اس سے دھوکا نہ کھانا۔ جب تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ تم اس کو
اللہ کے حکم اور نہی اور حدودِ شرعیہ کی حفاظت اور شریعت کے سامنے
جھک جانے کے سلسہ میں کیسا پاتے ہو؟ (۱)

لہٰذا جو اصل چیز ہے، اس کو دیکھنا چاہئیے اور شیخ کامل کی تلاش کے لیے اس کو معیار بنانا چاہیے۔

شیخ کے حقوق وآداب

سلوک کے اہم مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ متبع سنت شیخ کا انتخاب کرنے کے بعد شیخ کے حقوق وآداب بھی پورے طور پر بجالائے؛ کیوں کہ شیخ جو کہ اللہ کا راستہ بتانے والا ہے، اس کی حیثیت باپ کے جیسی ہے، جس طرح علم ظاہر کی تعلیم دینے والے استاذ کی حیثیت ہوتی ہے، باپ اگر جسمانی تربیت واصلاح وترقی کا واسطہ وذریعہ ہے تو شیخ روحانی وباطنی تربیت واصلاح وترقی کا ذریعہ ووسیلہ ہے؛ لہٰذا جس طرح باپ کے پھر استاذ کے حقوق وآداب ہیں اسی طرح شیخ کے بھی حقوق وآداب ہیں، جن کی رعایت و حفاظت ضروری ہے، بغیر رعایت ادب کے آدمی محروم رہ جاتا ہے۔

بے ادب محروم گشت از فضل رب

اس لیے شیخ کے چند اہم حقوق وآداب نقل کئے جاتے ہیں۔

مرشدی حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ نے ''شریعت وتصوف'' میں تفصیل سے ان حقوق وآداب کو بیان فرمایا ہے، یہاں چند کا خلاصہ پیش ہے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۳۰/۱۱

(۱) اپنے شیخ سے عقیدت ہونا چاہئے؛ بغیر عقیدت ومحبت۔ظاہر ہے کہ۔کوئی خاص فائدہ وفیض حاصل نہیں ہوسکتا؛ اس عقیدت کالازمہ یہ ہے کہ کسی اور طرف توجہ نہ کرے کہ فلاں اور فلاں کے پاس بھی چکر کاٹتا پھرے، صوفیا اس کو وحدتِ مطلب سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) مرشد و مصلح کی پوری طرح اطاعت کرے اور دین وشریعت پر چلانے کے لیے وہ جن باتوں اور تدبیروں کی ہدایت کرے، اس کو پورے وثوق سے عمل میں لائے۔

(۳) شیخ سے بدگمانی نہ کرے، ویسے بدگمانی تو کسی سے بھی جائز نہیں۔لیکن شیخ سے بدگمانی کی وجہ سے آدمی اس کے فیوض وبرکات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۴) شیخ کی عظمت وادب بہت کرے، اس کے سامنے، زور سے نہ بولے، نہ اس پر اعتراض کرے، اس کی طرف پیر نہ کرے، اس کی جگہ پر نہ بیٹھے۔اس سے اونچی جگہ پر نہ بیٹھے مجلس میں اس کی طرف ہمہ تن متوجہ رہے؛ اِدھر اُدھر مشغول نہ ہو، اس کہ مجلس میں کسی سے بات چیت نہ کرے۔

(۵) جس قدر ہو سکے، شیخ کی خدمت میں رہنے کی کوشش کرے، بلاضرورت اس سے الگ نہ ہو۔

(۶) اس کی ناراضی وخفگی سے کے اسباب سے بچنا چاہیے۔

بہ ہر حال اس نازک واہم رشتہ کو اس کی نزاکتوں کے ساتھ نباہنا چاہئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ سے استفادہ کا طریقہ

شیخ سے استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حالات (اچھے یا بُرے) سب کے سب پوری امانت و دیانت کے ساتھ شیخ کے سامنے رکھ دے اور اس امید پر نہ رہے کہ شیخ کو کشف ہو جائے گا، یا الہام سے پتہ چل جائے گا، کیوں کہ اولاً تو شیخ کو کشف والہام ہونا ضروری نہیں (جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے) اور اگر ہو بھی تو ضروری نہیں کہ شیخ اس کے بھروسہ کسی کا علاج کرے؛ لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ پوری امانت داری سے اپنے حالات شیخ کے سامنے رکھ دے اور اس میں کوتاہی نہ کرے۔

بعض لوگ بیعت تو ہو جاتے ہیں؛ مگر کوئی اصلاحی تعلق اپنے شیخ سے نہیں رکھتے ایسی بیعت نام کی بیعت ہے؛ اصل بیعت یہی ہے کہ شیخ سے اصلاحی تعلق رکھے اور اپنے احوال پیش کر کے، اصلاح کا طالب ہو اور شیخ کی باتوں پر عمل کرے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے ایک مرید نے جب کچھ دنوں اپنے حال احوال سے مطلع نہیں کیا، تو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس کو یہ خط لکھا:

> ”برادرم خواجہ جمال الدین حسین رحمہ اللہ نے مدت سے اپنے احوال کی کیفیت سے اطلاع نہیں دی، آپ نے سنا نہیں کہ مشائخ اس مرید کو جو تین دن تک اپنے احوال و واقعات کو اپنے شیخ کی خدمت میں

عرض نہ کرے۔ کفِ پا'' فرماتے ہیں۔ خیر جو کچھ ہوا، پھر ایسا نہ کریں
اور جو کچھ ظاہر ہوتا رہے لکھتے رہا کریں۔''(۱)

معلوم ہوا کہ شیخ کو اپنے احوال کی اطلاع اور پھر اس کی اتباع، مرید کے لیے ضروری ہے تا کہ وہ روز بروز روحانی ترقی کرتا رہے۔

اس کو یوں سمجھا جائے جیسے مریض، اپنے احوال و بیماری کے حالات ڈاکٹر وطبیب کو بتاتا ہے اور اس میں کوئی عار و شرم محسوس نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی شرم کرکے، ڈاکٹر کو اپنی بیماری نہ بتائے، تو کبھی اس کا علاج نہیں ہو سکتا: مثلاً ایک آدمی بیمار ہو اور وہ ڈاکٹر کے پاس جائے؛ مگر ڈاکٹر کو اپنی بیماری نہ بتائے؛ بل کہ اس کے برخلاف، یہ بتائے کہ میں بڑا تندرست ہوں، مجھے کوئی بیماری نہیں ہے تو کیا ڈاکٹر اس کا علاج کرے گا؟ ہر گز نہیں، اسی طرح اگر کوئی مرید اپنے روحانی امراض و احوال نہ بتائے تو شیخ اس کا کیا علاج کرے گا؟ اور اگر مرید خدانخواستہ بیماری کو چھپا کر، اپنا صحت مند وتندرست ہونا، ظاہر کرے تو یہ اور خطرناک ہے۔ غرض یہ کہ یہ سلوک کا راستہ دراصل ایک طب روحانی ہے اور شیخ معالج و ڈاکٹر ہے اور مرید مریض ہے؛ لہٰذا مریض کو چاہیے کہ اپنے احوال و امراض کی شیخ کو اطلاع کرکے اس سے علاج معلوم کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

حضرات صحابہ کرام، رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح اپنے احوال پیش کر کے اصلاح چاہتے تھے۔

مثلاً حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز و قرأت کے

(۱) مکتوب: ۱/۲۲۳

درمیان حائل ہوجاتا ہے اور نماز کو خلط ملط کردیتا ہے۔ (یعنی وسوسہ ڈال کر خشوع و خضوع میں اور وظائف نماز میں گڑبڑ کر دیتا ہے)۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایک شیطان ہے جس کو خنزَب کہا جاتا ہے۔ پس جب اس کو محسوس کرو تو اللہ کی پناہ چاہو، اور اپنے بائیں طرف تین بار تھُتکار دو، حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو وہ شیطان مجھ سے دور ہوگیا۔ (۱)

ایک دفعہ چند اصحاب حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اپنے دل میں ایسے ایسے وسوسے اور خیالات پاتے ہیں کہ ان کو زبان پر لانا بہت بڑے گناہ کی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو صریح ایمان کی علامت ہے۔ (پریشان نہ ہونا چاہئے۔ (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک آدمی چھپ کر عمل کرتا ہے اور جب لوگ اس پر مطلع ہوجاتے ہیں تو اس پر اس کو خوشی ہوتی ہے۔ (کہیں یہ اخلاص کے خلاف تو نہیں؟) آپ نے فرمایا کہ اس کو دو اجر ملیں گے ایک چھپا کر عبادت کرنے کا، دوسرا اس کے ظاہر ہوجانے کا۔ (۳)

علماء نے لکھا ہے کہ دو اجر اس لیے کہ ایک تو وہ عبادت کو اخلاص کی وجہ سے چھپاتا رہا، دوسرے اس لیے کہ وہ ظاہر ہوگئی تو اس سے دوسروں کو ترغیب کا فائدہ ہوا، غرض یہ کہ صحابہ کرام اپنے احوال پیش کرکے اس کا حل چاہتے؛ ایسے متعدد واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔

---

(۱) مسلم: ۴۰۸۳، احمد: ۱۷۲۲۴

(۲) مسلم: ۱۰/۸۸، ابو داؤد: ۴۴۴۷، احمد: ۹۳۱۷

(۳) ترمذي: ۲۳۰۶، ابن ماجه: ۴۲۱۶

احقر نے اس پر ایک مضمون ''اصلاح باطن احادیث کی روشنی میں'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے جو آئینہ مظاہر علوم سہارنپور میں قسطوار شائع ہو رہا ہے۔

بہ ہر حال سالک کو اس میں کوتاہی نہ کرنا چاہیے، حضرت عزیز الحسن مجذوب رحمہ اللہ نے اپنے اشعار میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا قول پیش کیا ہے؛ جس کو یاد رکھنا چاہیے۔

چار شرطیں لازمی ہیں استفاضہ کے لیے
اطلاع واتباع واعتقاد وانقیاد
یہ مقفی قول ہے رنگین بھی سنگین بھی
حضرت مرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد

اس کی شرح بندہ نے ''شفاء القلوب'' میں لکھدی ہے۔ وہاں دیکھا جائے۔

راہِ سلوک سے مقصود، رضاء الٰہی ہے

سالک کو اس راہ پر چلنے سے مقصود، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء ہونا چاہیے، کوئی اور چیز مقصود نہ ہونا چاہیے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« إِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَالِكُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلىٰ دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوْ إِمْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ إِلىٰ مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. »(۱)

(۱) بخاري: ۱، مسلم: ۳۵۳۰، ترمذی: ۱۵۷۱، نسائی: ۴/۷، ابو داؤد: ۸۸۲، ابن ماجہ: ۴۲۱۷، احمد: ۱۶۳

(اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے: اور ہر آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے نیت کی۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ ورسول کی طرف ہے۔ اور جو دنیا کمانے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہجرت کرے تو اس کی ھجرت اسی کی طرف ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔)

لہٰذا راہِ سلوک پر چلنے سے مقصود صرف اللہ کی خوشنودی و رضا ہونا چاہئے نہ کہ کچھ اور، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ ؎

تجھ سے کوئی کچھ کوئی کچھ مانگتا ہے
الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سلوک کو طے کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے سارے دنیوی کام بن جائیں گے؛ کرامت ظاہر ہونے لگے گی، بیٹھے بیٹھے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ وغیرہ؛ مگر یہ بات دل سے نکال کر صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کام کرنا چاہئے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کرامت بھی دے دیں اور سارے مسئلے حل کر دیں تو یہ ان کا انعام ہے۔ مگر سالک کو اس نیت ومقصد سے سلوک میں لگنا نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان باتوں کا حاصل ہونا ضروری ہے۔

مرشدی حضرت مسیح الامت رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''شریعت وتصوف'' میں فرمایا:

''جب حقیقت سلوک معلوم ہوگئی تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس میں نہ کشف وکرامات ضروری ہیں، نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے، نہ دنیا میں کاربرآری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جایا کریں، یا مقدمات، دعا سے فتح ہو جائیں، یا روزگار میں

ترقی ہو، یا جھاڑ پھونک تعویذات سے بیماری جاتی رہے یا ہونیوالی بات بتلادی جایا کرے۔ نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی ازخود اصلاح ہوجائے؛ اس کو گناہ کا خیال بھی نہ آئے، خود بخود عبادت کے کام ہوتے رہیں، مرید کو ارادہ نہ کرنا پڑے، یا ذہن وحافظہ بڑھ جائے، نہ ایسی باطنی کیفیات پیدا ہونے کی میعاد کہ ہر وقت یا عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے؛ عبادت میں کوئی خطرہ ہی نہ آوے، یا یہ کہ خوب رونا آوے، ایسی محویت ہوجائے کہ اپنی پرائی خبر نہ رہے اور نہ ذکر وشغل میں انوار وغیرہ کا نظر آنا، نہ کسی آواز کا سنائی دینا ضروری ہے، نہ اچھے خوابوں کا نظر آنا، یا الہامات کا ہونا ضروری ہے۔ بس اصل مقصود حق تعالیٰ کی رضا ہے اسی کو پیشِ نظر رکھے۔"(۱)

غرض یہ کہ اس راہ میں سوائے رضاءِ الٰہی کہ کوئی چیز مقصود نہیں، بعض سالکین کیفیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، کہ ہم کو رونا آئے عبادت میں لذت ومزہ آئے وغیرہ یہ بھی مقصود نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ دے دیں تو شکر کرنا چاہئے، ورنہ ان چیزوں کو مقصود سمجھکر ان کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

کیوں کہ یہ اخلاص کے منافی وخلاف ہے؛ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

---

(۱) شریعت وتصوف: ۱/۱۰۳، ۱۰۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احوال و کیفیات مقصود نہیں

اس راہ میں چلنے والے کو بعض اوقات اور خاص طور پر ابتداء میں کچھ کیفیات پیش آتی ہیں، مثلاً نماز و ذکر و تلاوت میں خوب جی لگنا اور مزہ و لذت آنا، اپنی پچھلی حالت پر اور اپنے گناہوں پر رونا آنا وغیرہ، سالک کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ساری کیفیات محمود تو ہیں؛ مگر اس راہ کا مقصود نہیں ہیں، مقصود تو رضاء الٰہی ہے اور اس کا راستہ ایمان و اعمال ہیں، اگر ایک بندہ ہر حال و صورت میں اللہ کے لیے شرعی اعمال بجالاتا رہے، تو اس کو ضرور وہ مقصود اعظم یعنی رضاء الٰہی حاصل ہوگی، خواہ یہ کیفیات حاصل ہو یا نہ ہوں؛ اگر سالک ان کیفیات کو مقصود سمجھ کر، ان کے پیچھے پڑ گیا، تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کیفیات کے حاصل نہ ہونے پر مایوس ہو کر اصل کام ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس لیے کیفیات کے بجائے اعمال پر نگاہ رکھنا چاہئے، ہاں اگر کیفیات بھی اعمال کے ساتھ حاصل ہو جائیں تو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش نظر رکھنا چاہئے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ حنظلہ رضی اللہ عنہ منافق ہو گیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا سبحان اللہ! تم کیا کہتے ہو؟ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ گویا ہم ان چیزوں کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں؛ مگر جب بیوی

بچوں اور کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ حالت نہیں رہتی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بخدا میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں، پھر دونوں حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور یہ بات جو دل کو کھٹک رہی تھی، بیان کی، تو آپ نے فرمایا:

«وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْتَدُوْمُوْنَ عَلٰی مَا تَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ وَفِی الذِّکْرِ لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلَائِکَۃُ عَلٰی فُرُشِکُمْ وَفِیْ طُرُقِکُمْ وَلٰکِن یَا حَنْظَلَۃُ! سَاعَۃً وَسَاعَۃً (ثَلٰثَ مَرَّاتٍ). »

(اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تم اس کیفیت پر ہمیشہ رہو، جو میرے پاس ہوتی ہے اور ذکر کے وقت ہوتی ہے، تو تم سے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں، فرشتے مصافحہ کرنے لگیں، لیکن اے حنظلہ رضی اللہ عنہ! یہ (کیفیت) کبھی کبھی ہوتی ہے (یا کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی) تین بار فرمایا۔ [1]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو ہمارے دل نرم ہو جاتے ہیں اور ہم دنیا سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اہل آخرت میں سے ہو جاتے ہیں؛ مگر جب آپ کے پاس سے چلے جاتے اور اپنے اہل وعیال میں مشغول ہو جاتے ہیں تو پھر ہم اپنے آپ کو بھی بُھلا بیٹھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس تم جس حالت میں ہوتے ہو، یہاں سے جانے کے بعد بھی اسی حالت پر باقی

---

(۱) مسلم: ۴۹۳۷، مشکوۃ: ۱۹۷، ترمذي: ۲۴۳۸، ابن ماجه مختصر: ۴۲۲۹ احمد: ۱۶۹۴۹، و اللفظ لمسلم

رہوتو فرشتے تمہارے گھروں میں آکرتمہاری زیارت کریں، (ایک روایت میں مصافحہ کا ذکر ہے)۔(۱)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے فائدہ لکھا ہے:

''سالکین اس سے پریشان ہوجاتے ہیں کہ ہماری فلاں حالت ضعیف ہوگئی، یا فلاں کیفیت زائل ہوگئی، شاید ہم کوتنزل ہوگیا ہواوراس سے مایوس ہوکر شکستہ دل ہو جاتے ہیں، شیوخ کاملین نے ان کی غلطی رفع کرنے کے لیے تحقیق فرمادیا ہے کہ حالات کا غلبہ دائم نہیں ہوتا بالخصوص مبتدی کہ اس کو بہت تغیر وتبدل پیش آتا ہے جس کوتلوین کہتے ہیں اوراہل تمکین کی بھی حالت میں ان کے مرتبہ کے موافق تفاوت ہوتا ہے، اس حدیث سے اس کا بھی اثبات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ساعت کیسی، ایک ساعت کیسی غرض یہ لوازم سلوک سے ہے، ضررنہیں اس سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔''(۲)

غرض یہ کہ سالک کو اعمال پر نظر رکھنا چاہئے، احوال کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے کیوں کہ احوال و کیفیات غیر اختیاری چیزیں ہیں اور اعمال اختیاری ہیں اور پوری شریعت کا مدار افعال واعمال اختیاریہ پر ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ نے ایک صاحب کے خط کے جواب میں اس راہ سلوک کا خلاصہ نہایت جامع الفاظ میں لکھا اوراس تحریر کا نام ''الطّم فی السّم'' رکھا وہ یاد رکھنے کے قابل ہے فرمایا:

---

(۱) ترمذی: ۲۴۴۹، احمد: ۷۰۰۰، مسندی حمیدی: ۱۱۵۰

(۲) التکشف: ۲۶۵

''تمام اصلاح کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کاموں کے پیچھے نہ پڑے جو اس کے اختیار اور قبضہ میں نہ ہوں اور ایسے کاموں میں سستی نہ کرے جو اس کے اختیار اور قبضہ میں ہوں۔ بل کہ اپنی ہمت سے کام لے اور اگر ہمت کے باوجود پھر بھی کچھ کوتاہی ہو جائے تو حق تعالیٰ سے معافی چاہے اور آئندہ کے لیے توبہ کرے۔ اور یہ دعا کرے:
اے اللہ! مجھے اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق دے اسی کا نام اصلاح ہے۔(۱)

اس سلسلے میں حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ کے یہ اشعار بھی یاد رکھنا چاہئے۔ فرماتے ہیں۔

لگا رہ اسی میں جو ہے اختیاری
نہ پڑ امر غیر اختیاری کے پیچھے
عبادت کئے جا مزہ گو نہ آئے
نہ آدھی کو چھوڑ بھی ساری کے پیچھے

نیز فرمایا۔

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں — اس فکر کے پاس بھی نہ جانا
دل لگنا کہاں ہے فرض تجھ پر — تیرا فرض تو ہے دل لگا نا

اس فصل کے آخر میں یہ بات عرض کردوں کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، جب وہ چاہتے ہیں تو کیف وحال کے ذریعہ ترقی دیتے ہیں۔ اور جب چاہتے ہیں، بلا کیف وحال کے ترقی دیتے ہیں اس لیے ہر حال میں ترقی کی فکر کرے اور عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڈھی رحمۃ اللہ کے یہ اشعار پڑھ لیا کرے۔

---

(۱) ماخوذ از تسہیل قصد السبیل: ۵۶

بے کیفی میں بھی ہم نے تو ایک کیف مسلسل دیکھا ہے
جس حال میں بھی وہ رکھتے ہیں اس حال کو اکمل دیکھا ہے
جس راہ کو ہم تجویز کریں اس راہ کو اثقل دیکھا ہے
جس راہ سے وہ لے جاتے ہیں اس راہ کو اسہل دیکھا ہے

اللہ ورسول کی محبت اس راہ کی کنجی ہے

سالک کی ترقی کا ایک بڑا زینہ اور اہم ذریعہ و وسیلہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت شدیدہ ہے، اسی لیے اس کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور تمام چیزوں کی محبت پر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو غالب رکھنے حکم ہے۔

ایک جگہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ آبَاءُ كُمْ وَاَبْنَائُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لاَ يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ ﴾ (التوبۃ: ۲۴)

(آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ وخاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تم کو خطرہ ہے اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو(یہ ساری چیزیں) تم کو

اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری و محبوب ہوں، تو تم منتظر رہو کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں؛ (یعنی تم پر عذاب آ جائے) اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے)
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''الفاظ آیت کا عموم تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ ہونا لازم و واجب ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اس پر غالب نہ آئے اور جس نے اس درجے کی محبت پیدا نہ کی وہ مستحق عذاب ہوگیا، اس کو عذابِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔(۱)

اس سلسلے کی بعض حدیثیں شروع رسالہ میں پیش کی جا چکی ہیں، جن میں اللہ کے رسول سے محبت کو کمال ایمان کا لازمہ قرار دیا گیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا ہے جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے محبت غالبہ وشدیدہ کا سوال کیا ہے؛ محبت کے پیدا ہونے میں اس دعا کو عجیب تاثیر حاصل ہے؛ وہ یہ ہے:

''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ وَاجْعَلْ خَشْیَتَکَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاء عِنْدِیْ وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَائِکَ وَاِذَا اَقْرَرْتَ اَعْیُنَ اَھْلِ الدُّنْیَا مِنْ دُنْیَاھُمْ فَأَقْرِرْ عَیْنِیْ مِنْ عِبَادَتِکَ.'' (۲)

(اے اللہ تیری محبت، میرے نزدیک تمام چیزوں کی محبت

---

(۱) معارف القرآن:۴/۱۱۰

(۲) کنز العمال: ۴/۹۰حدیث:۳۶۴۵

سے زیادہ محبوب بنادے اور تیرا خوف میرے نزدیک تمام چیزوں کے خوف سے زیادہ کردے اور تیری ملاقات کا شوق دے کر دنیا کی حاجات کو مجھ سے منقطع کردے اور جب تو دنیا والوں کی آنکھوں کو دنیا دے کر ٹھنڈا کرتا ہے تو میری آنکھوں کو تیری عبادت سے ٹھنڈک عطا فرما۔)

جب بندہ کو اللہ و رسول کی شدید محبت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کو ایمانی حلاوت و مٹھاس مل جاتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

''تین چیزیں جس میں پائی جائیں، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت پائے گا؛ ایک یہ کہ اس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تمام اور چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں: دوسرے یہ کہ وہ کسی آدمی سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہو: تیسرے یہ کہ کفر کی طرف واپس جانا اس کو ایسا برا اور مکروہ معلوم ہو جیسے کہ اس کو آگ میں ڈالا جانا مکروہ معلوم ہوتا ہے''۔

یہ ایمانی حلاوت جو اللہ و رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی محبت پر عطا ہوتی ہے: وہ کیا چیز ہے؟ علما نے اس کی تفسیر میں تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

(۱) استلذاذ الطاعات.

(۲) تحمل المشاق فيِ الدين.

(۳)ایثار الدین علی أعراض الدنیا. (۱)

اس کی شرح یہ ہے کہ حلاوتِ ایمان تین چیزوں کا نام ہے! ایک یہ کہ طاعتوں اور عبادتوں میں لذت و مزہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ نماز میں، تلاوت میں، ذکر میں، اور

(۱) فتح الباري: ۱/۶۱، فیض القدیر: ۳/ مرقات

دیگر طاعتوں میں عجیب لذت ومٹھاس معلوم ہوتی ہے؛ کسی نے اسی کو کہا ہے ؎

اللہ اللہ چہ شیریں است نام
شیر وشکر شود جانم تمام

دوسری چیز یہ کہ دین کے سلسلے میں مشقتوں کو برداشت کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اور گناہوں سے بچنے میں جو کلفت اور لوگوں کو معلوم ہوتی ہے وہ کلفت یہ بڑی آسانی سے برداشت کر لیتا ہے بلکہ اس کو اس میں مزہ آتا ہے۔

اور وہ بزبان حال یوں کہتا ہے ؎

قیود شرع پہ واللہ سو آزادیاں قربان
کہاں یہ حظ نفسانی کہاں وہ لطف روحانی

اور تیسری چیز یہ کہ دین کو دنیا کے مال ومتاع اور چیزوں پر وہ ترجیح دیتا ہے اس کی نظر میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ لاکھوں روپیوں اور اسباب عیش وسامانِ فخر کو دین کی خاطر لات مار دیتا ہے؛ اس لیے کہ اس کو اللہ ورسول کی محبت حاصل ہے اس محبت میں وہ ہر چیز کو قربان کر سکتا ہے۔

غرض یہ کہ سالک کے لیے قریب ترین راستہ محبتِ الٰہی ومحبت نبوی کا راستہ ہے، مگر اس سے مراد محض دعویٰ ونعرہ نہیں ہے بل کہ سچی محبت ہے اور سچی محبت کی کچھ علامات ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی اور اتباع کی جائے۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ:

تَعْصِی الِالٰہَ وَ انْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ ☆ وَ هٰذا لَعُمْرِی فِی القِیَاس بَدِیْعٗ
لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقاً لَا طَعْتَهٗ ☆ فَاِنَّ المُحِبَّ لِمَنْ یُحِبُّ مُطِیْعٗ

(ترجمہ: یعنی تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے، یہ قسم ہے کہ عجیب بات ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محبّ اپنے محبوب کا تابعدار ہوتا ہے۔)

لہٰذا محض دعویٰ محبت نہیں، بلکہ سچی و پکی محبت کے ساتھ اللہ و رسول کے احکام پر چلنا اور ان کی نافرمانی سے بچنا چاہئے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ کثرت کے ساتھ اللہ و رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ذکر کیا جائے، مشہور ہے:

"مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهُ".

(جو کسی سے محبت رکھتا ہے وہ اس کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔)

لہٰذا اللہ کا ذکر چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے کرتے رہنا چاہئیے، اور اسی طرح نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بھی ہر موقعہ پر یاد کر کے آپ کے افعال و اعمال بلکہ احوال میں بھی آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ایک علامت یہ ہے کہ اللہ و رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعظیم کی جائے، اور دین کی تعظیم کی جائے۔

ایک علامت یہ ہے کہ اللہ والوں اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے خاندان والوں سے بھی محبت رکھی جائے اور اللہ و رسول سے دشمنی کرنے والوں سے بغض ونفرت رکھی جائے: اور ان سے تعلق نہ رکھا جائے۔

یہ سب علامات قرآن و حدیث میں مذکور ہیں ہم نے اختصار کے پیشِ نظر اجمالاً ان کا ذکر کیا ہے۔

بہ ہر حال جب ایسی سچی محبت ہوگی تو ان شاء اللہ سالک ترقی کرے گا اور اس کی برکت سے جلد ہی منزل پر پہنچ جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قربِ فرائض وقربِ نوافل

سالکین کا اس راہ سے مقصود چوں کہ قربِ حق ہوتا ہے، لہٰذا ان کو سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب فرائض وواجبات کی ادائیگی وبجا آوری پر موقوف ہے۔ اس قرب کو قربِ فرائض کہتے ہیں، پھر مزید قرب نوافل کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو قربِ نوافل کہتے ہیں؛ سالک کو دونوں قسم کے قرب کی جستجو کرنا چاہیے۔ حدیثِ پاک میں ان دونوں قسم کے قرب کا ذکر آیا ہے۔

چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ تَعَالیٰ قَالَ مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَاتَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَایَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلَ حَتّٰی اَحْبَبْتُهٗ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهَ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَاوَاِنْ سَأَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنْ استعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ. الخ.» (۱)

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص میرے ولی سے دشمنی رکھتا ہے، میں اس کو جنگ کا اعلان دیتا ہوں۔ اور میرا بندہ میری طرف کسی بھی ایسی چیز سے

---

(۱) بخاري الرقاق: ۶۵۰۲، ابن حبان: ۳۴۷، بیهقي: ۱۵۶/۴، الزهد الکبیر: ۲۶۹/۲

تقرب حاصل نہیں کرتا جو مجھے ان چیزوں سے زیادہ پسند ہو جو میں نے اس پر فرض کی ہیں اور بندہ میری طرف نوافل کے ذریعہ برابر تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں ضرور بالضرور اس کو عطا کرتا ہوں اور جب وہ مجھ سے پناہ چاہتا ہے تو ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔)

اس میں قربِ فرائض و قربِ نوافل دونوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ قربِ فرائض کا مدار فرائض کی پابندی پر ہے؛ فرائض سے کیا مراد ہے؟ ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو ضروری قرار دی گئی ہے، خواہ وہ اوامر کا امتثال ہو یا زواجر یعنی ناجائز کاموں سے پرہیز ہو۔[1]

مطلب یہ ہوا کہ جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان کو انجام دینا اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے بچنا، فرض و ضروری ہے، جب بندہ اوامر کی پابندی اور ناجائز کاموں سے پرہیز کرے گا تو قربِ فرائض میسر آئے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر صرف نیک کام عبادات وغیرہ تو کرتا ہو؛ مگر حرام کاموں سے پرہیز نہ کرتا ہو تو اس کو قرب حاصل نہیں ہوسکتا یہ تو قربِ فرائض ہے۔

اور قربِ نوافل، نوافل و مستحبات و سنتوں کی پابندی سے حاصل ہوگا؛ اور نوافل

---

(۱) مرقات: ۵/ ۵۴

میں خواہ نفل نماز ہو یا ذکر واذکار، تلاوت، ہو یا کسی پر احسان ہو یا حُسن اخلاق کی باتیں ہوں، وغیرہ سب نوافل میں داخل ہیں؛ جب بندہ ان امور کی پابندی کرتا ہے تو اس کو مزید قرب عطا کیا جاتا ہے جس کو قرب نوافل کہتے ہیں۔

اور اس تقرب پر بندہ کو اللہ کی محبت عطا ہوتی ہے؛ جس کی تین علامتیں بتائی گئی ہیں۔

(۱) ایک یہ فرمایا کہ ’’میں اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ پیر بن جاتا ہوں‘‘ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس میں علماء نے تفصیلی کلام کیا ہے؛ راجح قول پر اس کی تفسیر یہ ہے کہ جب بندہ برابر نوافل کی پابندی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بندہ کی گناہوں سے حفاظت کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پیر اور آنکھ و کان سے صرف وہ افعال واعمال صادر ہوتے ہیں جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں، اور اللہ کی ناراضی کے اعمال وافعال سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔لہٰذا وہ کان سے صرف وہ بات سنے گا۔ جو اللہ کو پسند ہے اور آنکھ سے وہی دیکھے گا جو اللہ کو منظور ہے اور ہاتھ سے وہی چیز پکڑے گا جو اللہ چاہتا ہے اور پیر سے اسی طرف چلے گا جہاں اللہ کی رضا ہے۔[۱]

غرض یہ کہ اس قرب کے نتیجہ میں، وہ اللہ کی مرضی وخوشنودی ہی کو مقصودِ زندگی بنائے گا اور اپنے تمام اعضاء وجوارح کو اللہ کی مرضیات ہی کے لیے استعمال کرے گا، اور نامرضیات اور گناہوں سے بچائے گا۔

ایک سوال کا جواب

ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس حدیث میں صرف چار

(۱) مرقات: ۵/۵۵، فتح الباري: ۱۱/۳۴۴، الاسماء والصفات للبيهقي: ۲/۲۵۱، جامع العلوم والحكم: ۱/۳٦٦

اعضاء (کان، آنکھ، ہاتھ و پیر) کا ذکر کیوں ہے، دیگر اعضاء کا ذکر کیوں نہیں؟ جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں دیگر اعضاء کا ذکر بھی آیا ہے، چناچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں زبان اور دل کا ذکر بھی ہے، اسی طرح حضرت ابوامامہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما کی احادیث میں بھی ان کا ذکر ہے۔ (۱)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عموماً انسان کا کاروبار، انہی چار اعضاء سے ہوتا ہے۔لہٰذا ان کی تخصیص کی گئی۔ (۲)

دوسری علامت یہ بتائی گئی کہ یہ محبوب بندہ، اللہ سے جو مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں، اس پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ بہت سے اللہ کے مقرب بندے دعا کرتے ہیں مگر جو مانگتے ہیں وہ ان کو نہیں ملتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قبولیت دعا کے مختلف انداز ہیں۔ کبھی تو بعینہ وہی مطلوبہ چیز عطا کردی جاتی ہے اور کبھی اس کے بجائے اس سے بہتر کوئی چیز دیدی جاتی ہے اور کبھی اس دعا کی برکت سے کسی مصیبت سے بچالیا جاتا ہے اور کبھی اس دعا کو آخرت کے لیے رکھ دیا جاتا ہے، ایک حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری و ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے تو روایت کی ہے، قبولیت دعا کے تین طریقے مذکور ہیں؛ یا تو وہ چیز عطا کی جاتی ہے یا آخرت کے لیے اس دعا کو ذخیرہ بنا دیا جاتا ہے یا کسی برائی کو دفع کردیا جاتا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں گناہ دور کرنے کا ذکر ہے۔ (۳)

تیسری بات یہ فرمائی کہ یہ بندہ اگر اللہ سے پناہ چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور

(۱) نوادرالاصول: ۲/۲۳۳،فتح الباری: ۱۱/ ۲۴۴

(۲) الاسماء و الصفات: ۲/۳۵۱

(۳) احمد عن ابی سعید خدری: ۱۰۷۰۹،ترمذی عن ابی ھریرہ: ۳۵۳۱

پناہ عطا فرماتے ہیں، یعنی جن خوفناک چیزوں سے وہ پناہ چاہتا ہے چاہے وہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی اللہ تعالیٰ اس کو ان چیزوں سے پناہ عطا فرماتے ہیں۔

سالک نتائج کی فکر نہ کرے

سالک کے لیے ایک بہت ہی اہم وضروری بات یہ ہے کہ وہ رضاءِ الٰہی کو اپنے اعمال وعبادات ومجاہدات کا ثمرہ سمجھ کر، مسلسل کام میں لگا رہے اور نتائج کی فکر وجستجو میں نہ پڑے، بہت سے سالکین اس فکر میں پڑ کر ہلاک ہو چکے ہیں؛ کیونکہ شیطان اس ذریعہ سے مایوسی پیدا کر کے کام سے معطل کر دیتا ہے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ کے یہ اشعار ہمیشہ پیش نظر ہونا چاہئے ؎

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در، اس پہ ہو کیوں تیری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

نیز فرمایا ؎

سوچ ماضی کو نہ استقبال کو
ٹھیک رکھ تو بس اپنے حال کو
کیا ہوا کیا ہوگا اس غم میں نہ پڑ
تو عبث سر لے نہ اس جنجال کو

بندے کا کام لگا رہنا ہے، نتائج کا مرتب کرنا، اللہ کا کام ہے، اگر بندہ اپنا کام برابر کرتا رہے گا۔ تو کسی نہ کسی وقت ضرور، اللہ تعالیٰ کا در کھلے گا اور اس کو نواز دے گا،

مگر بندہ کو اس فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اس کو اپنا کام کرتے رہنا چاہئے، یہی دراصل حقیقی بندگی و غلامی ہے۔

راہِ سلوک کی رکاوٹیں

ایک اہم بات سالک کو سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ اس راہ میں بھی مختلف قسم کے چور اور ڈاکو ہیں جو سالک کا متاعِ ایمان و عمل چھین کر، اس کو ہلاک کر دیتے ہیں، ان سے سالک کو بہت چوکنا رہنا چاہیے اور یہ بہت سی چیزیں ہیں اور علمائے سلوک نے ان پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک حوالہ پر اکتفاء کرتے ہیں، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب ''الفوائد'' میں اس پر عمدہ کلام کیا ہے، ہم اسی کو یہاں اپنے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

''علامہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ سیر الی اللہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو بڑے دھوکے اور راستہ کو قطع کرنے والی چیزیں پیش آتی ہیں، پہلے اس کو شہوتوں و لذتوں بڑے بڑے عہدوں، لباس و پوشاک سے دھوکہ لگتا ہے، اگر وہ ان چیزوں میں پھنس کر اسی پر رک گیا تو اس کا راستہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اگر ان چیزوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ گیا اور اپنی خدا طلبی میں سچا رہا، تو اب دوسری طرح کی آزمائش و ابتلاء پیش آتا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس کے پیچھے چلنے لگیں، ہاتھوں کو بوسہ دیا جانے لگے، کسی جگہ پہنچے تو لوگ اس کو اعزاز و اکرام سے جگہ دینے لگیں، دعا کے سلسلہ میں لوگ اس کی طرف اشارہ کرنے لگیں کہ یہ مستجاب الدعاء ہے اور اس کی برکت کی امید کی جانے لگے وغیرہ۔ سالک ان باتوں سے متاثر ہو کر،

انہی چیزوں کو منزل سمجھا اور اسی پر رک گیا تو اللہ کا راستہ منقطع ہو جائے گا اور اس کی ریاضت وعبادت کا یہی چند دنیوی وحقیر چیزیں نتیجہ بنیں گی اور اگر وہ یہاں نہیں ٹھہرا؛ بلکہ ان چیزوں کو لات مار کر آگے بڑھ گیا، تو پھر کشف وکرامات وغیرہ کے ذریعہ اس کی آزمائش ہوتی ہے، سالک اگر انہی چیزوں کو مقصد سمجھ کر رک گیا تو وہ اللہ سے کٹ جائے گا اور یہی کشف وکرامات اس کا حصہ ونصیبہ ہوں گے اور اگر وہ یہاں بھی نہ رکا اور آگے بڑھ گیا، تو پھر ایک اور طرح آزمائش ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کو خلوت وتنہائی سے اُنس، جمعیت قلب ویکسوئی خاطر کی لذت اور دنیا سے فراغت دے کر اس کی آزمائش کی جاتی ہے، اگر وہ انہی چیزوں کو منزلِ مقصود سمجھ کر، یہیں رک گیا تو اللہ تعالیٰ سے کٹ کر رہ جائے گا۔ اور اگر یہاں بھی نہ رکا اور اللہ کی رضا ومراد کی طرف نظر کرتے ہوئے چلتا رہا، تاکہ وہ اللہ کا غلام ہو جائے اور ہر جگہ اور ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات وپسندیدہ چیزوں پر قائم ہو جائے، خواہ وہ تعب وپریشانی میں ہو یا آرام وراحت میں، چاہے وہ نعمتوں ولذتوں میں ہو یا غم والم میں، چاہے اس کو لوگوں میں مشہور کیا جائے یا لوگوں سے مستور رکھا جائے، وہ اپنے لیے کسی خاص حالت کو اختیار نہیں کرتا، سوائے اس حالت کے جو اس کا خدا اس کے لیے پسند کرے۔“(۱)

اس تفصیل نے بتا دیا کہ اس راستہ میں راہ کو قطع کرنے والی اور آزمائش کرنے والی بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، مگر سالک کو چاہئے کہ وہ کسی طرف کو بھی نظر ڈالے

(۱) الفوائد: ۱۹۴

بغیر صرف اللہ کی طرف نظر کرتا ہوا چلتا رہے۔ اس کے سوا کسی بھی منزل کو منزل نہ سمجھے، مولانا روم نے فرمایا ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست
آنچہ بروے میرسی بروے مایست

سالک کے لیے اہم کتابیں

سالک کو دینی واصلاحی کتابوں کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ مگر اس سلسلہ میں اپنے شیخ سے مشورہ کر لینا چاہئے تاکہ مفید کتابیں ہی نظر سے گذریں، آج کل بہت سے بد دین وملحد اور جاہل لوگوں کی کتابیں بھی بازار میں چلتی ہیں۔ اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ ان کو پھیلایا جاتا ہے۔ لہٰذا مطالعہ کرنے میں احتیاط لازم ہے، سالک کے لیے ایک مختصر سی فہرست لکھی جاتی ہے، جو ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔

(۱) تفسیر معارف القرآن — مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ

(۲) معارف الحدیث — مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ

(۳) ترجمہ ریاض الصالحین — علامہ نووی رحمۃ اللہ

(۴) بہشتی زیور — (پانچ حصے)

(۵) مواعظ وملفوظات — (حضرت تھانوی رحمۃ اللہ)

(۶) مواعظ وملفوظات — (حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ)

(۷) مواعظ وملفوظات — (حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ)

(۸) معارف مثنوی — (حکیم اختر صاحب رحمۃ اللہ)

(۹) قصص الاولیا — (مترجم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ)

نوٹ: تفسیر وحدیث بہتر ہے کہ کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور اگر کوئی عالم نہ مل سکیں تو روزانہ دو چار صفحے پڑھ لیں اور جو مقام سمجھ میں نہ آئے اس کو نشان لگا کر رکھ لیں، جب کوئی عالم ملیں تو ان سے پوچھ لیں۔

معمولاتِ سالک

سالک کی ترقی کا ایک اہم اور بڑا ذریعہ و زینہ، معمولات کی پابندی ہے۔ یہاں چند ابتدائی معمولات، ذکر کئے جاتے ہیں، اصل تو یہ ہے کہ طالب و سالک شیخ سے رجوع کر کے اپنے لیے معمولات مقرر کرے۔ اور حسب استعداد، وحسب ضرورت و مصلحت، شیخ اس کے لیے معمولات بتائے۔ اور کمی وبیشی کرتا رہے، یہاں چند عام معمولات ذکر کئے جاتے ہیں۔

نماز باجماعت کا اہتمام

پنج وقتہ نمازوں کی پابندی کرے۔ اور جماعت کا پورا اہتمام کرے اور نمازوں کو خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنے کا التزام کرے، لاپروائی و بے خیالی کے ساتھ ادا نہ کرے۔ کہ یہ منافقین کا طریقہ ہے۔ چناں چہ قرآن پاک میں منافقین کے بارے میں فرمایا کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی و لاپرائی سے کھڑے ہوتے ہیں۔ (مائدہ)

اور مومنوں کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْ مِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾

(المؤمنون ۱-۲)

(تحقیق کہ مومن لوگ کامیاب ہوگئے جو کہ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔)

لہٰذا پوری اہمیت کے ساتھ، اور بشاشت کے ساتھ نمازوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے۔

نمازِ تہجد کا اہتمام

تہجد کا بھی اہتمام کرے، تہجد اگر چہ نفلی نماز ہے۔مگر ہر زمانہ کے اولیاء اللہ کا خاص معمول رہا ہے۔اور یہ تمام نوافل میں سب سے اہم و افضل ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیام لیل (تہجد کی نماز) کولازم پکڑلو، کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ رہاہے اور تمہارے لیے قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا کفارہ اور برائیوں سے روکنے والی چیز ہے۔(۱)

لہٰذا اس کی پابندی کرنا چاہئے، اگر چہ دو رکعت ہی سہی، اور جتنا زیادہ ہو، اچھا ہے، تہجد کی زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت سنت سے ثابت ہیں۔

عجز و نیاز، گریہ وزاری

تہجد کے وقت یا جب بھی موقعہ ہو، اللہ تعالیٰ کے سامنے رونا، گڑگڑانا، عاجزی وانکساری کرنا، ایک بہترین عبادت ہے۔قرآن پاک میں ایک جگہ خاص بندوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

﴿اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ (آل عمران : ۱۷)

(جو صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، عبادت کرنے

---

(۱) مشکوۃ: ۱۰۹

والے، اللہ کے لیے خرچ کرنے والے اور صبح کے وقت استغفار کرنے
والے ہیں۔)

اللہ تعالیٰ کا عاشق، صبح کے وقت اللہ کے سامنے گڑگڑائے، راتوں کو اٹھکر روئے اور پلائے، یہ اللہ کو پسند ہے، وہ کیا اللہ کا عاشق، جو راتوں میں اس کو نہیں پکارتا اور اس کی یاد میں نہیں روتا۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

لَقَدْ هَتَّفَتْ فِیْ جُنحِ اللَّیْلِ حَمَامَۃٌ
عَلٰی فنن وَھنًا وَاِنِّی نَائِمُ
کَذَبْتُ وَرَبِّ الْبَیْتِ لَوْ کُنْتُ عَاشِقًا
لَمَا سَبَقَتْنِیْ بِا لْبُکَاءِ الحَمَائِمُ
وَاَزْعُمُ اَنِّیْ ھَائِمٌ ذُوْ صَبَابَۃٍ
لِرَبِّی وَلاَ اَبْکِیْ وَتَبْکِیْ الْبَھَائِمُ

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ کبوتری رات کے حصہ میں ڈالی پر بیٹھ کر روتی ہے۔ اور میں سوتا رہتا ہوں، کعبہ کے رب کی قسم میرا دعوی عشق جھوٹا ہے۔ اگر میں عاشق خدا ہوتا تو، رونے وگڑگڑانے میں کبوتر مجھ پر سبقت نہ کرتے، میرا دعویٰ ہے کہ میں میرے رب کا عاشق ہوں۔ حالاں کہ روتا نہیں اور جانور اللہ کے عشق میں روتے ہیں۔

غرض یہ کہ سالک کو ایک معمول یہ بنانا چاہئے کہ اللہ تعالےٰ کے سامنے روئے گڑگڑائے۔ رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنالے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے ''کہ روؤ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنالو'' (۱)

نیز سالک کو اللہ تعالیٰ کے خوف سے بھی رونا چاہئے، ایک حدیث میں آیا ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مَامِنْ عَبْدٍ مُوْمِنٍ یُخْرُجُ

(۱) ابن ماجہ: ۱۳۲۷

مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوعٌ وَإِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ثُمَّ يُصِيبُ شَيْئاً مِنْ حُرِّ وَجْهِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ.» (۱)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندۂ مومن کہ اس کی آنکھوں سے اللہ کی ڈر کی وجہ سے آنسو جاری ہوگئے اگر چہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہوں اور وہ اس کے چہرہ پر لگ جائے تو اللہ اس کو دوزخ پر حرام کردے گا۔)

ذکر اللہ کی عادت

ذکر اللہ کا خوب اہتمام کرے کہ یہ مفتاح سلوک ہے اور قرآن وحدیث میں ذکر اللہ کی اہمیت وفضیلت بڑے اہتمام سے بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کے لیے فضائل ذکر (مصنفہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ) کا مطالعہ کیجیے۔

چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اور اپنے کام کاج کے ساتھ ذکر اللہ کی مشق کرنا چاہئے اور حضرات صوفیائے کرام نے اس دوام ذکر کی مشق کے لیے بارہ تسبیح کا معمول تجویز کیا ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ چار زانو باادب، خشوع وخضوع کے ساتھ قبلہ رخ بیٹھے اور اکیس مرتبہ استغفار پڑھے، پھر سات بار درود شریف پڑھے، پھر تین مرتبہ یہ دعا پڑھے۔

"اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ عَنْ غَيْرِكَ وَنَوِّرْ قَلْبِيْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ اَبَدًا يَا اللّٰه يَا اللّٰه يَا اللّٰه."

(اے اللہ میرے دل کو غیر اللہ سے پاک کردے اور میرے

---

(۱) ابن ماجه: ۴۱۸۷، مشکوٰۃ: ۴۵۸

دل کو تیری معرفت کے نور سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منور و معمور کردے۔)

اس کے بعد خوب دھیان کے ساتھ دوسو مرتبہ ''لا الہ الا اللہ'' کا ذکر اس طرح کرے کہ سر کو سینہ کے بائیں جانب دل کے برابر لاکر ''لا الہ'' کہتے ہوئے سر کو بائیں جانب کندھے کی طرف کرکے ذرا سا جھٹکا دے اور یہ تصور کرے کہ غیر اللہ کی محبت دل سے نکال کر پھینک رہا ہوں، پھر ''الا اللہ'' کہتے ہوئے دل پر ہلکی سی ضرب لگائے اور یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آرہی ہے، ذکر کے درمیان پانچ دس مرتبہ پر ''محمد رسول اللہ'' بھی ملالے، یہ دو تسبیح (دوسو مرتبہ) ہوئیں۔

پھر چار تسبیح (یعنی چار سو مرتبہ) ''الا اللہ'' کا ذکر کرے اور دل پر ہلکی ہلکی ضرب لگاتا جائے اور اللہ کی محبت کا تصور قائم رکھے۔

پھر چھ تسبیح (چھ سو مرتبہ) ''اللہ اللہ'' کا ذکر کرے اور اس میں سینہ کے دائیں و بائیں دونوں طرف ضرب لگائے، یا پہلے لفظ اللہ پر دل پر ضرب اور دوسرے لفظ اللہ پر اوپر کی جانب سر کرکے ضرب لگائے۔

پھر ایک تسبیح (سو مرتبہ) صرف لفظ ''اللہ'' کا ورد کرے اور سینہ پر ضرب لگاتا جائے اور اپنی بے بسی، مجبوری، ومحتاجی کا اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور جلالت و بزرگی کا تصور رکھے۔

یہ کل تیرہ تسبیحات ہیں؛ مگر عرف میں ان کا نام بارہ تسبیحات ہے۔

انتباہ: اصل مقصود ذکر ہے اور یہ خاص طریقہ ضرب و شغل کا محض ذکر اللہ کو دل میں اتارنے اور بٹھانے کی ایک تدبیر و ترکیب ہے، جو تجربہ سے مفید و نافع معلوم ہوئی ہے اور اسی وجہ سے صوفیاء و اولیاء اللہ نے اس کو اختیار فرمایا ہے، جیسا کہ دین

کے اور بہت سے کاموں میں تجربات کی بناء پر ذرائع و وسائل کے درجہ میں کچھ چیزوں کو اختیار کیا جاتا ہے؛ مگر یہ ذرائع و وسائل مقصود نہیں ہوتے، اسی طرح اصل مقصد ذکر اللہ ہے اور یہ اشغال، محض ذرائع کے درجہ میں اختیار فرمائے گئے ہیں لہٰذا ان کو مقصود نہ سمجھنا چاہئے اور نہ باعث اجر وثواب، اجر وثواب تو ذکر پر ہے اور اس کا وسیلہ ہونے کی بناء پر، ان وسائل پر بھی ہوسکتا ہے۔

ان مذکورہ اذکار کے علاوہ، روزانہ صبح شام تین تین تسبیح کا معمول بنائے ایک تسبیح ''لا الہ الا اللہ'' کی ایک استغفار کی اور ایک درود شریف کی، اور چلتے پھرتے ''لا الہ الا اللہ'' یا اور کوئی ذکر کرتے رہنا چاہئے۔

تلاوت قرآن مجید کا معمول

قرآن پاک کی تلاوت، افضل الاذکار ہے اور تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے، مشہور ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور پوچھا کہ اے اللہ میں آپ کی قربت چاہتا ہوں، اس کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرو، اس سے میرا قرب حاصل ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« مَثَلُ الْمُؤمِنِ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الْاُتْرُجَّةِ رِیْحُهَا طَیِّبٌ وَطَعْمُهَا طَیِّبٌ وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ لَایَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لَارِیْحَ لَهَا وَ طَعْمُهَا حُلْوٌ. » (۱)

(اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے، نارنگی کی طرح

---

(۱) بخاري: ۵۴۲۷، مسلم: ۱۳۲۸، ترمذي: ۲۷۹۱، نسائي: ۴۹۵۳، ابو داؤد: ۴۱۹۱، ابن ماجه: ۲۱۰، احمد: ۸۷۲۸/ دارمي: ۳۲۲۹

ہے، جس کی بو بھی پاکیزہ اور مزہ بھی عمدہ ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے۔ جس کی کوئی خوشبو نہیں ہوتی؛ مگر مزہ میٹھا ہوتا ہے۔)

ایک حدیث میں ہے:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ؛ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَاجِلاءُ هَا؟ قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلاَوَةِ الْقُرْآنِ. » (۱)

(نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ یہ دل اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب کہ اس کو پانی پہنچے، عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! اس کی صفائی کیا ہے؟ فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی کثرت سے تلاوت کرنا۔)

غرض یہ کہ تلاوت بڑی اہم چیز ہے؛ لہذا روزانہ کچھ نہ کچھ تلاوت کا معمول بنانا چاہئے، غیر حافظ کم از کم پاؤ سیپارہ اور حافظ کم از کم ایک سیپارہ پڑھے۔ اور صبح روزانہ یٰسین شریف اور بعد مغرب سورۂ واقعہ اور سونے سے پہلے سورۂ الٓم سجدہ اور سورۂ ملک اور سوتے وقت آیۃ الکرسی، آمن الرسول، سورۂ قل ھو اللہ احد، سورۂ فلق و سورۂ ناس کا معمول رکھے۔ کہ ان سب کے فضائل احادیث میں وارد ہیں۔ نیز جمعہ کے دن خاص طور پر سورۂ کہف کا اہتمام کرے۔

درود شریف کا اہتمام

روزانہ صبح شام، ایک ایک تسبیح درود شریف کا معمول رکھے اور جمعہ کے دن اس

(۱) مشکوٰۃ: ۱۸۹

کی خوب کثرت کرے احادیث میں درود شریف کے بہت فضائل آئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

''جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ رحمت فرماتے ہیں۔ (۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن مجھ سے قریب ترین وہ آدمی ہوگا جو مجھ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجتا تھا۔'' (۲)

لہٰذا درود شریف کا اہتمام کرنا چاہئے کہ اس سے بھی سالک کو درجات قرب نصیب ہوتے ہیں۔

دعاؤں کا اہتمام

کوئی بھی کام ہو، چاہے دنیا کا یا دین کا، بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد وتوفیق کے نہیں ہو سکتا؛ اس لیے سالک کو اس راستہ کے طے کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے اور دیگر ضروریات وحاجات کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے دعا کی بڑی اہمیت وضرورت وفضیلت ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا:

« اَلدُّعاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ. » (۳)

(دعا عبادت کا مغز ہے۔)

---

(۱) مسلم: ۵۷۷، ترمذي: ۵۳۴۷،نسائي: ۱۷۱۲،ابو داؤد: ۹ ۴۳، احمد: ۶۲۸۰

(۲) ترمذي:۴۴۶،قال حديث حسن غريب، ترمذي: ۳۲۹۳

(۳) ترمذي: ۳۲۹۳

ایک حدیث میں دعا کو رحمت کی کُنجی فرمایا گیا ہے اور ایک حدیث میں مومن کا ہتھیار فرمایا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اشرف العبادۃ دعا ہے۔ نیز فرمایا گیا کہ جو اللہ سے سوال نہیں کرتا۔ اللہ اس پر غصہ ہوتے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ کہتا ہے۔ اے رب! اے رب! تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ اے میرے بندے! حاضر ہوں۔ مانگ، عطا کیا جائے گا۔(۱)

غرض دعا کا اہتمام کرنا چاہئے اور خاص طور پر جو دعائیں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے منقول ہیں، وہ چونکہ اللہ کے نزدیک مقبول بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی ہیں اس لیے ان دعاؤں کو پڑھنے کا اہتمام کیا جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ آپ نے ایسی ایسی باتوں کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے۔ کہ کسی انسان کا ذہن ان باتوں کی طرف نہیں جاتا، پھر یہ دعائیں، نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے کلام ہے جس طرح قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا آپ سے کلام ہے۔ لہٰذا اس کے مقبول ہونے اور موٴثر ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کی ''مناجاتِ مقبول'' یا ملا علی قاری رَحِمَہُ اللہُ کی ''الحزب الاعظم'' جو آپ کی مستند دعاؤں کے مجموعے ہیں۔ ان کی روزانہ ایک ایک منزل کا معمول بنالیا جائے اور پوری منزل مشکل ہو تو کچھ دعائیں ہی دھیان سے پڑھ لیا کرے۔

نفلی روزوں کا اہتمام

رمضان کے روزوں کے علاوہ نفل روزوں کا بھی اہتمام کرنا چاہئے، جس سے خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو کہ سلوک کے لیے لازم

(۱) یہ احادیث کنز العمال: ۲/ ۲۸ تا ۲۹ پر ہیں

ہے، خصوصاً ایام بیض (یعنی ہر ماہ کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ) کے روزے کہ ان کی فضیلت آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ماہ کے تین روزے، پوری زندگی روزہ رکھنے کی طرح ہے۔ (۱)

اللہ کے راستہ میں صدقہ

وقتاً فوقتاً اللہ کی راہ میں صدقہ خیرات بھی کیا کرے، اس سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلسَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِنَ اللّٰهِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّاسِ، قَرِيْبٌ مِنَ الْجَنَّةِ، بَعِيْدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِنَ النَّاسِ بَعِيْدٌ مِنَ الْجَنَّةِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّارِ وَلَجَاهِلٌ سَخِيٌّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِيْلٍ. » (۲)

(سخی، اللہ سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے۔ اور بخیل، اللہ سے دور، لوگوں سے دور، جنت سے دور اور دوزخ سے قریب ہے۔ اور جاہل سخی اللہ کے نزدیک بخیل عابد سے محبوب ہے۔)

ایک حدیث میں ہے کہ سخاوت، اللہ عظمتوں والے کی صفت ہے۔ (۳)

الغرض سالک کو سخاوت کا عادی ہونا چاہیے یہ اللہ کے خاص بندوں کی صفت ہے۔

---

(۱) بخاري: ۱۹۷۹، مسلم: ۱۹۷۳، نسائي: ۲۳۵، ابو داؤد: ۲۰۷۲، احمد: ۶۴۷۱

(۲) كنز العمال: ۱۵۹۲۴

(۳) كنز العمال: ۱۵۹۲۲، ترمذي: ۲۴۴۰، احمد: ۲۵۳۷

مراقبہ ومحاسبہ

روزانہ سونے سے پہلے، مراقبہ کرے: مراقبہ بہت سے امور کا ہوتا ہے: مثلاً اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت کا، جیسے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا خیال کرو، تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔(۱)

اور موت کا مراقبہ کہ میں مر جاؤں گا؛ لوگ مجھ کو دفن کر دیں گے۔قبر میں سوال ہوگا منکر نکیر کا سامنا ہوگا۔وغیرہ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ اپنے آپ کو قبر والوں میں سے سمجھو۔(۲)

اس طرح کچھ دیر روزانہ مراقبہ کیا کرے، اس سے اپنے حالات کو درست کرنے میں مدد ملے گی۔

اسی طرح سونے سے قبل محاسبہ کرے یعنی دن بھر کے اپنے اعمال وعباداتِ کا نیکیوں اور برائیوں کا جائزہ لے اور نیکیوں پر اللہ کا شکر ادا کرے اور مزید کی توفیق کا سوال کرے اور برائیوں پر توبہ کرے اور آئندہ نہ کرنے کے لیے بھی توفیق کا سوال کرے۔

هذا ما اردت ایرادهٗ فی هذا المقام بتوفیق اللّٰه العلام
واللّٰه ارجو انْ یوفقنی وایاکم للخیر الهادی الی دار السلام

---

(۱) ترمذی: ۲۴۴۰، احمد: ۲۵۳۷

(۲) ترمذی: ۲۲۵۵، ابن ماجه: ۴۱۰۴، احمد: ۴۷۶۰
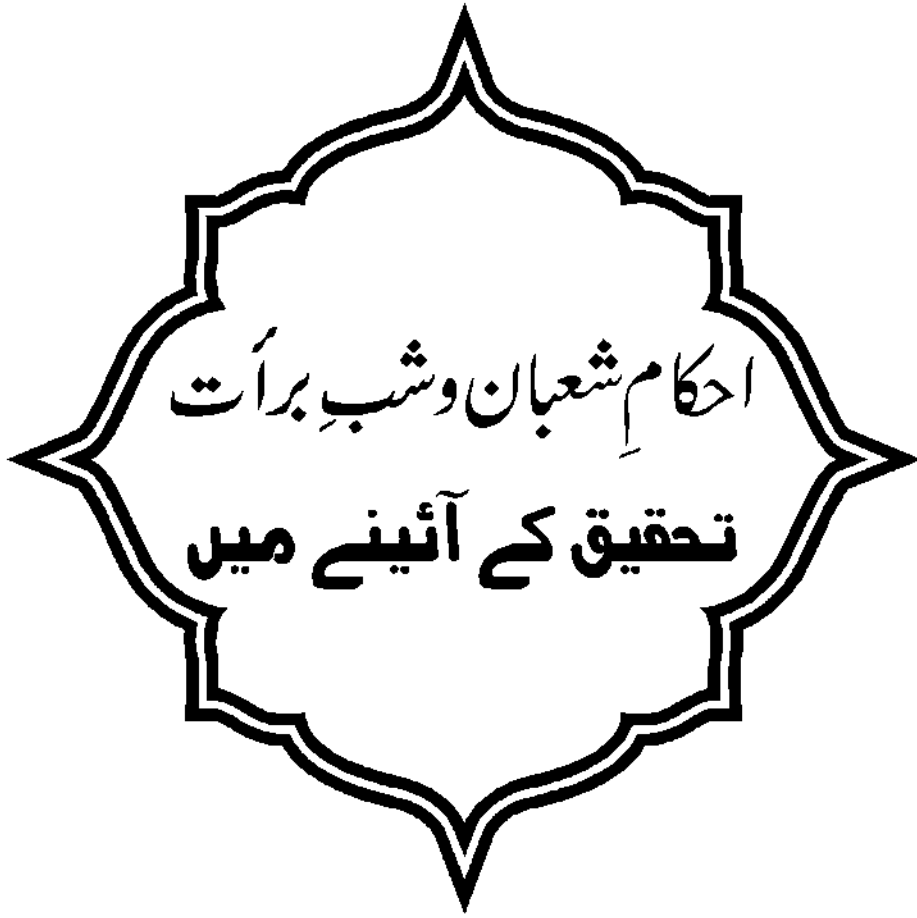
احکامِ شعبان وشبِ برأت

تحقیق کے آئینے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

یہ کتابچہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، دراصل احقر کے تین مضامین کا مجموعہ ہے، جو ماہ شعبان وشب برأت کے بارے میں مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور بعض اخبارات میں شائع بھی ہوئے تھے، ماہ شعبان اور خصوصاً شب برأت کے فضائل اور احکام پر ان مضامین پر مدلل بحث کی گئی ہے اور افراط وتفریط سے بچتے ہوئے وہ ''نقطۂ اعتدال'' پیش کیا گیا ہے، جس کو جمہور علماء حق نے اختیار کیا ہے، اور اس میں ایک طرف یہ واضح کیا گیا ہے کہ شب برأت کی فضیلت کو مان کر جو لوگ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور بدعات اور خرافات میں مبتلا ہو کر حقیقی فضیلت سے محروم ہو جاتے ہیں، وہ افراط واحداث فی الدین کی بیماری کا شکار ہیں، تو دوسری طرف ان تفریط کرنے والوں کی کوتاہی پر تنبیہ بھی کی گئی ہے، جو شب برأت کی فضیلت کے اکسر منکر ہیں اور دلائل وبراھین کی روشنی میں ماہ شعبان وشب برأت کی فضیلت وعظمت کو ثابت کیا گیا ہے۔

خصوصا غیر مقلدین جو ہمیشہ جزوی وفروعی مسائل میں خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاتے اور سلف صالحین کے برخلاف جزوی مسائل میں تشدد اور انتہاء پسندی کا مظاہرہ کر کے بین المسلمین تفریق اور اختلاف ڈالتے ہیں، چوں کہ وہ اس مسئلہ میں بھی اپنی روش کے مطابق احادیث وآثار اور سلف صالحین کے اقوال

سب سے آنکھے بند کر کے اپنی ایک الگ ہی رائے رکھتے ہیں، لہٰذا خصوصیت سے اس رسالے میں ان کے مقتدر علما کے حوالے بھی پیش کیے گیے ہیں۔خصوصا علامہ ناصرالدین الالبانی جو غیر مقلدین کے نزدیک بہت اونچا مقام رکھتے ہیں، ان کا حوالہ بھی تفصیلا پیش کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ شب برأت کی فضیلت ثابت شدہ حقیقت ہے، جس سے انکار سوائے ضد کے کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے نازک ترین دور میں جب کہ اہل اسلام کے خلاف دنیا کی مادی طاقتیں مجتمع اور تمام باطل ملتیں سر جوڑ کر سازشوں میں لگی ہوئی ہیں، ان جزوی مسائل پر بحث ایک غیر ضروری اور مقصد سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔آج چاہئے تو یہ تھا کہ تمام فرق اسلامیہ اپنے اختلاف کو بالا طاق رکھ کر باطل قوتوں اور طاقتوں کے خلاف ایک سیسہ پلائی دیوار کے مانند اور جسد واحد بن کر کھڑے ہو جاتے اور ساری دنیا پر حکومت الٰہیہ کی برتری وفوقیت کو ثابت کر دیتے۔

مگر افسوس کہ اب اس کے بجائے بعض لوگ ان فروعی مسائل میں الجھ کر اس اصل کام اور ذمہ داری سے شعوری یا غیر شعوری طور پر غافل اور غیروں کا لقمہ تر بنتے جارہے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل پر ابھارنے والے غیر مقلدین جو حقیقت سے بے خبری کے ساتھ تعصب اور تفرق کا شکار ہیں اور حدود سے متجاوز ہو کر ناروا تشدد اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حنفیت اور تمام فقہی مکاتب اور صحابہ واسلاف اور بزرگان دین سے امت کو بدظنی میں مبتلا کرتے ہیں، ان کی ان ناروا تحریکات وکارروائیوں کے جواب میں بادل ناخواستہ ان مسائل پر کہنا اور لکھنا پڑ رہا ہے۔

غرض ان بے اعتدالیوں کی بنا پر ضرورت معلوم ہوئی کہ اس موضوع پر لکھے گئے ان مضامین کو جزوی ترمیم و اضافہ اور مزید حوالجات سے مزین کر کے شائع کیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مقبولیت و نافعیت سے نوازے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

۲۰/ رجب المرجب ۱۴۲۱ھ ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہِ شعبان-فضائل واعمال

تمہید

ماہِ شعبان اسلامی کیلنڈر کا ایک محترم و معظم مہینہ ہے اور ہمارے لیے رحمتوں اور برکتوں، فضیلتوں اور سعادتوں کو لے کر آتا ہے اور ہم سے طالب ہوتا ہے کہ ہم ان سعادتوں اور برکتوں سے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنا حصہ حاصل کرلیں۔ مگر بہت سے لوگ اس ماہ کی آمد ورفت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔اس سے بے توجہی وغفلت برتتے اوران سعادتوں اور برکتوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور بعض حضرات اس سے ایک قدم آگے بڑھا کراس مہینہ میں بعض بدعات وخرافات کے مرتکب ہوتے ہیں اور سعادتوں اور برکتوں کے بجائے حرمان نصیبی، بلکہ اوراس سے بڑھکر بدبختیوں اورنحوستوں کے مستحق قرار پاتے ہیں، حالاں کہ مسلمان کی بحیثیت مسلمان ہونے کے سب سے پہلی اوراہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہر معاملہ میں قانون خداوندی اور شریعت محمدیہ سے استفادہ کرے، اور جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے ان کوضرور کرے اورجن سے منع کیا گیا ہے، ان سے پوری طرح پرہیز کرے، من مانی رسومات، من گھڑت خرافات سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رکھے۔اسی طرح جب کوئی مہینہ آئے تو پہلے معلوم کرے کہ شریعت نے اسکے بارے میں کیا کرنے اور کیا نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

شعبان کے بارے میں عوام الناس میں دوطرح کی غلط فہمیاں اور غلطیاں رائج ہیں۔ایک یہ کہ اس میں ہمیں کیا کرنا چاہئے،اس کا صحیح علم نہیں؛ اس لئے غلط سلط باتوں کواپناتے ہیں،دوسرے یہ کہ اس کی فضیلت کا علم نہ ہونے کی بنا پر اس کی اہمیت پر نظر نہیں ہے۔لہٰذا اس مضمون میں اس کی فضیلت وعظمت پر بھی روشنی ڈالوں گا اور اس میں جن اعمال کی ترغیب آئی ہے،ان کو پیش کرونگا اور ساتھ ساتھ لوگوں کی من گھڑت رسومات وخرافات کی تردید بھی کروں گا،جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے اور شب برأت پر بھی کلام کروں گا۔

ماہ شعبان کی فضیلت

ماہِ شعبان کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں؛ مگر ان میں سے اکثر روایات ضعیف ہیں۔تاہم بعض صحیح احادیث سے بھی شعبان کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شعبان سے زیادہ رمضان چھوڑ کر کسی اور مہینہ میں روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔(۱)

بعض احادیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوائے چند دنوں کے شعبان بھر روزہ رکھتے تھے۔یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک روزہ رکھنے کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ مہینہ شعبان تھا۔(۲)

(۱) بخاري: ۱/۲۶۴،مسلم: ۱/۲۶۵،نسائي: ۱/۳۲۱

(۲) نسائي: ۱/۳۲۱

ان روایات اور احادیث سے اتنی بات واضح ہے کہ شعبان کے مہینہ کو ایک خاص فضیلت حاصل ہے، جس کی بنا پر اللہ کے رسول علیہ السلام خصوصیت کے ساتھ اس میں روزے کا اہتمام فرماتے تھے۔ نیز آخری روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ کیلئے اللہ کے نبی علیہ السلام کے نزدیک رمضان کے بعد سب سے محبوب شعبان کا مہینہ تھا۔ اس سے بھی شعبان کی ایک خصوصی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

شعبان میں اعمال کی پیشی اور فیصلے

ایک حدیث میں شعبان کے مہینہ کی ایک خاص فضیلت یہ بتائی گئی ہے کہ اس ماہ میں اللہ رب العالمین کے دربار میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے۔

چناں چہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے آپ کو کسی مہینہ میں اتنے روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا، جتنے کہ آپ شعبان میں رکھتے ہیں؟ آپ نے یہ فرمایا کہ ہاں وہ (شعبان) ایک مہینہ ہے۔ رجب و رمضان کے درمیان جس سے لوگ غافل رہتے ہیں اور وہ ایسا مہینہ ہے جس میں اللہ رب العالمین کے دربار میں اعمال پیش ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں پسند کرتا ہوں کہ ہر عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزے دار ہوں۔ (۱)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ اس پر کوئی جرح نہیں کی ہے؛ بل کہ فرمایا کہ ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (۲)

نیز یہی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ابویعلی نے ذکر کی ہے جس

(۱) طحاوي: ۱/۲۸۸، نسائي: ۱/۳۲۲، مسند اسامه: ۱/۱۲۶

(۲) فتح الباري: ۴/۲۱۵

میں یہ ہے کہ اللہ تعالی (اس ماہ میں) ہر اس نفس کا فیصلہ لکھ دیتا ہے جو اس سال مرنے والا ہے؛ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میری موت روزے دار ہونے کی حالت میں آئے۔(۱)

ان دو روایات سے معلوم ہوا کہ شعبان کی دو خاص فضیلتیں ہیں، ایک یہ کہ اس مہینہ میں اللہ کے حضور میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ بندوں کی موت کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔

ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ متعدد احادیث میں مذکور ہے کہ ہر پیر و جمعرات کو اعمال پیش کئے جاتے ہیں، جب ہر پیر و جمعرات کو اعمال پیش ہو جاتے ہیں تو شعبان میں پھر کون سے اعمال مخصوص طور پر پیش کئے جاتے ہیں؟

اس شبہ کا جواب علامہ سندھی رحمۃ اللہ نے حاشیہ نسائی میں دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اعمال ایک تو روز کے روز اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں، پھر ایک ہفتہ کے اکھٹے پیش ہوتے ہیں، پھر سال میں ایک دفعہ شعبان میں پورے سال کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، رہی اس کی حکمت تو وہ اللہ ہی زیادہ جانتے ہیں۔(۲)

غرض شعبان کے مہینہ میں انسانوں کے اعمال اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے اسی مہینہ میں اس سال مرنے والوں کا نام لکھدیا جاتا ہے۔

شعبان سے غفلت پر نکیر

اوپر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رجب و رمضان کے درمیان آنے والے مہینہ ''شعبان'' سے غفلت برتنا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابل نکیر

(۱) مسند ابو يعلى: ۸/۳۱۱

(۲) حاشيه نسائي از علامه سندهي: ۱/۳۲۲

ہے؛ اس لیے آپ نے اس غفلت پر نکیر فرمائی اور اس ماہ کی حرمت وعظمت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے؛ لہٰذا اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور غفلت سے باز آنا چاہیے۔

شعبان کی ایک اور فضیلت

ان کے علاوہ شعبان کی ایک اور فضیلت بھی ہے، وہ یہ کہ یہ مہینہ رمضان شریف سے ملا ہوا ہے، گویا یہ رمضان کا پیش خیمہ ہے۔ اس اعتبار سے بھی شعبان کو خصوصیت حاصل ہے، جیسے مقدس مقام و جگہ کے اطراف واکناف کے حصے بھی قابل تعظیم ہوتے ہیں، ایسے ہی مقدس زمانے سے متصل زمانہ بھی قابل احترام و تعظیم ہوتا ہے۔ اس کی طرف ترمذی کی ایک ضعیف حدیث میں اشارہ ملتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ شعبان کا روزہ، رمضان کی تعظیم کے لیے۔ (۱)

فائدہ علمیہ: اگر چہ یہ حدیث مسلم کی ایک حدیث سے بظاہر متعارض نظر آتی ہے، جس میں ہے کہ رمضان کے بعد سب سے افضل محرم کا روزہ ہے اور اسی وجہ سے ابن حجر رحمہ اللہ نے ترمذی کی اس حدیث کو رد فرمایا ہے؛ مگر میرے نزدیک دونوں میں کوئی تعارض حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ کیوں کہ محرم کے روزہ کی افضلیت جس کا ذکر مسلم کی حدیث میں ہے وہ بالذات اور اصالۃً ہے، جب کہ ترمذی کی حدیث میں مذکور شعبان کے روزہ کی فضیلت بالتبع ہے، یعنی رمضان کی تعظیم و حرمت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ خود حدیث میں مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ جب ایک کو اصالۃ افضل، دوسرے کو تبعاً افضل قرار دیا گیا تو تعارض نہ رہا۔ واللہ اعلم

(۱) طحاوي: ۱/۲۸۸، ابویعلی: ۶/۱۵۴

غرض شعبان کے مہینہ میں بذاتِ خود بھی فضیلت ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا اور رمضان کی وجہ سے بھی اس کو فضیلت حاصل ہے، جیسا کہ اس حدیث کا مقتضی ہے۔

شعبان کے اعمال

اب سوال یہ ہے کہ اس معظم ومحترم مہینہ میں کیا کوئی مخصوص عمل ہے؟ ظاہر ہے کہ ہماری شریعت میں ہمیں یا کسی اور کو اس بات کی گنجائش نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی عمل تراش لے۔ خواہ وہ عمل دوسرے موقعہ پر دین میں ثابت ہو۔ مگر اس موقعے سے ہٹا کر دوسرے موقعے پر بھی اس مخصوص عمل کو اختیار کرنا بلا دلیل شرعی جائز نہ ہوگا۔ مثلاً: نماز تراویح رمضان میں مشروع ہے اور بڑے ثواب کا کام ہے؛ مگر کوئی اس عمل کو شعبان میں بھی جاری کرے اور کہنے لگے کہ اتنے بڑے عمل کو اگر شعبان جیسے معظم مہینہ میں ہم کریں تو ثواب کے مستحق ہوں گے، تو یہ غلط اور خلافِ شرع ہے؛ اس لیے یہ غور کرنا چاہیے کہ شعبان کے اندر شریعت میں مخصوص کوئی عمل ہے یا نہیں؟

اس کا جواب اوپر پیش کردہ احادیث سے نکل آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس مہینہ میں کثرت کے ساتھ روزہ رکھنا چاہیے، یہ عمل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے منصوص طور پر منقول ہے، البتہ بعض احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ہدایت فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ نصف شعبان (پندرہ شعبان) کے بعد رمضان آنے تک روزہ نہ رکھا جائے۔ (۱)

شعبان میں رمضان کی تیاری

اس حدیث میں بظاہر ایک چیز (نصف شعبان کے بعد روزہ) سے منع فرمایا ہے؛ مگر حقیقت میں یہ ایک اور چیز کا حکم دیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس کو بھی شعبان

(۱) ترمذي: ۱/۱۵۵، طحاوي: ۱/۲۸۷

کے اعمال میں شمار کرنا چاہیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو یہ فرمایا کہ نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھنا چاہیے، اس کی وجہ اور حکمت یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد رمضان سے پہلے روزہ رکھنے سے ہوسکتا ہے کہ کچھ ضعف اور کمزوری پیدا ہو اور یہ ضعف و کمزوری رمضان کے روزوں اور عبادتوں میں سستی و کاہلی کا باعث بن جائے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں سے محرومی کا سبب بن جائے؛ اس لیے آپ نے نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنے سے منع فرمادیا۔

تو یہ منع کرنا دراصل رمضان کے لیے تیار رہنے اور تیار ہونے کا حکم ہے کہ رمضان سے قبل روزہ رکھ کر کمزور نہ ہو؛ بل کہ روزہ نہ رکھو اور اپنے آپ کو رمضان کے لیے تیار کرلو، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شعبان میں جس طرح ایک عمل کثرت کے ساتھ روزہ رکھنے کا ہے، دوسرا عمل رمضان کے لیے تیاری کرنے کا بھی ہے؛ لہٰذا رمضان میں روزہ رکھنے اور تراویح اور دیگر عبادات میں چستی اور دلجمعی کے ساتھ لگنے کے لیے شعبان ہی سے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہئے۔ مثلاً کمزور آدمی اچھی اور عمدہ غزاؤں اور دواؤں کے ذریعے اپنے آپ کو تیار کرلے، بیمار آدمی علاج و معالجہ کر کے اپنے آپ کو تیار کرلے، کسی کو سفر کا خیال ہو تو شعبان ہی میں اس سے فارغ ہو جائے، یہ ہے منشاء نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا۔ غرض یہ کہ شعبان فضیلت والا مہینہ ہے، اس میں روزے رکھے جائیں اور رمضان کی تیاری کی جائے۔ اب میں شب برأت کی فضیلت پر کلام کروں گا۔

شب برأت دلائل کے آئینہ میں

شب برأت کا اسلام میں کوئی مقام ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا اور کیسا؟ نیز ہمیں اس میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے یہ چند پہلو ہیں جن پر یہاں روشنی ڈالوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، بعض لوگ شب برأت کی فضیلت وحقیقت سے اکسر انکار کرتے ہیں اور بعض لوگ اس کو اس مقام تک پہنچاتے ہیں، جس کی وہ مستحق نہیں، پھر اس فضیلت کے قائل اکثر حضرات ایسے ہیں، جو اس میں بہت سی من گھڑت رسومات وبدعات میں مبتلا ہیں؛ اس لیے یہاں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس میں مسلک اعتدال کو پیش کرتے ہیں۔

شب برأت کی فضیلت

جہاں تک شب برأت کی فضیلت کا مسئلہ ہے، اس میں متعدد احادیث وارد ہیں، جیسا کہ آگے عرض کروں گا۔ البتہ شب برأت کی فضیلت کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہے یا نہیں؟ اس میں علما کی دو رائے ہیں اور اس اختلاف کا منشا قرآن مجید کی ان آیات کی تفسیر میں اختلاف ہے:

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ . فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴾ (الدخان : ۴۳)

(بلاشبہ ہم نے اس (قرآن) کو مبارک رات میں نازل کیا، بیشک ہم ڈرانے والے ہیں، اس رات میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔)

ان آیات کی تفسیر میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ مراد شب برأت ہے کہ اس میں فیصلے کیئے جاتے ہیں، اسی کو حضرت عکرمہ اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے؛ مگر جمہور مفسرین نے اس پر سختی سے رد کیا ہے؛ کیوں کہ ان آیات میں مذکور ہے کہ اس مبارک رات میں اللہ نے قرآن نازل فرمایا اور یہ مسلم وظاہر ہے کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے، تو لا محالہ اس سے بھی لیلۃ القدر ہی مراد ہے اور ہونا

چاہیے اور چوں کہ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے اور قرآن میں یہ دوسری جگہ آیا ہے کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے؛ اس لیے یہی تفسیر راجح بل کہ متعین ہے۔ غرض قرآن کی اس آیت میں اگر شب برأت مراد ہوتو اس کی فضیلت قرآن سے بھی ثابت ہوگی، ورنہ نہیں، اور چونکہ راجح تفسیر کے مطابق شب برأت مراد نہیں، اس لیے قرآن سے اس کی فضیلت کا ثبوت مشکل ہے، اس کی تفصیل ہمارے اگلے مضمون میں دیکھی جاسکتی ہے۔

البتہ احادیث میں اس کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور اس سلسلے میں بہت سے صحابہ سے روایات آئی ہیں، علامہ سیوطی رَحمہُ اللہُ نے منثور میں ان کو جمع کردیا ہے، اغلب یہ ہے کہ پچیس سے زائد احادیث اس سلسلے میں مروی ومنقول ہیں؛ مگر اکثر احادیث ضعیف ومنکر اور شدید الضعف ہیں؛ مگر جو روایات بہت ضعیف ہیں، ان کو چھوڑ کر بھی متعدد روایات ایسی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں؛ اس لیے سرے سے ان روایات کا انکار اصول محدثین کے اعتبار سے بھی درست نہیں؛ کیوں کہ محدثین نے اصول لکھا ہے کہ متعدد ضعیف روایات جمع ہو جائیں تو وہ درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہیں۔

شب برأت کی فضیلت میں صحیح حدیث

یہ تو ایک عمومی اصول حدیث کی رو سے عرض کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ناظرین کے لیے یہ انکشاف حیرت زدہ ہوگا کہ اس سلسلے میں ایک حدیث صحیح بھی وارد ہوئی ہے، عالم اسلام کے مشہور سلفی عالم مسلک اہل حدیث کے شارح وداعی علامہ ناصر الدین البانی نے ''اصلاح المساجد'' مصنفہ علامہ جمال الدین القاسمی کے حاشیہ پر ابن ابی عاصم کی ''السنۃ'' اور ابن حبان کی ''الصحیح'' کے حوالے سے

حدیث نقل کی ہے، یہ حدیث بہ طریق مالک ابن یخامر عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مروی ہے، الفاظ یہ ہیں:

«يَطَّلِعُ اللّٰهُ اِلٰى خَلْقِهٖ فِيْ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِجَمِيْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ.»

(شعبان کی پندرھویں شب میں اللہ تعالی اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوائے مشرک اور کینہ پرور کے سب کی مغفرت فرمادیتے ہیں۔)(۱)

اس حدیث کو نقل کر کے شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے رجال (راوی) ثقہ (قابل اعتماد) ہیں اور حدیث صحیح ہے۔(۲)

اس صحیح حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ شعبان کی پندرھویں شب جس کو شب برأت کہتے ہیں، اس کو بلاشبہ ایک فضیلت حاصل ہے اور یہ بات بے اصل نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔

بعض اور احادیث

اس صحیح حدیث کے ساتھ جب ان احادیث کو ملایا جاتا ہے، جو بہ طرق ضعیفہ شب برأت کی فضیلت میں آئی ہیں، تو اس کو مزید قوت ملتی ہے اور وہ ضعیف روایات بھی قابل اعتبار قرار پاتی ہیں، جیسا کہ محدثین کا اصول ہے، یہاں ان سب روایات کو پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ دو ایک روایات پیش کرتا ہوں۔

(۱) ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ایک رات انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو پریشاں ہوئیں اور تلاش کرتی ہوئی

(۱) السنة لابن أبي عاصم: ۲۴۴/۱، صحيح ابن حبان: ۴۸۱/۱۲

(۲) حاشیہ اصلاح المساجد مترجم: ۱۲۸، مطبوعہ الدار السلفیہ بمبئی

مدینہ کے قبرستان ''جنت البقیع'' کی طرف نکل گئیں۔ وہاں دیکھا کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم موجود ہیں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شعبان کی درمیانی شب (پندرھویں شب) میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور بنوکلب (ایک قبیلہ جو عرب کے تمام قبائل میں سب سے زیادہ بکریاں پالتا تھا) کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔ (۱)

یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف قرار دی گئی ہے، ایک اس لیے کہ حجاج بن ارطاۃ اس کے ایک راوی کو جمہور علما نے ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں دو جگہ انقطاع ہے، ایک حجاج اور یحییٰ بن ابی کثیر رَحِمَہُ اللہُ کے درمیان؛ کیوں کہ حجاج کو یحییٰ سے سماع حاصل نہیں، دوسرے یحییٰ اور عروہ کے درمیان؛ کیوں کہ یحییٰ کو عروہ سے سماع حاصل نہیں؛ مگر ان میں سے بعض کا جواب ممکن ہے؛ کیوں کہ حجاج بن ارطاۃ کی بعض محد ثین نے توثیق بھی فرمائی ہے، جیسے ثوری، ابن عیینہ رَحِمَہُ اللہُ وغیرہ اور اکثر حضرات نے ان پر جو جرح کی ہے، وہ تدلیس کی ہے اور بہت سے حضرات ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں، جیسا کہ ابن حجر رَحِمَہُ اللہُ نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے۔ (۲)

لہٰذا پہلی وجہ ضعف ختم نہیں تو ضعیف ہوگئی، دوسرے یہ کہ امام یحییٰ بن معین رَحِمَہُ اللہُ نے یحییٰ کا سماع عروہ سے ثابت کیا ہے، جیسا کہ علامہ عینی رَحِمَہُ اللہُ نے لکھا ہے۔ (۳)

اب بس ایک وجہ ضعف کی باقی رہی، وہ ہے حجاج اور یحییٰ کے درمیان کا واسطہ نہ

---

(۱) ترمذي: ۱/۱۵٦، مسند اسحق بن راهويه: ۳/۹۷۹، مسند احمد: ٦/۲۳۸، عبد بن حميد: ۱/۴۳۷

(۲) تهذيب التهذيب: ۲/۱۹۷-۱۹۸

(۳) دیکھو: معارف السنن: ۵/۴۲۱

ہونا غرض یہ کہ یہ روایت اتنی ضعیف نہیں کہ بالکل نا قابل التفات ہو؛ بل کہ ضعف کے باوجود پہلی حدیث صحیح سے مؤید ہے۔

(۲) امام احمد نے مسند میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کی درمیانی شب اللہ تعالی اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوائے کینہ پرور اور خودکشی کرنے والے کے تمام بندوں کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔(۱)

اس مضمون کی بہت سی احادیث مرفوعاً وموقوفاً مروی ہیں اور ایک دوسرے کی تائید وتقویت کرتی ہیں، معلوم ہوا کہ اس رات کو فضیلت حاصل ہے، اس کا انکار کسی اہل حق کے لیے ممکن نہیں۔

کیا شب براٴت فیصلے کی رات ہے

اور اس رات کی فضیلت میں وارد بہت سی احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس رات میں اللہ کے طرف سے فیصلے ہوتے ہیں، یعنی اس شعبان سے آئندہ شعبان تک پیدا ہونے والوں، مرنے والوں کے نام لکھ کر فرشتوں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ روایات سب کی سب ضعیف ہیں، جیسا کہ علما نے لکھا ہے؛ مگر یاد ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے ایک روایت شعبان کی فضیلت میں اوپر ذکر کی گئی، جس کو ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں نقل کیا ہے اور سکوت فرمایا ہے جو علما کے نزدیک روایت کے صالح للاحتجاج ہونے کی علامت ہے۔(۲)

(۱) مسند احمد: ۱۰/ ۱۲۷

(۲) مقدمہ اعلاء السنن: ۱/ ۵۵

اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: شعبان وہ مہینہ ہے جس میں اس ایک سال میں مرنے والوں کا نام لکھ دیا جاتا ہے، یہ روایت ان ضعیف روایات کی تائید کرتی ہے، جس سے فی الجملہ شب برأت کا فیصلہ کی رات ہونا ثابت ہوتا ہے، بس اتنی بات ہے کہ اس حدیث میں شعبان کا ذکر ہے اور روایات میں نصف شعبان کی رات کا یہ امکان ہے کہ شعبان کہہ کر شعبان کی ایک یہی رات مراد لی گئی ہو، مگر اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فیصلوں کے لیے شب قدر کو جب مقرر کیا گیا ہے، جیسا کے قرآن میں ہے:

﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ (الدخان: ۴)

لیلۃ القدر میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور احادیث سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے تو پھر شب برأت میں فیصلہ ہونے کا کیا مطلب؟ بعض علما نے اس اشکال کی وجہ سے شب قدر میں فیصلے ہونے کے دلائل چوں کہ مضبوط ہیں؛ اس لیے شب برأت والے دلائل کو نا قابل التفات قرار دیا، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، شب برأت کے فیصلہ کی رات ہونے پر صحیح یا حسن روایت فی الجملہ دلالت کرتی ہے اور دیگر احادیث سے اس کو قوت ملتی ہے؛ اس لیے دیگر علما نے دونوں اقوال میں تطبیق دی ہے، اس طرح کہ شب برأت میں ہر کام کا فیصلہ لکھا جاتا ہے اور فرشتوں کے حوالہ کیا جاتا ہے؛ مگر نفاذ لیلۃ القدر سے ہوتا ہے؛ اس لیے دونوں راتوں کو فیصلہ کی رات کہنا درست ہے۔ چناں چہ مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رَحِمَہُ اللہُ نے ملا علی قاری رَحِمَہُ اللہُ سے نقل کرتے ہوئے لکھا:

”اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شعبان کی درمیان شب میں فیصلے واقع ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے، ہاں اختلاف اس میں ہے کہ

آیت میں یہ مراد ہے یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ آیت سے یہ مراد نہیں ،غرض حدیث اورآیت سے دونوں راتوں (لیلۃ البرأت) میں فیصلوں کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک رات میں اجمالاً اور دوسری میں تفصیلاً فیصلوں کا وقوع ہو، یا ایک رات میں دنیوی امور کے اور دوسری میں اخروی امور کے فیصلے ہوں وغیرہ احتمالات موجود ہیں۔‘‘(۱)

نقطۂ اعتدال

اس تفصیل سے یہ بات کسی قدر وضاحت وصراحت کے ساتھ سامنے آگئی کہ شب برأت کی اصل ہے اور اس میں فضیلت ثابت ہے اور فی الجملہ اس کو فیصلہ کی رات کہنا بھی حدیث کی رو سے درست ہے؛ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو اس کی حد سے آگے بڑھایا جائے ،جیسا کہ ہمارے ان علاقوں میں دیکھا جاتا ہے کہ شبِ برأت کو بالکل وہ درجہ دے دیا گیا ہے، جو عید کے دن کا اسلام میں ہے،اس میں نئے کپڑے بھی بنائے جاتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کھانوں کا بھی اہتمام ہوتا ہے؛ نیز زبانوں پر بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ عید ہے۔چناں چہ اس کو شعبان کی عید کہتے ہیں ۔جیسے رمضان کی عید کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ شریعت اسلام نے اس رات کو یہ درجہ نہیں دیا ہے،اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے کبھی اس رات میں عید کی طرح کا اہتمام نہیں فرمایا؛ حتی کہ لوگوں کو مسجد میں یا کسی اور جگہ عبادت کے لیے جمع کرنے کا بھی اہتمام نہیں کیا گیا،بس اس کی فضیلت بیان کر کے انفرادی عبادت کی طرف متوجہ فرمادیا؛ لہٰذا نقطہ اعتدال پر قائم رہنا چاہیے اور اس افراط وتفریط کو ترک کرنا چاہیے۔

---

(۱) تحفة الاحوذي: ۳/۳٦۷

شبِ برأت میں کیا کرنا چاہیے

اب رہا یہ سوال کہ شب برأت میں ہم کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں صحیح حدیث میں کوئی خاص عمل نظر سے نہیں گزرا؛ البتہ ضعیف حدیث سے چار عمل معلوم ہوتے ہیں اور چوں کہ یہ باب فضائل سے ہے؛ لہٰذا ان پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

ابن ماجہ رحمۃ اللہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شعبان کی درمیانی شب ہو تو اس کی رات میں عبادت کرو اور دن میں روزہ رکھو؛ کیوں کہ اللہ تعالی اس رات مغرب کے وقت آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی ہے! مغفرت مانگنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں، ارے! کوئی ہے رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں، کوئی ہے! مصیبت زدہ کہ میں اسے عافیت دوں۔ اسی طرح پکارتے ہیں حتی کہ صبح طلوع ہو جاتی ہے۔ (۱)

اس حدیث کو علما نے ضعیف قرار دیا ہے؛ مگر چوں کہ فضائل میں ضعیف کو لینے کی گنجائش ہے؛ اس لیے اس کو ذکر کیا گیا ہے، اس حدیث میں تین عمل وارد ہوئے ہیں۔ رات میں قیام کر کے عبادت کرنا، دوسرے دن میں روزہ رکھنا، تیسرے اپنی مغفرت، رزق، سکون و راحت کے لیے اور دیگر حاجات کے لیے دعا کرنا اور چوتھا عمل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوا، جس کا ذکر اوپر ہوا کہ آپ اس رات قبرستان تشریف لے گئے تھے؛ لہٰذا اس رات قبرستان جانا بھی معلوم ہوا؛ مگر اس کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ چوں کہ یہ احادیث ضعیف ہیں؛ لہٰذا ان اعمال کو مستقل سنت کا درجہ دینا حدود سے تجاوز اور دین میں احداث کے مترادف ہے، اس لئے محض یہ سمجھ کر کہ فضیلت حاصل ہو، سادہ طریقہ پر ان کا اہتمام کرلیا جائے تا کہ فضیلت سے

(۱) ابن ماجہ :۱/۹۹

محرومی نہ ہو، بعض لوگ قبرستان جانے کا ایسا اہتمام کرتے ہیں گویا کہ کوئی واجب کام ہو یا مستقل سنت ہو؛ اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اس کے لیے مستقل گاڑیوں کا انتظام کرتے ہیں، یہ حدود سے تجاوز ہے، جیسا کہ آگے عرض کروں گا۔

شب برأت میں دعا کا اہتمام

اور ایک خاص کام شب برأت میں یہ کرنا چاہیے کہ دعاؤں کا اہتمام کیا جائے، چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پانچ راتیں ہیں، جن میں دعاء رد نہیں ہوتی (یعنی ضرور قبول ہوتی ہے) وہ راتیں یہ ہیں، جمعہ کی رات، رجب کی پہلی رات، شعبان کی پندھرویں رات، اور عید کی دو راتیں (عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔)(۱)

اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ یوں کہا جاتا تھا کہ پانچ راتوں میں دعاء قبول ہوتی ہے۔ جمعہ کی رات، عید الاضحیٰ کی رات، عید الفطر کی رات، رجب کی پہلی رات اور شعبان کی درمیانی رات۔(۲)

امام شافعی رحمہ اللہ نے جو فرمایا کہ "یہ کہا جاتا تھا" یہ امام شافعی رحمہ اللہ دور صحابہ وتابعین کا ذکر کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس دور میں یہ بات مشہور تھی۔

شبِ برأت کی بدعات

جو کام اس رات میں کرنا ہے، اس کا ذکر اوپر ہوگیا۔ اب میں یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس رات میں بھی بہت سے کام ایسے کیے جاتے ہیں جو خلافِ شریعت اور ناجائز ہیں، شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں؛ لہٰذا ان کاموں سے بچنا چاہیے، بعض لوگ شعبان میں یا خاص شبِ برأت میں اپنے گھروں کی لپائی، پتائی

(۱) شعب الایمان: ۳/۳۴۲

(۲) شعب الایمان: ۳/۳۴۱

اور مرمت وغیرہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ضرورت ہوتو یہ کام اس ماہ وشب میں بھی ہوسکتا ہے اور کسی اور وقت بھی ممکن ہے؛ مگر ضرورت کے لیے نہیں؛ بل کہ اس رات وماہ کی خصوصیت سے اس کو کرنا بے اصل ہے۔

(۲) اس رات میں مساجد میں ضرورت سے زیادہ روشنی کرنا، میناروں کو روشنی سے سجانا بھی بے اصل؛ بل کہ شریعت کے خلاف ہے، علمانے اس پر سخت نکیر کرتے ہوئے اس کو غیر مسلموں کا طریقہ بتایا ہے۔

(۳) بعض جاہلوں میں رسم ہے کہ اس رات میں پٹاخے چھوڑتے ہیں، یہ سراسر غیر اسلامی رسم ہے اور قطعی طور پر حرام۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں میں بھی اور وہ بھی مبارک رات کے موقعہ پر اس کا رواج ہوگیا۔

(۴) بعض لوگ اس میں حلوا پکانے اور کھانے کھلانے کو ضروری یا مستحب سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں بعض منگھڑت روایات سے استدلال کرتے ہیں، یہ بھی بے اصل اور بدعت ہے اور بعض لوگ شربت بناتے ہیں۔ یہ بھی خواہ مخواہ کی بات ہے۔

(۵) بعض لوگ اس رات میں مساجد میں جمع ہوکر عبادت کرتے ہیں اور بعض لوگ مخصوص قسم کی نمازیں پڑھتے ہیں اور اس سلسلے میں بعض لوگ ''اشغال شب برأت'' کے نام سے کتابچہ بھی شائع کرتے ہیں، جس میں مخصوص انداز سے نماز کا ذکر کرتے ہیں، علمائے حدیث نے ان احادیث کو موضوع و باطل قرار دیا ہے۔ چناں چہ مشہور محدث علامہ ابن الجوزی رَحمہُ اللہُ نے موضوعات میں ان احادیث کو موضوع قرار دیا ہے۔(۱)

لہٰذا عبادت جو چاہے کی جاسکتی ہے، نفل نماز عام طریقہ کے مطابق، دعاء، ذکر،

(۱) موضوعات:۲/ ۱۲۸۔۱۳۰

تلاوت وغیرہ جو چاہے کرے ؛مگر ان من گھڑت اعمال وعبادات کو ترک کرنا چاہئے۔

(٦) آج کل اس رات میں قبرستان جانے کی بات پر عمل میں انتہائی غلو ہوگیا ہے۔لوگ وہاں جا کر خرافات میں شرکیہ اعمال بھی کرتے ہیں، بدعات قبور میں بھی مبتلا ہوتے ہیں۔یہ سب واہیات ہے،ان سے بچنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبِ برأت اور نقطہ اعتدال

اسلام میں شب برأت کی کوئی اصل اور حقیقت ہے یا نہیں اور ہے تو کیا اور کس قدر، اس سلسلے میں مختلف طبقات کی طرف سے مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں، بعض لوگ شب برأت کی فضیلت وعظمت اور اس کے مقام ومرتبہ کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر لیلۃ القدر کا شبہ ہونے لگتا ہے، جس کی عظمت وبزرگی نص قرآنی سے صراحتاً ثابت ہے، جب کہ شب برأت کا معاملہ ایسا نہیں اور بعض لوگ شب برأت کی فضیلت سے بالکلیہ انکار کرتے اور اس کو ایک بے حقیقت شئ قرار دیتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ دونوں رائیں انتہا پسندانہ ہیں، پہلی رائے اگر ایک انتہا کو چھورہی ہے تو دوسری رائے دوسری انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور حق یہ ہے کہ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے۔ ایسا نہیں کہ فضیلت ثابت نہیں ہے؛ بل کہ ثابت ہے اور ایسا بھی نہیں کہ لیلۃ القدر کی طرح اس کی فضیلت نص قرآنی سے ثابت ہو اور اس طرح کی فضیلت ہو جیسے لیلۃ القدر کی بتائی گئی ہے؛ بل کہ فی الجملہ اس کی فضیلت ثابت ہے، ذیل کے مضمون میں ہم اسی نقطۂ اعتدال کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔

شبِ برأت اور قران مجید

یہ ظاہر ہے کہ کسی شئ کی فضیلت کا ثبوت یا تو قرآن مجید سے ہونا چاہیے یا پھر احادیث شریفہ سے اس کے پیش نظر جب ہم شب برأت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی فضیلت اور عظمت کا کوئی سراغ قرآن مجید کی کسی آیت سے نہیں ملتا؛ البتہ بعض

حدیثوں سے اس کا پتہ چلتا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، بعض حضرات نے شب برأت کی عظمت اور بزرگی پر قرآن مجید سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔

چناں چہ سُوْرَۃُ الدُّخَانِ کی ابتدائی آیات کو اس کا ماخذ و مستدل بنایا جاتا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

﴿حٰمٓ وَالْکِتَابِ الْمُبِیْنِ اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبَارَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ فِیْهَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ﴾ (الدُّخَانِ : ۴)

(حم (اس کے معنی تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے) قسم ہے واضح کتاب کی، بلا شبہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا، ہم آگاہ کرنے والے تھے۔ اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے۔ حکم ہو کر ہمارے پاس سے ہم بھیجنے والے ہیں۔)

ان آیات میں جو "لیلہ مبارکہ" (برکت والی رات) کا ذکر آیا ہے، اس سے بعض لوگ یہی شبِ برأت مراد لیتے ہیں؛ مگر جمہور علما کے نزدیک اس مبارک رات سے مراد شبِ برأت نہیں؛ بل کہ لیلۃ القدر ہے؛ کیوں کہ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ ہم نے مبارک رات میں قرآن نازل فرمایا اور خود قرآن نے دوسری جگہ بتا دیا کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے۔ تو لا محالہ اس مبارک رات سے بھی وہی لیلۃ القدر مراد ہونا چاہیے۔

علامہ ابو حیان اندلسی رَحِمَہُ اللہُ نے اپنی تفسیر "البحر المحیط" میں فرمایا کہ:

"قتادہ، زید اور حسن بصری رحمہم اللہ نے فرمایا کہ لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ عکرمہ رَحِمَہُ اللہُ اور بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے

مراد شعبان کی درمیانی رات (شبِ برأت) مراد ہے۔ ابو بکر بن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں کوئی شئی ثابت نہیں ہے۔"(۱)

امام سیوطی رحمہ اللہ نے متعدد صحابہ اور تابعی حضرات سے یہی نقل کیا ہے کہ اس آیت میں مبارک رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو مالک، حضرت ابو عبد الرحمان سلمی، حضرت قتادہ، حضرت ابو نضرہ، حضرت مجاہد، حضرت ابو الجوزاء وغیرہ سے منقول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول بسند صحیح ثابت ہے، جیسا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے حاکم کی روایت سے نقل کر کے بتایا ہے کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور یہی قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بہ طریق عطا خراسانی اور ابن ابی شیبہ ومحمد بن نصر اور ابن المنذر رحمہم اللہ نے بہ طریق محمد بن سوقد عکرمہ سے اس کی تخریج کی ہے۔(۲)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ "بیان القرآن" میں فرماتے ہیں کہ لیلہ مبارکہ کی تفسیر اکثر نے شبِ قدر سے کی ہے اور بعض نے لیلہ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرأت سے کی ہے؛ لیکن چوں کہ کسی روایت میں نزولِ قرآن وارد نہیں اور شبِ قدر میں نزول خود قرآن میں مذکور ہے؛ اس لیے یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔(۳)

مشہور فقیہ ومفسر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں رقمطراز ہیں:

---

(۱) البحر المحیط: ۳۱/۸

(۲) ذکرہ السیوطی فی الدر المنثور: ۷۳۸/۵۔۷۳۹

(۳) ملخصات از بیان القرآن تفسیر، سُورَۃُ الدُّخَانِ: ۹۵۷

''لیلہ مبارکہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک شب قدر ہے، جو رمضان مبارک کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے، اس رات کو مبارک فرمانا اس لیے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالی کی طرف سے اپنے بندوں پر بے شمار خیرات و برکات نازل ہوتی ہیں اور قرآن کریم کا شب قدر میں نزول ہونا، قرآن کی سُوْرَةِ الْقَدْرِ میں تصریح کے ساتھ آیا ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں بھی لیلہ مبارکہ سے مراد شب قدر ہی ہے، (آگے چل کر فرماتے ہیں) اور بعض مفسرین عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس آیت میں لیلہ مبارکہ سے مراد شب برأت یعنی نصف شعبان کی رات قرار دی ہے؛ مگر اس رات میں نزول قرآن، دوسری تمام نصوص قرآن اور روایات حدیث کے خلاف ہے اور چوں کہ بعض روایات میں شب برأت یعنی شعبان کی پندھرویں شب کے متعلق بھی آیا ہے کہ اس میں آجال (عمروں) اور ارزاق کے فیصلے لکھے جاتے ہیں؛ اس لیے بعض حضرات نے آیتِ مذکورہ میں لیلہ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البرأت سے کردی ہے؛ مگر یہ صحیح نہیں۔''(۱)

غرض یہ کہ جمہور مفسرین نے خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے، اس آیت میں لیلہ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہی لیتے ہیں اور عکرمہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول قول کو جس میں اس سے مراد شب برأت لی گئی ہے، ضعیف اور ناقابل التفات قرار دیتے ہیں۔

---

(۱) معارف القرآن: ۷۔۷۵۷۔۷۵۸

ایک ضروری وضاحت

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ان مفسرین کا مطلب ومقصد، شب برأت کا انکار ونفی نہیں ہے؛ بل کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات میں ''لیلۂ مبارکہ'' جو واقع ہوا ہے، اس کی تفسیر ''شب برأت'' سے کرنا صحیح نہیں؛ کیوں کہ اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ اس رات میں قرآن کا نزول ہوا اور قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے نہ کہ ''لیلۃ البرأت'' میں؛ لہٰذا لیلہ مبارکہ کی تفسیر میں صحیح بات یہی ہے کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے شب برأت کی بالکلیہ نفی وانکار پر استدلال درست نہیں، اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ لیلہ مبارکہ سے یہ مراد نہیں۔
جیسا کہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

''وَاَوْرَدَ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَذٰلِکَ لاَ يَسْتَلْزِمُ انها المراد بقوله في ليلة مباركة.''(۱)

(انہوں نے (سیوطی رحمۃ اللہ نے) شعبان کی درمیانی شب کی فضیلت میں وہ روایات جو اس بارے میں آئی ہیں ان کو نقل کیا ہے۔ مگر اس سے لازم نہیں آتا کہ لیلہ مبارکہ سے یہی مراد ہو۔)

بہ ہر حال بتانا یہ ہے کہ اب تک کی بحث وتفصیل سے اتنا معلوم ہوا کہ قرآن میں مذکور لیلہ مبارکہ سے شب برأت ہی مراد نہیں؛ بل کہ لیلۃ القدر مراد ہے، اب رہا یہ کہ فی نفسہ اور فی الواقع شب برأت کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ یہ مستقل مسئلہ ہے۔ اور ہمارا جواب یہ ہے کہ شب برأت یعنی شعبان کی درمیانی رات کی فضیلت بعض احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور اس کی تائید وتقویت اور بعض جزوی امور کی تفصیل میں

---

(۱) فتح القدیر شوکاني: ۴/۵۷۱

بہت سی ضعیف احادیث بھی موجود ہیں، اور کسی مصنف کو اس سے انکار کی مجال نہیں۔

شب برأت اور احادیث

(۱) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« يَطَّلِعُ اللّٰهُ اِلٰى خَلْقِهٖ فِيْ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِجَمِيْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ. »(۱)

(اللہ تعالیٰ شعبان کی درمیانی رات میں اپنی مخلوق کی طرف خصوصی توجہ فرماتے ہیں اور سوائے مشرک اور کینہ پرور کے سب کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔)

شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے السنۃ کی تعلیق میں فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے راوی قابل اعتماد ہیں؛ لیکن اس کے راوی مکحول اور مالک بن یخامر رحمہ اللہ کے درمیاں انقطاع ہے؛ لیکن اپنے شواہد کے اعتبار سے صحیح ہے۔(۲)

اور نیز ناصر الدین البانی رحمہ اللہ جو مشہور سلفی عالم ہیں، انہوں نے اس حدیث کے بارے میں ''اصلاح المساجد'' مصنفہ علامہ جلال الدین قاسمی رحمہ اللہ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اور حدیث صحیح ہے۔(۳)

یاد رہے کہ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اہل حدیث طبقہ سے تعلق رکھتے

---

(۱) صحیح ابن حبان: ۲۱/۱۴۲۱، معجم کبیر طبرانی: ۲۰/۱۰۸، موارد الظمان: ۱/۵۸۷، السنه لابن عاصم: ۱/۲۲۴

(۲) السنه لابن ابی عاصم: ۱/۲۲۴

(۳) حاشیه اصلاح المساجد مترجم: ۱۲۸، مطبوعه الدار السلفیه بمبی

ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی یہ شہادت طبقہ اہل حدیث کے لیے حجت ہے، اس کے بعد کسی کو انکار کی مجال نہ ہونا چاہیے، الا یہ کہ دلائل کی روشنی میں کوئی اس کا غلط ہونا ثابت کر دے۔

دوسری حدیث

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِذَا کَانَ لَیْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ یَنْزِلُ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا فَیَغْفِرُ لِعِبَادِہٖ اِلَّا مَاکَانَ مِنْ مُشْرِکٍ اَوْ مُشَاحِنٍ لِاَ خِیْہ.»(۱)

(جب شعبان کی درمیانی شب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نازل ہوتے ہیں اور بس اپنے بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے اس کے جو مشرک ہو یا اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہو۔)

امام بزار رحمۃ اللہ نے اس کی تخریج کے بعد فرمایا:

”وَقَدْ رُوِیَ عَنْ غَیْرِ اَبِیْ بَکْرٍ وَاِنْ کَانَ فِی اِسْنَادِہٖ شَیْءٌ فَجَلَالَةُ اَبِیْ بَکْرٍ تُحَسِّنُہٗ.“

(یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے، اس کی سند میں اگر چہ کچھ کمی ہے؛ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جلالت وعظمت اس حدیث کی تحسین کرتی ہے۔)

نیز کہا کہ عبدالملک ابن عبدالملک معروف راوی نہیں ہے؛ لیکن اہل علم نے اس

(۱) بزار: ۱/۲۰۷، اعتقاد اهل السنة: ۳/۴۳۹، السنه لابن ابی عاصم: ۱/۲۲۲

حدیث کو روایت کیا اور نقل کیا اور اس کو قبول کیا ہے؛ اسی لیے ہم نے بھی اس کا ذکر کیا۔ (۱)

علامہ مبارک پوری رحمۃ اللہ نے تحفۃ الاحوذی میں بہ حوالہ ترغیب وترھیب کہا کہ حدیث ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تخریج بزار وبیہقی نے کی ہے، جس کی سند لا بأس بہ ہے (یعنی قابل قبول) ہے۔ (۲)

شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ نے اس کی تعلیق میں اس کو صحیح قرار دیا ہے اور فرمایا کہ اس کی سند اگر چہ ضعیف ہے؛ مگر میں نے اس حدیث کو اس لئے صحیح قرار دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اس کی روایت کی گئی ہے جن کی تعداد میرے نزدیک آٹھ تک پہنچتی ہے۔ (۳)

تیسری حدیث

امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

« يَطَّلِعُ اللّٰهُ اِلٰى خَلْقِهٖ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِعِبَادِهٖ اِلَّا اِلاثْنَيْنِ مُشَاحن وَقَاتِلُ النَّفْسِ. »

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی شعبان کی درمیانی رات میں اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دو آدمیوں کے سوا سب بندوں کی مغفرت فرما دیتے ہیں ایک کینہ پرور، دوسرے خودکشی

(۱) مسند بزار: ۱/۲۰۷

(۲) تحفة الاحوذی: ۳/۳۶۵

(۳) السنہ لا ابن عاصم: ۱/۲۲۳

کرنے والے کی۔)(۱)

اس حدیث کے بارے میں مسند احمد کے محقق علامہ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ اس کی تعلیق میں فرماتے ہیں ''اسنادہ صحیح'' یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے اور علامہ نور الدین ہیثمی رحمۃ اللہ نے اس کو مجمع الزوائد میں نقل کر کے فرمایا کہ اس کو احمد رحمۃ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابن لہیعہ رحمۃ اللہ راوی ہیں اور یہ ''لین الحدیث'' (کمزور) ہیں اور باقی راوی سب ثقہ ہیں۔(۲)

علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ نے ابن لہیعہ رحمۃ اللہ کے سوا سب راویوں کی توثیق کی ہے، رہا ابن لہیعہ رحمۃ اللہ کا معاملہ تو بات یہ ہے کہ ان کے متعلق محدثین کی رایوں میں اختلاف ہے، بعض محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور بعض محدثین نے ان کی توثیق فرمائی ہے؛ اس لیے ان کو مطلقا ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے ان کی توثیق وتعریف کی ہے اور فرمایا کہ حدیث کی کثرت وضبط واتقان میں مصر میں ابن لہیعہ رحمۃ اللہ جیسا کون تھا؟ یعنی کوئی وہاں ان کے مرتبہ کا نہیں اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ابن لہیعہ رحمۃ اللہ کے پاس اصول ہیں اور ہمارے پاس فروع نیز کہا کہ میں نے کئی حج صرف اس لیے کیے کہ ابن لہیعہ رحمۃ اللہ سے ملاقات کروں، اسی طرح احمد بن صالح رحمۃ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے۔(۳)

ایسے راوی کو مطلقا ضعیف قرار دینا صحیح نہیں؛ اسی لیے بہت سے محدثین ان کی حدیث کو صحیح یا کم از کم حسن قرار دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ مذکورہ حدیث کی سند یا تو صحیح

---

(۱) مسند احمد: ۱۰/ ۱۲۷۔ حدیث: ۶۶۴۲

(۲) مجمع الزوائد: ۸/ ۶۵

(۳) تہذیب التہذیب: ۵/ ۳۷۵

ہے، جیسا کہ احمد محمد شاکر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا، یا کم از کم حسن تو ضرور ہے۔

چوتھی حدیث

حضرت عوف بن مالک رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے رویت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« يَطَّلِعُ اللّٰهُ عَلٰى خَلْقِهٖ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُلَهُمْ كُلُّهُمْ اِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ. »

(اللہ تعالیٰ شعبان کی درمیانی رات میں اپنی مخلوق پر توجہ فرماتے ہیں پس سب کی مغفرت فرمادیتے ہیں سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔)(۱)

علامہ ہیثمی رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں کہ اس کو بزار نے روایت کیا اور اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم راوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ہیں، احمد بن صالح رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ان کی توثیق کی ہے اور جمہور نے تضعیف کی ہے، دوسرے اس سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہیں، باقی سب راوی ثقہ ہیں۔

ابن لہیعہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کے بارے میں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان کی تضعیف بعض نے کی ہے، نہ کہ سب نے اور عبدالرحمٰن ابن زیاد بن انعم رَحِمَہُ اللّٰہُ بھی ابن لہیعہ کے درجہ کے راوی ہیں اور نہ صرف احمد بن صالح رَحِمَہُ اللّٰہُ نے؛ بل کہ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن المبارک اور سفیان ثوری رَحِمَہُمَا اللّٰہُ جیسے حضرات نے ان سے روایت کی ہے اور یحییٰ بن سعید، امام بخاری رَحِمَہُمَا اللّٰہُ جیسے حضرات نے ان کی توثیق کی ہے اور احمد بن صالح رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ان

(۱) مجمع الزوائد: ۸/۶۵، مسند بزار: ۱۸۶۳۸

پر تنقید کی ہے اور ان کے قول کو غیر مقبول قرار دیا ہے، جنہوں نے عبدالرحمٰن بن زیاد پر جرح کی ہے۔(۱)

لہٰذا ان کی روایت بھی کم از کم حسن ہوگی اور پھر پہلی روایت سے تائید پاکر ضرور قابل قبول ٹھہرے گی۔

پانچویں حدیث

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«يَنْزِلُ رَبُّنَا تبارَكَ وَتَعَالٰى اِلٰى سَمَاءِ الدُّنُيا لَيُلَةَ النِّصُفِ مِنُ شَعُبَانَ فَيَغُفِرُ لِاَهُلِ الْاَرُضِ اِلَّالِمُشُرِكٍ أَوُ مُشَاحِنٍ.»(۲)

(ہمارا رب شعبان کی درمیانی شب میں آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے، سوائے مشرک اور کینہ پرور کے تمام اہل زمین کی مغفرت فرما دیتا ہے۔)

اس حدیث کو بھی شیخ البانی رحمہ اللہ نے السنۃ کی تخریج میں سنداً ضعیف ہونے کے باوجود شواہدات کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے۔

چھٹی حدیث

حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اِذَا كَانَ لَيُلَةُ النِّصُفِ مِنُ شَعُبَانَ يَطَّلِعُ اللّٰهُ اِلٰى خَلُقِهٖ

(۱) تهذيب التهذيب: ۱۷۴/۶

(۲) السنه لابن ابى عاصم: ۲۲۲/۱، اعتقاد اهل السنه، لالكائى: ۴۴۷/۳

فَيَغْفِرُ لِلْمُؤْ مِنِيْنَ وَيَتْرُكُ اَهْلَ الضَّغَائِنِ وَاَهْلَ الْحِقْدِ بِحِقْدِ هِمْ. »(۱)

(جب شعبان کی درمیانی شب ہوتی ہے تو اللہ تعالی اپنی مخلوق پر توجہ فرماتے ہیں اور مومنین کی مغفرت فرما دیتے ہیں اور بغض رکھنے والوں کو ان کے بغض کی وجہ سے (مغفرت کئے بغیر) چھوڑ دیتے ہیں۔)

السنۃ کی تخریج میں شیخ البانی رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور احوص بن حکیم رَحِمَہُ اللہُ کے علاوہ اس کے تمام راوی ثقہ ومعتبر ہیں، احوص حافظہ میں کمزور ہیں، جیسا کہ تقریب میں لکھا ہے؛ مگر ان کے جیسے راوی سے استشہاد کیا جا سکتا ہے، پس جو روایت اس کے بعد ہے اور جو شواہدات اس سے پہلے گذرے ہیں، ان سے یہ قوی ہو جاتی ہیں۔

خلاصہ کلام

ان تمام تفصیلات وتحقیقات سے روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ شب براٴت کی فضیلت میں صحیح حدیث وارد ہوئی ہے؛ کیوں کہ سند میں کلام ہونے کے باوجود متعدد سندوں کی وجہ سے یہ درجہ صحت کو پہونچ چکی ہے اور بعض حدیثوں پر تو علما نے صاف طور پر صحیح ہونے کا حکم بھی لگایا ہے، جیسا کہ اوپر حوالہ گزر چکا، خصوصاً علامہ ناصر الدین البانی رَحِمَہُ اللہُ کا کہ وہ حدیث کے معاملہ میں بڑے سخت واقع ہوئے ہیں، پھر بھی انہوں نے حضرت معاذ ؄ کی حدیث کو صاف طور پر صحیح قرار دیا ہے۔

اس کے بعد کسی اہلِ حق اور منصف کو مجال انکار نہیں، اور جو لوگ حدیث پر عمل

(۱) السنتہ لا بن ابی عاصم: ۲۲۴/۱

کے مدعی ہیں، ان کو تو اس میں اور زیادہ حق پرستی اور حدیث سے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو قبول کرنا چاہئے۔

علامہ مبارک پوری کا ارشاد

ہم یہاں مشہور اہلِ حدیث عالم علامہ عبد الرحمان مبارک پوری رحمہ اللہ جو اپنے وقت کے بڑے محدث بھی مانے جاتے ہیں، اور اہلِ حدیث کے نزدیک ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کا اس سلسلہ میں ارشاد نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی میں پہلے تو فرمایا:

" اعلم انه قد ورد في فضيلة ليلة النصف من شعبان عدة احاديث مجموعها تدل على أن لها اصلا".

(جان لو کہ شبِ برأت کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں، ان سب کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی اصل ہے۔)

پھر چند احادیث نقل کرکے اخیر میں فرمایا:

" فهذه الاحاديث بمجموعها حجة على من زعم أنه لم يثبت في فضيلة ليلة النصف من شعبان شي." (١)

(یہ احادیث اپنے مجموعہ کے اعتبار سے ان لوگوں کے خلاف حجت ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ شعبان کی درمیانی شب کی فضیلت میں کوئی بات ثابت نہیں۔)

غور فرمایا جائے کہ علامہ مبارک پوری کس قدر وضاحت سے فرمارتے ہیں کہ جو لوگ یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ شب برأت کی فضیلت ثابت نہیں، ان پر یہ احادیث

(١) تحفة الاحوزی: ٣/٣٦٧

حجت ہیں، اگر پھر بھی ان کو کوئی نہ مانے تو کیا علاج؟

علامہ عبید اللہ مبارک پوری کی وضاحت

نیز علامہ عبید اللہ مبارک پوری رحمۃ اللہ کہ وہ بھی اہل حدیث علماء میں سے ہیں اور انہوں نے مشکوۃ کی شرح بھی لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

" لكنه ورد في فضيلة ليلة النصف من شعبان احاديث اخرى وهي بمجموعها حجة على من زعم أنه لم يثبت في فضيلتها شئ." (۱)

(لیکن شعبان کی درمیانی شب (شب برأت) کی فضیلت میں دیگر احادیث وارد ہوئی ہیں اور یہ احادیث اپنے مجموعہ کے اعتبار سے ان کے خلاف حجت ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ اس کی فضیلت میں کچھ ثابت نہیں۔)

نیز آگے چل کر اس سلسلہ کی بہت سی احادیث کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض احادیث سند حسن سے ثابت ہیں۔ نیز حدیث معاذ (جو ہم نے اوپر نقل کی ہے) کے بارے میں علامہ زرقانی رحمۃ اللہ سے نقل کیا کہ وہ حسن ہے، صحیح نہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں:

" وهذه الاحاديث كلها تدل على عظم خطر ليلة نصف شعبان و جلالة شا نها وقد رها و انها ليست كا لليا لى الاخر فلا ينبغي أن يغفل عنها بل يستحب احياء ها با لعبادة والدعاء والذكر والفكر." (۲)

---

(۱) مرعاۃ شرح مشکوۃ: ۳/۳۲۵

(۲) مرعاۃ: ۴/۳۴۱-۳۴۲

(یہ ساری حدیثیں شعبان کی درمیانی شب کی عظمت اور اس کی شان جلالت پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر بھی کہ یہ رات دیگر اور راتوں کی طرح نہیں ہے، لہٰذا اس سے غفلت برتنا مناسب نہیں، بلکہ عبادت، دعاء، ذکر اور فکر کے ذریعہ اسمیں جاگنا مستحب ہے۔)

خاتمۃ الکلام

ان حوالجات اور تفصیلات سے بہ خوبی واضح ہوگیا کہ ''شب برأت'' کی فضیلت ثابت ہے اور خود اہل حدیث علما اس کے قائل ہیں۔ اور رات میں جاگنے اور عبادت کرنے کو مستحب قرار دیتے ہیں؛ مگر افسوس کہ آج اہل حدیث لوگوں کا عام نقطہ نظر یہ ہوگیا ہے کہ شب برأت کوئی چیز نہیں۔ حالاں کہ اہل حدیث علما نے اس نقطہ نظر پر تنقید کی ہے، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالی سچی فہم اور اچھی نظر عطا فرمائے اور ہر ایک کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منکرات شب برأت

شب برأت کی عظمت اور فضیلت احادیث کی روشنی میں ایک ثابت شدہ امر ہے اور ہر زمانے میں علمائے کرام اور بزرگانِ دین نے اس رات کے ساتھ عظمت وحرمت ہی کا معاملہ فرمایا ہے۔

مگر اس عظمت اور فضیلت والی رات کو من گھڑت رسومات و بدعات اور خلاف عقل وشرع خرافات سے لوگوں نے ضائع کرنا شروع کر دیا ہے، فضیلت والے مہینے ہوں یا دن، ان کا ورود وظہور خدا کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کی قدر کرتے ہوئے ان ایام وشہور کو اللہ کی رضا جوئی میں صرف کرنا دین وعقل دونوں کا اقتضا ہے؛ مگر افسوس کہ اس شب میں عجیب طرح کے خرافات اور من گھڑت رسومات کو رائج کیا گیا ہے، اور دین کی اصل شکل وصورت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ شب برأت کے اس منکرات کو بیان کر کے انکا رد کیا جائے تا کہ ہم سب شیطانی چالبازیوں سے بچے رہیں۔ واللہ الموفق

آتش بازی کی رسم

شب برأت کے موقعہ پر آتش بازی اور پٹاخے چھوڑنے کی رسم اکثر علاقہ میں رائج ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ شب برأت جیسی عظیم رات کے ساتھ اس قبیح رسم کو کس نے اور کب جوڑا؟ لیکن جس نے بھی یہ کیا انتہائی درجہ کی معصیت کا مرتکب ہوا؛ کیوں کہ آتش بازی ایک تو سراسر غیر اسلامی اور مشرکین کی رسم ہے۔ چناں چہ غیر مسلموں

میں شادی کے موقعہ پر، عید و تہوار کے موقعے پر اور دیگر اور خاص مواقع پر اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں غیر قوموں کی مشابہت اختیار کرنے پر سخت پابندی عائد کی گئی ہے۔

حدیث میں ہے سرکار دو عالم صَلَّی اللہُ علیہِ وسلَّم نے فرمایا:

« من تشبه بقوم فهو منهم. » (۱)

(جو شخص کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں سے شمار ہوگا۔)

اب اندازہ کیجئے کہ جو لوگ شب برأت میں اس غیر اسلامی بے ہودہ رسم کو اختیار کرتے ہیں، وہ اس حدیث پاک کے مطابق کن لوگوں میں شمار ہونگے، دوسرے اس میں مال و دولت کی تضییع ہے کہ اللہ کی نعمت یوں حرام میں اڑایا جائے حدیث پاک میں نبی کریم صَلَّی اللہُ علیہِ وسلَّم نے مال کو ضائع کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ علیہِ وسلَّم نے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ تعالی نے تمہارے لیے ان چیزوں کو منع فرمایا ہے۔ (۱) ماؤں کی نافرمانی کرنا۔ (۲) لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا۔ (۳) دوسروں کے حقوق ادا نہ کرنا۔ (۴) کسی کا مال ناحق طور پر لینا۔

اور ان چیزوں کو مکروہ قرار دیا ہے، یعنی ناپسند ٹھہرایا ہے۔ (۱) فضول ولایعنی بات چیت۔ (۲) خواہ مخواہ کہ سوالات کی کثرت۔ (۳) مال کو ضائع کرنا۔ (۲)

اس طویل حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مال و دولت کو برباد کرنا، ضائع کرنا، اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ نیز قرآن شریف میں ہے:

---

(۱) ابوداود: ۲/۹۵۵، مسند احمد: ۲/۹۲، مسند بزار: ۷/۳۶۸

(۲) بخاری: ۱/۳۲۴، الادب المفرد: ۱۵، موطا مالک: ۳۸۸، مسلم: ۲/۷۵

﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْراً اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنَ﴾ (بنی اسرائیل : ۲۷)

(فضول خرچی نہ کرو، کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔)

دوسری جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الأعراف : ۳۱)

(کھاؤ، پیو، مگر اسراف نہ کرو؛ کیوں کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

سوچئے! کہ پٹاخے چھوڑنے کی رسم، اضاعت مال، تبذیر و اسراف اور فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے اور اللہ تعالی نے اس پر ایک تو یہ فرمایا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، یعنی وہ بھی شیطان ہیں جیسے شیطان کا بھائی شیطان ہی ہوگا نہ کہ کچھ اور۔ دوسرے یہ فرمایا کہ اللہ تعالی اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالی کا کسی کو ناپسند کرنا، اس کا انتہائی درجہ کا عذاب ہے۔ اس سے بڑا کیا عذاب اور کیا مصیبت کہ اللہ تعالی کی نظر سے ناپسندیدہ ٹھہریں۔

غرض اسلام میں آتش بازی کی رسم کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس میں غیروں سے مشابہت، اضاعت مال و دولت اور اسراف و تبذیر کہ گناہ شامل ہیں۔

پھر دنیوی اعتبار سے دیکھئے تو یہ سخت خطرہ کی چیز ہے، چناں چہ ہندوؤں کے تہوار دیوالی کے موقعہ پر ان پٹاخوں سے ہمیشہ نقصانات ہوتے ہیں، جانی نقصانات بھی، مالی نقصانات بھی، اسی طرح شب برأت کے موقعہ پر بھی نقصانات ہوتے ہیں، تو اس اعتبار سے بھی یہ رسم قابل ترک ہے۔ غرض یہ قبیح رسم غیروں کی رسم ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

گھروں کی لیپ پوت

شب برأت کے موقعہ پر بہت سے لوگوں میں ایک رواج یہ ہے کہ گھروں کی مرمت لپائی پتائی کا کام کرواتے ہیں، گھروں کی مرمت اور پینٹنگ ایک دنیوی ضرورت کا کام ہے، جب ضرورت محسوس ہوتو کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ شعبان کا مہینہ ہو یا رجب کا یا کوئی اور، اسی طرح کوئی دن بھی اس کے لیے مقرر نہیں، مگر شب برأت یا شعبان کی تخصیص کے ساتھ اس عمل کا اہتمام دین میں اضافہ اور بدعت ہے، اس لیے کہ بدعت نام ہے اس عمل کا جو شریعت کے اصول سے ثابت نہ ہو اور اسکو دین سمجھ کر کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ گھروں کی لپائی پتائی اور مرمت کا کام شب برأت میں بالتخصیص کرنے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے، اب اس کو ایک دنیوی کام سمجھ کر کوئی کرے اور شب برأت کا کوئی مخصوص عمل نہ سمجھے تو درست ہے؛ لیکن اس کو شب برأت یا شعبان کا عمل سمجھنا اور دین کا کام خیال کرنا بدعت نہیں تو اور کیا ہے؟ لہٰذا اس کو بھی ترک کرنا چاہیئے۔

شب برأت کا حلوا

شب برأت کی بدعات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں حلوا پکانے اور کھانے کھلانے کو ضروری یا فضیلت کا کام سمجھا جاتا ہے، یہ بھی سراسر بدعت اور دین میں اضافہ ہے۔

کیوں کہ شب برأت میں حلوا کھانے کھلانے کا کوئی ثبوت شریعت کے اصولوں سے نہیں ہوتا اور لوگ اس کو ایک دین کا کام سمجھ کر کرتے ہیں؛ لہٰذا یہ بدعت ہے۔

بعض لوگ اس رسم و بدعت کو ثابت کرنے کے لیے من گھڑت باتوں سے

استدلال کرتے ہیں۔ چناں چہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا دندان مبارک جب شہید ہوا تھا تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے حلوا نوش فرمایا تھا، اس لیے ہم بھی حلوا پکا کر کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ان دنوں میں واقع ہوئی ہے۔ یہ حلوا ان کی فاتحہ ہے۔

مگر یہ دونوں باتیں بے اصل اور موضوع ہیں، جہاں تک پہلے واقعہ یعنی رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے دندان مبارک کی شہادت کے واقعہ کا تعلق ہے، یہ شعبان میں پیش ہی نہیں آیا؛ بل کہ یہ واقعہ ماہ شوال کا ہے، کیوں کہ آپ کے دندان مبارک غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے اور واقعہ غزوۂ احد ۳ر ہجری ماہ شوال میں پیش آیا تھا، جیسا کہ کتب تاریخ وسیر میں مذکور ہے۔ (۱)

غرض کتب تاریخ وسیر میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ دندان مبارک کی شہادت کا واقعہ جنگ احد میں پیش آیا تھا اور احد کی جنگ شوال کے مہینہ میں ہوئی تھی تو شب برأت سے اس واقعہ کو جوڑنا سراسر جہالت ہے، پھر اس موقعہ پر حلوا پکا کر کھانے کا ذکر کسی روایت میں نہیں ملتا اور اگر بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنگ احد کے موقعہ پر دندان مبارک کے ٹوٹ جانے کی بنا پر آپ نے حلوا پکا کر کھایا تو اس سے آخر شب برأت کو کیا نسبت و تعلق ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ شہادت دندان کا واقعہ شب برأت میں ہوا تھا، تب بھی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ آپ نے دندان کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے حلوا کھایا، مگر اس کو شب برأت سے کیا تعلق ہے، کیا آپ کا حلوا کھانا شب برأت کی وجہ سے تھا یہ تو خود اس موضوع و من گھڑت روایت میں بھی نہیں ہے۔

---

(۱) دیکھو: فتح الباري: ۷/۳۴۷، سیرت ابن هشام: ۲/۶۰، سیرت النبی شبلي: ۱/۲۱۴، سیرت المصطفیٰ: ۱/۶۴۸، رحمة اللعالمین: ۲/۱۸۹

پھر ذرا سوچئے کہ اتباع سنت کا ایسا ہی شوق ہے تو چاہیے تھا کہ اویس قرنی کی طرح پہلے اپنے دانت بھی توڑ لیے ہوتے پھر حلوا کھاتے ۔ یہ اتباع سنت اور عشق نبوی کی عجیب قسم ہے کہ حلوا کھانے کو تو تیار، مگر دانت نہیں توڑتے ،تعجب ہے: پہلے جہاد فرمایئے اور دنیا میں دین کے قیام کی پوری کوشش کیجئے، پھر ضرورت پڑے تو حلوا تناول فرمایئے ،مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ شریعت کو دن رات پامال کرتے ہیں، نمازوں کو برباد کرتے ہیں،سنتوں کا خون کرتے ہیں، ایسے لوگ بھلا کیا اتباع کریں گے، یہ سنت کا اتباع نہیں، بلکہ نفس کی پیروی ہے۔

رہا یہ کہنا کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اس دن ہوئی تھی، اس کے لیے حلوے پر فاتحہ پڑھتے ہیں، اس میں بھی دو طرح کلام ہے۔

اولاً یہ کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی غزوہ احد میں ہوئی تھی جو کہ شوال میں ہوا تھا، لہٰذا یہ کہنا صریح جہالت ہے کہ شعبان یا شب برأت میں ان کی شہادت ہوئی، دوسرے یہ کہ اگر اس دن شہادت ہوئی بھی ہو تو یہ فاتحہ اور حلوا، اس میں کہاں سے ثابت ہوا؟ یہ تو محض ایجاد بندہ ہے، ایصال صواب کا یہ طریقہ شریعت سے قطعا ثابت نہیں، بلکہ شریعت میں احداث واضافہ ہے، جیسا کہ احقر نے اپنی کتاب سفر آخرت کے اسلامی احکام میں لکھا ہے، اس کو ملاحظہ کیا جائے، لہٰذا یہ شب برأت کا حلوا سوائے تصنیف یاران و ایجاد بندہ کے کچھ نہیں، اس لیے یہ ترک کرنے کے قابل ہے۔

روحوں کے آنے کا اعتقاد

بعض لوگوں میں شب برأت کے متعلق یہ اعتقاد رائج ہے کہ اس رات مردوں کی روحیں اپنے اپنے لوگوں سے ملنے گھروں کو آتی ہیں، یہ اعتقاد بھی بے اصل ہے، کسی حدیث یا آیت یا اور کسی شرعی دلیل سے شب برأت میں روحوں کے آنے کا

ثبوت نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ بلا شرعی دلیل کے یہ بات کس طرح مان لی جائے کہ شب برأت کے موقعہ پر روحیں آتی ہیں؟

پھر اس بے اصل بات کو لیکر بعض لوگ اپنے گھروں میں عجیب طرح کی خرافات کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ وہ یہ کہ روحوں کے لیے دستر خوان بچھا کر ان کے لیے کھانے چنے جاتے ہیں اور اس میں اپنے مردوں کی پسندیدہ اشیاء جوڑتے ہیں، حتی کہ اگر کسی کو سگریٹ، بیڑی کا شوق تھا تو دستر خوان پر اس کو بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں خلاف شریعت ہونے کے ساتھ خلاف عقل بھی ہیں، خلاف شرع تو اس لیے کہ شرعی دلائل سے ان کا ثبوت نہیں ہوتا۔ شب برأت اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے میں بھی آتی رہی اور حضرات صحابہ اور تابعین کے دور میں بھی آتی رہی ؛مگر نہ روحوں کی آمد کا عقیدہ کسی نے پیش کیا ،نہ ان کے لیے دستر خوان چنا گیا۔

اگر یہ بات ہوتی تو ان حضرات سے ضرور اس سلسلہ میں کوئی بات ثابت ہوتی، بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر شب برأت میں روحوں کے آنے کی بات صحیح ہوتی تو اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس رات قبرستان کیوں تشریف لے جاتے؟ (جیسا کہ ایک ضعیف روایت میں اس کا ذکر آتا ہے اور امام ترمذی رَحِمَہُ اللّٰہُ وغیرہ نے اس کو روایت کیا ہے اور احقر نے اپنے مضمون ماہ شعبان، فضائل واعمال میں اس روایت پر کلام کیا ہے۔)

اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس روایت کے مطابق سوتے سوتے بستر سے اٹھ کر قبرستان تشریف لے گئے اور مردوں کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ سوال یہ ہے کہ مردے اگر آتے تو آپ وہاں کیوں جاتے؟ پھر اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم

نے اس رات نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بیدار کیا او نہ کسی صحابی کو جگایا، یا بتایا کہ اٹھو آج روحیں آتی ہیں، ان کے لیے دستر خوان جوڑو، سوچئے کہ جو بات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و اسلاف نے بیان نہیں کی اس کو عقیدہ بنانا اور خرافاتی کام کرنا، کہاں تک درست؟ پھر یہ کام عقل کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ جو لوگ مر گئے وہ اگر دوزخی ہیں تو وہ اس رات کس طرح چھٹکارہ پا کر گھروں کو آسکتے ہیں؟ اور اگر وہ لوگ جنتی ہیں تو کیا جنت کی نعمتیں و لذتیں چھوڑ کر دنیا کی یہ حقیر چیزیں کھانے آئیں گے؟ پھر سوچئے کہ کیا وہ جنت سے سگریٹ اور بیڑی کا مزہ لینے یہاں آئیں گے۔ کس قدر عقل کے خلاف ہے یہ عقیدہ و عمل۔ افسوس کہ دنیا کے معاملات میں لوگ بڑے عقل مند ہو جاتے ہیں؛ مگر دین کے معاملے میں بے عقل بن جاتے ہیں۔ غرض یہ عقیدہ اور اس پر متفرع اعمال و افعال بھی غیر اسلامی ذہن کی پیداوار ہیں۔ لہذا یہ بھی قابل ترک ہے۔

اس سلسلہ کا ایک اور بے ہودہ خیال لوگوں میں رائج ہے۔ وہ یہ کہ شب برأت سے پہلے جو کوئی مر جائے وہ اس وقت تک مردوں میں شامل نہیں ہوتا جب تک کہ شب برأت میں اسکے لیے فاتحہ نہ کی جائے۔ یہ بھی محض فضول خیال اور بے اصل عقیدہ ہے، پھر مردوں میں شامل نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ زندوں میں شامل رہتا ہے؟ غرض یہ بھی غلط و فاسد عقیدہ ہے۔

مساجد کو سجانا اور سنوارنا

بعض علاقوں میں رواج ہے کہ شب برأت میں مساجد کو سجاتے ہیں اور سنوارتے ہیں، کہیں قمقموں سے، کہیں چمکدار کاغذوں سے اور دوسری چیزوں سے۔ علماء نے لکھا ہے کہ مساجد میں اس موقعہ پر یا کسی ایسے موقعہ پر بلاوجہ اور بے ضرورت

روشنی کرنا، بدعت ہے۔ یہاں ہم علامہ شاطبی رَحِمَہُ اللہُ کے چند جملے نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔آپ نے اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں لکھا ہے:

''مساجد میں آگ روشن کرنا (چراغ جلانا) سلف صالحین کی شان نہیں تھی، اور نہ اس کے ذریعہ مساجد کو مزین کیا جاتا ہے۔ پھر بعد میں چراغ جلا کر مزین کرنے کی بدعت جاری ہوئی۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مساجد میں زائد از ضرورت چراغ جلانے کی رسم سلف صالحین کے بعد بدعتیوں کی ایجاد ہے اور اس زمانے میں جو حکم چراغ کا تھا وہی حکم اس زمانے میں قمقموں کا ہوگا۔لہٰذا یہ بھی بدعت ہوگا۔ بلکہ ملا علی قاری رَحِمَہُ اللہُ نے نقل کیا ہے کہ یہ چراغاں کرنے کی رسم برامکہ نے جو آگ کے پجاری تھے، جاری کی تھی، جب اسلام میں داخل ہوئے تو اسلام میں ایسی چیزیں داخل کیں جو دین کی سنت ہونے کا وہم پیدا کرتی تھیں اور ان کا مقصد آگ کی عبادت ہوتا تھا کہ جب رکوع سجدہ کریں گے تو اس آگ کی طرف جھکیں۔ (۲)

پھر اس میں مال کی اضاعت و اسراف کا گناہ بھی شامل ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں ہندوؤں اور عیسائیوں سے مشابہت ہے کہ یہ لوگ اپنے تہواروں میں اپنے مندروں اور چرچوں کو اسی طرح سجاتے اور سنوارتے ہیں۔

لہٰذا اس سے بھی بچنا چاہئے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے اپنے فتاوی میں تفصیلی گفتگو کی ہے اور آخر میں یہ تحریر کیا ہے:

''خلاصہ یہ کہ شب برأت اور شب قدر وغیرہ میں مساجد کو زیادہ

---

(۱) الاعتصام: ۲/۲۷۳

(۲) مرقات: ۳/۱۹۸

مزین کرنا اور زیادہ روشنی کرنا اور چراغاں کی صورت اختیار کرنا دوسری بدعت ہے۔"(۱)

مساجد میں اجتماع

شب برأت میں عبادت کرنا بعض ضعیف روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ وغیرہ میں ہے:

"اس رات میں عبادت کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھو"۔ (۲)

مگر عبادت کے لیے مسجد میں جمع ہونا خیر القرون کی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ وہاں تو نفلی عبادات چھپ کر اپنے گھروں میں کی جاتی تھیں، اسی وجہ سے علماء کرام وفقہاء عظام نے شب برأت، لیلۃ القدر، رمضان کے عشرہ اخیرہ کی راتوں، عرفہ اور عیدین کی راتوں میں عبادت کے لئے مساجد میں اجتماع کو مکروہ لکھا ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ 'البحر الرائق" میں فرماتے ہیں:

"ان راتوں میں سے کسی رات میں جاگنے کے لئے مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے۔"(۳)

علامہ حسن بن عمارہ الشرنبلالی رحمۃ اللہ مشہور فقیہ گزرے ہیں، انہوں نے نور الایضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں لکھا ہے:

"لیکن ان راتوں میں سے کسی رات میں شب بیداری کے لیے مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

(۱) امداد المفتیین: ۲۱۱

(۲) ابن ماجہ: ۱/۹۹

(۳) البحر الرائق: ۲/۵۲

آپ کے اصحاب نے ایسا نہیں کیا۔لہٰذا اکثر علماء نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔"(۱)

ان عبارت سے واضح ہوا کہ ان راتوں میں شب بیداری اور عبادت کے لیے مساجد میں جمع ہونا منکر اور برا ہے۔ ہاں بلا کسی اہتمام کے کوئی مسجد میں آ گیا اور عبادت میں مشغول ہو گیا تو ٹھیک ہے؛ مگر اس کا اہتمام نہ کیا جائے۔ جیسا کہ آج کل عام رواج ہو گیا ہے۔

شب برأت کی مخصوص نماز کی بدعت

شب برأت میں عبادت کرنا مستحب ہے، جیسا کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے اور بزرگان سلف سے بھی اس کے اہتمام کی روایت ملتی ہے؛ مگر اس رات میں کوئی مخصوص عبادت صحیح احادیث سے ثابت نہیں، جیسے بعض لوگوں نے "اشغال شب برأت" کے نام سے ایک کتابچہ میں بعض مخصوص نمازوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً سو رکعات پڑھی جائیں، ہر رکعت میں سو بار "قل ھو اللہ احد" پڑھی جائے وغیرہ۔ یہ بات ثابت نہیں اور جو بعض محدثین نے اس قسم کی روایات اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں، ان کو خود فن حدیث کے ائمہ نے موضوع و باطل قرار دیا ہے۔علامہ عینی رحمہ اللہ نے شب برأت کی نماز میں آئی احادیث کو موضوع کہا ہے۔اسی طرح علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے یہ سو رکعت والی حدیث کے بارے میں صراحت کی ہے کہ یہ موضوع ہے۔(۲)

---

(۱) نور الایضاح: ۹۵،مراقی الفلاح علی ھامش الطحطاوی: ۲۱۹

(۲) موضوعات: ۲/ ۱۲۷-۱۳۰،تحفۃ الاحوذی: ۳-۳۶۵،مرقات: ۳/ ۱۹۷، معارف السنن: ۵/ ۴۱۹

لہٰذا اس رات میں نفل نماز سادہ اور عام طریقہ پر پڑھی جائے یا اور کوئی عبادت، ذکر، تلاوت وغیرہ کی جائے جو بات احادیث سے ثابت نہ ہو، اس کو اختیار کرنا گمراہی اور ضلالت ہے، کیوں کہ یہ بدعت ہے اور ہر بدعت کو اللہ کے رسول عَلَیْہِ السَّلَام نے ضلالت قرار دیا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ اس رات نفل نماز میں بعض جگہ جماعت کا اہتمام کیا جاتا ہے یہ بھی ایک بدعت ہے۔ نفل نماز میں جماعت کا اہتمام ثابت نہیں ہے۔

اس مسئلے پر احقر کا ایک مستقل رسالہ شائع ہو چکا ہے ''جماعت تہجد کا شرعی حکم'' اس کو دیکھا جائے۔ اسی طرح احقر کا دوسرا رسالہ ''منکرات رمضان'' میں بھی اس پر تفصیلی بحث ہے۔

زیارتِ قبور میں غلو

شب برأت میں ایک موقعہ پر اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام کا قبرستان تشریف لے جانا ایک ضعیف روایت سے ثابت ہے، جس کو امام ترمذی رَحِمَہُ اللّٰہ نے اپنی سنن میں اور ابن ماجہ رَحِمَہُ اللّٰہ نے اپنی سنن میں بروایت حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا ذکر کیا ہے۔(۱)

اس روایت میں علماء حدیث نے کلام کیا ہے (جیسا کہ میں نے گذشتہ مضمون ''شعبان کے فضائل واعمال'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔)

یہ واقعہ تو ضعیف حدیث سے معلوم ہوا ہے، دوسرے اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زندگی میں صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ تسامح برتتے ہوئے ضعیف حدیث کے باوجود اس کو کسی درجہ میں قابل اعتناء ولائق اعتبار اس لیے مان

(۱) ترمذی: ۱/۱۵۶، ابن ماجہ: ۱/۹۹

لیں کہ فضائل کے باب سے متعلق ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ کبھی کبھی بلا کسی خاص اہتمام کے شب برأت میں قبرستان جا کر مردوں کے حق میں دعاء مغفرت کی جاسکتی ہے۔ اور علماء نے اگر شب برأت کے اعمال میں قبرستان جانے کا ذکر کیا ہے تو وہ بس اسی حیثیت سے کیا ہے۔ تیسرے یہ قبرستان جانا شب برأت کی وجہ سے نہ تھا، بل کہ مسلم کی حدیث کے مطابق آپ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری میں ہمیشہ یہ معمول رہا کہ آپ جنت البقیع تشریف لے جاتے تھے۔

چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی میری رات کی باری ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رات میں بقیع قبرستان میں تشریف لے جاتے اور ان پر سلام کرتے اور ان کے لیے دعاء فرماتے۔ (۱)

غرض اس عمل کا شب برأت سے کوئی تعلق نہیں؛ مگر اب اس میں سال بسال غلو ہوتا جارہا ہے، قبرستان کیا ہے؟ ایک میلہ بنا ہوا ہے، اس رات وہاں جانے کے لیے مستقل سواریاں چلتی ہیں، ایک دوسرے کو ترغیب دی جاتی ہے، لوگ پورے اہتمام سے وہاں جاتے ہیں، پھر قبرستان کے پاس دیکھئے تو ہر طرح کے پھولوں کے دکانیں نظر آتی ہیں، لوگ وہاں سے پھول خرید خرید کر قبروں پر ڈالتے ہیں، گویا ایک مستقل میلہ ہے، اس کو شریعت میں اضافہ اور دین میں احداث نہ قرار دیا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

حدیث میں اس بات سے سختی سے منع کیا گیا ہے کہ قبروں کے پاس جمع ہو کر میلہ کی شکل اختیار کی جائے۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لاَ تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْداً. »

(میری قبر کو عید مت بنالینا۔)(۲)

---

(۱) مسلم: ۱/۳۱۳

(۲) ابو داود: ۱/۲۷۹

اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے عید کے موقعہ پر اہتمام سے سب جمع ہوتے ہیں، اس طرح میری قبر کے پاس اہتمام سے جمع نہ ہونا، جب آپ نے اپنی قبر کے پاس جمع ہونے سے منع فرمادیا تو کسی اور کی قبر پر جمع ہونے کا تو کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا۔

غرض یہ کہ جو آج زیارت قبور میں غلو ہو رہا ہے یہ بھی قابل اصلاح ہے۔ ہر کام اس کے حد کے اندر ہونا چاہئے۔ اس سے آگے جانا سخت خطرہ کی بات ہے۔ اللہ تعالی اہل اسلام کو صحیح فہم سے نوازے اور بدعات ومنکرات سے بچنے اور دین اور شریعت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

محمد شعیب اللہ خان

دیوبندیت و بریلویت
دلائل کے آئینے میں

دیوبندیت اور بریلویت کے اہم اختلافی عقائد پر قرآن وحدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اس میں نہ مناظرانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور نہ فلسفیانہ نکتہ آفرینوں اور علم کلام کے پیچیدہ علمی موشگافیوں کو جگہ دی گئی ہے؛ بل کہ سادہ وصاف قرآنی وحدیثی دلائل کو تفہیمانہ انداز میں پیش کر کے حق کو واضح کیا گیا ہے۔

از

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

مہتمم مدرسہ مسیح العلوم، آرمسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

زیر نظر رسالہ ''دیوبندیت و بریلویت'' کے ان اختلافی مسائل پر لکھا گیا ہے جن کا تعلق باب عقائد سے ہے اور آسان زبان کے استعمال کے ساتھ، تفہیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے حق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دیوبندی و بریلوی مکاتب فکر میں اگر چہ ایک طویل زمانہ سے اختلاف چلا آرہا ہے اور ان کے اختلافی مسائل پر طرفین سے ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی، مناظرانہ طرز کی بھی ہیں اور تفہیمانہ انداز کی بھی، تیز و تند لہجے میں بھی ہیں اور سنجیدہ و متین انداز کی بھی، نیز اس سلسلہ میں بے شمار مناظرے بھی ہو چکے ہیں اور ان مناظروں کے تلخ نتائج بھی زمانے نے دیکھے ہیں۔

اس کے بعد اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کی جائے۔ مگر بعض حالات نے راقم الحروف کو اس پر مجبور کیا کہ اس پر لکھا جائے۔ وہ حالات یہ کہ بعض بریلوی علماء نے اپنی سابقہ روایات کو دہراتے ہوئے سال رواں کے ماہ ربیع الاول اور اس کے بعد سیرت و میلاد کے جلسوں میں علماء دیوبند کو کافر کہا اور اس سے عوام میں انتشار و اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ حق کی تلاش میں پریشان نظر آنے لگے جس کی بنا پر دیوبندی مسلک کی وضاحت اور علماء دیوبند کے عقائد کی تشریح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ تا کہ حق و باطل کا امتیاز ہو جائے اور پریشان عوام کو دلائل کی روشنی میں ان دونوں مسلکوں میں سے حق کس کے ساتھ ہے معلوم ہو جائے۔

نیز ہم نے دیکھا کہ اصل اختلاف تو کم ہے، مگر بیان کرنے والے اس کو بڑھا چڑھا کر کے حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، اس کی توضیح کی بھی ضرورت تھی، چنانچہ راقم الحروف نے عقائد سے متعلق دیوبندی وبریلوی اختلاف کے اہم اہم مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کر کے حق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں نہ مناظرانہ طرز اختیار کیا گیا ہے اور نہ تیز وتند لہجہ، نہ علم عقائد وکلام کے دقیق مباحث وعمیق مضامین کو چھیڑا گیا ہے، اور نہ فلسفیانہ انداز کی بے تکی موشگافیوں سے کام لیا گیا ہے، بلکہ قرآن وحدیث کے واضح وصاف دلائل کو حضرات علماء مفسرین وائمہ فقہ کے اقوال وارشادات کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ حق کو کما حقہ سمجھا جا سکے۔

ناظرین سے درخواست ہے کہ حق کی تلاش وجستجو کی نیت ہی سے اس کا مطالعہ فرمائیں، تنگ نظری وتعصب سے ہرگز کام نہ لیں، کیوں کہ ہمیں اللہ ورسول علیہ السلام کی خوشنودی حاصل کرنا ہے نہ کے کسی گروہ وفرقہ وجماعت کی، اگر اس نیت سے دلائل پر غور کریں گے تو ضرور حق واضح ہو جائے گا۔ انشاء اللہ

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو قبولیت سے مشرف فرمائے اور لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت اور میرے لیے توشہ آخرت بنادے۔ آمین یارب العالمین

فقط

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

احاطہ مدرسہ مسیح العلوم بیدواڑی، بنگلور

۹ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نور اور بشر

دیوبندی اور بریلوی نظریات جن امور میں ٹکراتے ہیں، ان میں سے ایک حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور و بشر ہونے کا مسئلہ ہے۔ بریلوی مکتب فکر کے لوگ آپ کو بشر ماننے سے انکار کرتے ہیں اور نور قرار دیتے ہیں جبکہ دیوبندی مکتب فکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر قرار دیتا ہے۔ ان میں سے حق پر کون ہے؟ اس کا فیصلہ قرآن و حدیث، پھر وہ علماء و ائمہ کریں گے، جن کو دونوں مکاتب فکر کے لوگ مانتے ہیں۔

قرآن کیا کہتا ہے؟

پہلے قرآن کریم کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ ہم نے جہاں تک غور کیا، یہی سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر و انسان قرار دیتا ہے اور آپ کی جنس دراصل آدمیت بتاتا ہے، مگر اس کے ساتھ آپ کے اونچے اوصاف اور کمالات کی طرف اشارہ کرنے کے آپ کو مختلف القاب سے بھی یاد کرتا ہے اور اسی سلسلہ میں آپ کو نور بھی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحیٰ اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ واحِدٌ﴾ (الکھف : ۱۱۰)

(ترجمہ: کہہ سوائے اس کے نہیں کہ میں ایک آدمی ہوں، مانند تمہاری، وحی کی جاتی ہے طرف میری یہ کہ معبود تمہارا رب ہے۔)

اس مضمون کی ایک آیت حم سجدہ (آیت نمبر:٦) بھی ہے اور دیگر مقامات پر بھی یہ مضمون دوسرے انداز سے مذکور ہے، اس آیت میں غور کیجیے کہ کس صفائی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بشر یعنی انسان ہیں، اور "مثلکم" (تمہاری مانند) کے الفاظ نے اس معنی کو اور زیادہ واضح کر دیا کہ آپ کی جنس اور اصل وہی ہے جو دیگر انسانوں کی ہے۔ مگر چوں کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے اور آپ لوگوں کو ظلمت سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتے تھے، اس لیے آپ کو اس خصوصیت کی وجہ سے نور بھی فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾ (المائدۃ: ١٥)

(تحقیق کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آئی ہے۔)

اس آیت میں نور سے کیا مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے، بعض نے قرآن مراد لیا ہے۔ بعض نے اسلام اور بعض مفسرین نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات بابرکت کو مراد لیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور علامہ طیبی رَحِمَہُ اللّٰہُ سے اس کا اوفق ہونا نقل کیا ہے۔(۱)

علامہ قرطبی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بھی نور سے آپ کی ذات کا مراد ہونا نقل کیا ہے۔(۲)

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور پرنور عَلَیْہِ السَّلَام بشر نہیں تھے؛ بل کہ بشر ہونے کے ساتھ آپ نور بھی تھے؛ کیوں کہ آپ لوگوں کو کفر کی تاریکی سے ایمان کی روشنی کی طرف لاتے تھے۔ چناں چہ مولانا نعیم الدین مرادآبادی صاحب جو بریلوی مکتب فکر کے مشہور مفسر ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

---

(۱) روح المعاني: ٦/ ٩٧

(۲) قرطبي: ٦/ ١١٨

سید عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نور فرمایا گیا؛ کیوں کہ آپ سے تاریکی کفر دور ہوئی اور راہِ حق واضح ہوئی۔ (۱)

مذکورہ تفصیل سے قرآن کا نقطۂ نظر واضح ہوا کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اصل وجنس کے لحاظ سے بشر تھے اور راہ حق کو واضح کرنے والے ہونے کے لحاظ سے آپ نور بھی تھے۔

حدیث شریف کا فیصلہ

اس کے بعد حدیث شریف کو دیکھنا چاہئے۔امام مسلم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی صحیح میں ایک حدیث درج کی ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نماز میں بھول ہوگئی، بعد نماز آپ کو صحابہ نے بتایا۔تو آپ نے اس پر یہ الفاظ ارشا فرمائے:

" وَلٰكِن اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَنسیٰ کَمَا تَنسَوْنَ." (۲)

(لیکن میں تو ایک انسان ہوں، بھولتا ہوں جیسا کہ تم بھولتے ہو۔)

یہ مسلم شریف کی حدیث ہے جس کو دیو بندی بھی جانتے ہیں اور بریلوی بھی مانتے ہیں، نیز یہی حدیث بخاری شریف میں بھی موجود ہے۔ (۳)

نیز امام مسلم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک واقعہ درج فرمایا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مدینہ پہنچنے کے بعد لوگوں کو دیکھا کہ وہ تابیر کرتے ہیں،یعنی کھجور کے نر درخت کا پھول، مادہ درخت کے پھول سے ملا کر فصل میں اضافہ کرتے ہیں۔اس پر نبی کریم

---

(۱) خزائن العرفان سورہ مائدہ حاشیہ نمبر: ۵۸

(۲) صحیح مسلم: ۲۱۲/۱

(۳) بخاري: ۵۷/۱

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ان کو منع فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرو تو یہ اچھا ہے۔ لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تو پھل میں کمی آ گئی اور صحابہ نے اس کا ذکر حضور علیہ السلام کی خدمت میں کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّائِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ.» (۱)

(میں تو ایک انسان ہوں، جب میں دین کی کسی بات کا تم کو حکم دوں تو اس کو تھام لو اور اگر اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو میں بھی ایک انسان ہوں۔)

ان دونوں حدیثوں میں جو بخاری و مسلم کی روایت کردہ اور صحیح ہیں۔ صراحت کے ساتھ آپ نے اپنے متعلق بتایا ہے کہ میں انسان اور بشر ہی ہوں۔ لہٰذا آپ کو بشر ماننا قرآن و حدیث دونوں کے فیصلہ کے مطابق ضروری ہے۔

حضراتِ صحابہ کیا فرماتے ہیں

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم علیہ السلام کو جتنا قریب سے جانتے تھے۔ مخلوق میں سے کون اتنا قریب سے آپ کو جان سکتا ہے۔ پھر وہ حضرات آپ کی عظمت اور عزت جتنی کرتے تھے، کون اس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے بارے میں جو فرمایا وہ بلا شبہ حقیقت ہی کا انکشاف ہوگا اور ساتھ ہی آپ کی تعظیم و تکریم کا بھی پورا لحاظ اس میں کیا گیا ہوگا۔

اب دیکھئے وہ حضرات کیا فرماتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اپنا جوتا سی لیتے، کپڑا سی لیتے اور گھر میں

(۱) مشکوۃ شریف: ۲۸

وہ کام کر لیتے جو تم میں سے کوئی کر لیتا ہے اور فرمایا کہ آپ انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ الخ (۱)

امام ترمذی رحمۃ اللہ نے اس حدیث کو ''شمائل نبوی'' میں بھی روایت کیا ہے۔

غور یہ کرنا ہے کہ نبی علیہ السلام کے متعلق خود آپ کی زوجہ مطہرہ صاف فرماتی ہیں کہ آپ بشر و انسان تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جو خصوصیت نبی کریم علیہ السلام سے حاصل تھی، وہ سب کو معلوم ہے۔ انہوں نے آپ کو جلوت وخلوت کے ہر موقعہ پر دیکھا ہے۔ اور فرماتی ہیں کہ آپ انسان و بشر تھے، لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نظریہ اس سے واضح ہوا کہ وہ بھی آپ کو انسان تسلیم کرتے تھے۔

قرآن، حدیث، اقوال صحابہ سب اس پر متفق ہیں کہ آپ اصل وجنس کے اعتبار سے بشر اور انسان ہیں۔ رہا آپ کا نور ہونا، یہ دوسرے اعتبار سے ہے جیسا کہ اوپر گزر گیا۔

ایک عام فہم مثال

اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے کہ بلب جو روشنی دیتا ہے، وہ اپنے اصل وجنس کے اعتبار سے شیشہ ہے، مگر اپنی صفت کے لحاظ سے نور ہے۔ لہٰذا بلب کی اصل کا سوال ہو تو یہی کہا جائے گا کہ وہ شیشہ ہے، اس کے باوجود وہ نور بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کہنے لگے کہ بلب تو سراسر نور ہے، اس کو شیشہ نہ کہو تو یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ بلب کا نور ہونا سو فی صدی صحیح ہے؛ مگر پھر بھی وہ شیشہ ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسان اور بشر تھے اور اس کے باوجود نور بھی تھے۔ جو شخص آپ کو نور مان کر بشر ہونے کا انکار کرتا ہے وہ دراصل غلط فہمی کا شکار ہے۔

(۱) ترمذی، مشکوۃ : ۵۲۰

بریلوی علما کے ارشادات

بریلوی مکتب فکر کے علما بھی آپ کو بشر مانتے ہیں، چناں چہ مولانا امجد علی رضوی صاحب اپنی معروف کتاب ''بہار شریعت'' میں نبیوں کے بارے میں کیا عقیدہ رکھنا چاہئے۔اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن نبی ہوا نہ عورت۔''(۱)

دیکھئے کس قدر صفائی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ انبیا سب بشر تھے۔''سب'' کہہ کر تمام انبیا کو اس میں شامل کرلیا گیا ہے۔لہٰذا اس میں آقائے مدنی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی داخل ہوگئے۔

نیز مولانا نعیم الدین صاحب مرآدآبادی اپنی تفسیر خزائن العرفان میں آیت:

﴿وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوۡحِیۡ اِلَیۡهِم﴾

(النحل: ۴۳)

(تم سے پہلے نہ بھیجے ہم نے؛ مگر مرد جن کی طرف وحی کرتے تھے۔)

کے تحت فرماتے ہیں:

''یہ آیت مشرکین مکہ کے جواب میں نازل ہوئی، جنھوں نے سید عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نبوت کا اس طرح انکار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے برتر ہے کہ وہ کسی بشر کو رسول بنائے۔انہیں بتایا گیا کہ سنت الٰہی اسی طرح جاری ہے، ہمیشہ اس نے انسانوں میں سے مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا۔''(۲)

اس عبارت میں مولانا نعیم الدین صاحب نے صاف طور پر بتایا ہے کہ سنت

(۱) بہار شریعت:۱/۸

(۲) خزائن العرفان سورہ نحل ف: ۸۹

الٰہی یہی ہے کہ اس نے انسانوں میں سے ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا اگر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بشر ہیں تو کوئی تعجب نہیں بلکہ یہ بھی اسی سنت الٰہی کا تقاضا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بریلوی مستند علما بھی حضور پرنور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بشر وانسان ہی مانتے ہیں، جیسا کہ دیوبندی علما مانتے ہیں؛ لہٰذا حقیقت میں کوئی اختلاف ہی سرے سے نہیں ہے۔

دیوبندی علما اور مقام نبی

اسی طرح دیوبندی علما حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جس طرح بشر مانتے ہیں نور بھی تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں:

> ''حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایک وجود سب سے پہلے پیدا فرمایا اور وہ وجود نور کا ہے کہ حضور اپنے وجود نوری سے سب سے پہلے مخلوق ہوئے ہیں اور عالم ارواح میں اس نور کی تکمیل وتربیت ہوتی رہی، آخر زمانے میں اس امت کی خوش قسمتی سے اس نور نے جسد عنصری میں جلوہ گر وتاباں ہو کر تمام عالم کو منور فرمایا۔''(۱)

ملاحظہ کیجیے کہ مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہ نے جو دیوبندی علما میں خاص مقام رکھتے ہیں، کس صفائی کے ساتھ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نور قرار دیا ہے۔ نیز ماضی قریب کے مشہور دیوبندی وتبلیغی عالم حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللّٰہ ''شمائل ترمذی'' کی شرح میں ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

---

(۱) مجمع الجور: ۱۱۸

''حضور اقدس صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سراسر نور تھے، وہاں میل کچیل کہاں تھا، اسی طرح آپ کا پسینہ سراسر گلاب تھا جو خوشبو میں استعمال کیا جاتا تھا۔''(۱)

معلوم ہوا کہ علماء دیوبند بھی آپ کو نور مانتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ علمائے دیوبند، حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو ایک معمولی بشر نہیں کہتے، جیسا کہ بعض لوگ ان پر الزام رکھتے ہیں؛ بل کہ وہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو سید البشر و افضل البشر کہتے ہیں اور خدا کے بعد سب سے بزرگ و برتر ہستی مانتے ہیں، ترجمان علمائے دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رَحِمَهُ اللهُ فرماتے ہیں کہ علمائے دیوبند کا سرکار دو عالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے بارے میں عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''علمائے دیوبند بصدقِ قلب سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو افضل الکائنات، افضل البشر، اور افضل الانبیا یقین کرتے ہیں؛ مگر ساتھ ہی آپ کی بشریت کا بھی اعلانیہ اقرار کرتے ہیں، وہ علماء (دیوبند) آپ کی ذات بابرکات کو تمام انبیائے کرام کی تمام کمالاتی خصوصیات خلت، اصطفائیت، کلیمیت، روحیت، مواد قیت، مخلصیت اور صدقیت وغیرہا کا جامع؛ بل کہ مبدا نبوتِ انبیا اور منشاء ولایت اولیا سمجھتے ہیں۔ (۲)

حضرت مرشدی مولانا مسیح اللہ خان صاحب رَحِمَهُ اللهُ خلیفہ حضرت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ اپنی کتاب ''تعلیمات اسلام'' میں فرماتے ہیں:

''آپ یعنی حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خدا کے بندے اور ایک

---

(۱) خصائل نبوی:۲۵۴

(۲) علمائے دیوبند کا دینی رُخ:۱۱۸

انسان ہیں خدائے تعالیٰ کے بعد آپ تمام مخلوقات حتی کہ تمام نبیوں اور فرشتوں سے افضل ہیں"۔(۱)

علمائے دیوبند کی ان عبارات سے اور ان کے علاوہ سینکڑوں سیرۃ النبی ومناقب وفضائل نبی پر ان حضرات کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ماننے کے ساتھ تمام مخلوق میں سب سے افضل قرار دیتے ہیں۔ حتی کہ اس پر کفر کا فتوی بھی صادر کرتے ہیں، جو آپ کو محض اپنے جیسا کہ ایک معمولی بشر مانے۔

چناں چہ مناظرِ اسلام مولانا سید مرتضٰی حسن چاندپوری رحمہ اللہ اپنی کتاب "تحقیق الکفر والایمان" میں بشریت نبی کا مسئلہ مفصل لکھ کر آخر میں رقمطراز ہیں:

"ایسے ہی وہ بھی کافر ہے جو آپ کو بالکل اپنے مثل بتلائے اور معاذ اللہ ایک دینوی ایلچی اور قاصد کی قدر، رسالت ونبوت کی سمجھے۔"(۲)

انکارِ بشریت کی دلیل کا جواب

اس تفصیل کے بعد بشریت نبی کی نفی وانکار کرنے والوں کی دلیل کا جواب دے دینا بھی ضروری ہے، جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ماننے تیار نہیں، وہ قرآن وحدیث کے واضح دلائل کو چھوڑ کر ایک ایسی حدیث سے دلیل لاتے ہیں، جو ان کے مدعیٰ پر دلالت ہی نہیں کرتی، وہ دلیل بخاری شریف کی یہ حدیث ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صومِ وصال یعنی بغیر سحری وافطار کے لگاتار روزے رکھتے، صحابہ نے اس کی اجازت چاہی کہ وہ بھی یوں روزہ رکھیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ "لستُ کاحدکم" کہ میں تمہارے جیسا نہیں ہوں، اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔"

---

(۱) تعلیماتِ اسلام: ۱/۶۲

(۲) رسالہ مذکورہ: ۱۵

مگر اس سے یہ سمجھنا کہ حضور انسان و بشر نہیں تھے، قصور فہم کا نتیجہ ہے؛ کیوں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میرے میں ایسی خصوصیات و کمالات ہیں جو تم میں نہیں۔ جیسے استاذ اپنے شاگرد کو اگر یوں کہے کہ تم مجھ جیسے نہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ شاگرد انسان نہیں یا استاد انسان نہیں۔ بل کہ اس سے بتانا یہ ہے کہ دونوں کے مرتبوں میں فرق ہے۔ اسی طرح آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ میرا مقام و مرتبہ تم جیسا نہیں؛ بل کہ میرا مقام اونچا ہے۔ اور اسی کے اقتضا سے خدا کی طرف سے مجھے کھلایا پلایا جاتا ہے؛ لہٰذا اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ بشر نہیں تھے غلط ہے۔

خلاصہ تحقیق

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن، حدیث و آثار صحابہ سے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا بشر و انسان ہونا بہ صراحت ثابت ہوتا ہے؛ نیز آپ کا نور ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بہ لحاظ جنس واصل کے انسان ہیں اور صفات کے لحاظ سے جیسے آپ ہادی، بشیر، نذیر وغیرہ القاب سے ملقب ہیں، اسی طرح آپ نور سے بھی موسوم ہیں اور آپ کے بشر ہونے کو جس طرح دیوبندی علما مانتے ہیں، علمائے بریلوی بھی اس کے قائل ہیں اور آپ کے نور ہونے کا جس طرح بریلوی اقرار کرتے ہیں، علمائے دیوبند بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

ناظرین کرام! اس واضح وصاف مسئلہ کو بعض ضدی و اختلاف پسند طبیعتوں نے عوام میں اٹھا کر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی فضا پیدا کر دی ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو موقعہ ہی نہ دیں اور ہمیشہ اللہ اور اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو راضی کرنے کی فکر کریں اور حقائق کے سامنے آجانے کے بعد اس کو قبول کر کے اپنی آخرت کو سنوارنے کی کوشش فرمائیں۔

حاضر وناظر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں بھی دیوبندی و بریلوی مکاتبِ فکر میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیوبندی حضرات، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر وناظر ہونے کا شدت سے انکار کرتے ہیں اور بریلوی طبقہ کے لوگ آپ کے حاضر وناظر ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ''حاضر وناظر'' کا مطلب کیا ہے؟ حاضر کا مطلب ہے، وہ جو موجود ہو اور ناظر کہتے ہیں اس کو جو دیکھنے والا ہو۔ مگر اس کا یہ سادہ معنی مراد نہیں ہوتا؛ بل کہ جب یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں تو اس سے ایک ایسی شخصیت مراد لی جاتی ہے جو کائنات میں ہمہ وقت ہر جگہ موجود ہو اور ہمہ وقت ہر چیز کو دیکھتی ہو، سوال یہ ہے کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اس معنی کے لحاظ سے حاضر وناظر ہے؟

ایک اہم نکتہ

اس مسئلے پر غور کرنے سے قبل ایک اہم نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے، وہ یہ کہ حاضر وناظر کا جو مفہوم اوپر عرض کیا گیا ہے اور اسی معنی کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''حاضر وناظر'' ہونے میں دیوبندی و بریلوی حضرات کا اختلاف بھی ہے، اس معنی و مفہوم کے لحاظ سے قرآن مجید ''حاضر وناظر'' ہونا، اللہ

تعالیٰ کی صفت قرار دیتا ہے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید : ۴)

(کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔)

یہ اللہ کے حاضر ہونے کی دلیل ہے اور ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْن﴾

(اللہ ان چیزوں سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔)

بعض جگہ بصیر کا لفظ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے اور ایک جگہ فرمایا:

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾

(سبا : ۳)

(زمین وآسمان میں کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔)

یہ اللہ کے ناظر ہونے کی دلیل ہے۔اور یہ طے ہے کہ اللہ کی کسی صفت کو اسی معنی ومفہوم کے لحاظ سے کسی اور کے لیے ثابت ماننا شرک ہے۔اسی لیے توحید خداوندی کا مفہوم ہی علما نے یہ بتایا ہے۔

اللہ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں، نہ احکام میں۔(۱)

''یگانہ است ہم درذات وہم درصفات وہم درافعال ہیچ کس رادر ہیچ امر باوے شرکت نیست۔''(۲)

(اللہ ایک ہے ذات میں بھی، صفات میں بھی، افعال میں بھی کوئی

(۱) بہار شریعت:۱/۳

(۲) مالابدمنہ:۳

شخص کسی چیز میں بھی اس کا شریک نہیں ہے۔)

ان عبارات سے واضح ہوا کہ اللہ کی صفات بھی اس کی ذات کی طرح یکتا ہیں کوئی مخلوق اس کی صفات میں بھی اس کے ساتھ شرکت نہیں رکھتی۔اس تفصیل کے بعد اصل بات کی طرف آیئے کہ جب ''حاضر و ناظر'' ہونا، اللہ کی صفت ہے تو یہ صفت کسی اور کی اس معنی و مفہوم کے لحاظ سے کیسے ہوسکتی ہے؟

اس نکتہ سے خود ہی واضح ہوگیا کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ کی طرح ''حاضر و ناظر'' جاننا و ماننا صحیح نہیں ہے۔اس کے بعد ہم مختصر طور پر دلیل سے یہ ثابت کریں گے، پھر اختصار ہی سے دوسرے نظریہ والوں کی دلیل پر بھی غور کریں گے۔

دلائل کی روشنی میں

اس سلسلہ میں اولاً چند احادیث کا ذکر کرتا ہوں، پھر ان سے جو سبق مل رہا ہے اس کی جانب اشارہ کروں گا۔

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہ) ایک غزوہ میں حضرت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ تھے، جب واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نئی نئی شادی کیا ہوں، آپ نے فرمایا کہ تم نے شادی کرلی ہے؟ عرض کیا ہاں۔فرمایا: کنواری سے یا ثیبہ سے؟ عرض کیا کہ ثیبہ سے (یعنی ایسی عورت سے جو پہلے کسی سے بیاہی گئی ہے، آپ نے فرمایا کہ کنواری سے کیوں نہیں کیا؟ (۱)

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوکر دروازہ کھٹکھٹائے۔آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا

(۱) مشکوۃ: ۲۶۷

کون ہے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''میں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر کہا ''میں میں''؟ گویا آپ نے اس جواب کو برا سمجھا، (کیوں کہ ''میں'' کہنے سے آنے والے کا علم نہیں ہوتا، نام بتانا چاہیے۔)(۱)

(۳) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے بدن یا کپڑے پر پیلے رنگ کا اثر دیکھا تو فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے شادی کر لی ہے، (یعنی یہ عطر کا رنگ ہے جو شادی کے موقع پر لگایا گیا ہے۔)(۲)

(۴) فتح مکہ کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ کی طرف نکلنے سے پہلے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے کفار قریش کو ایک خط لکھا تھا۔ جس میں نبی کریم علیہ السلام کا ارادہ کفار پر ظاہر کر دیا تھا، اگر چہ جبرئیل امین اللہ کی طرف سے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتا دینے سے آپ نے اس خط کو بعض صحابہ کو روانہ کر کے ضبط کر لیا تھا۔ مگر اس سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ خط لکھنے کا علم ہوا، نہ لکھنے والے کا پتہ چلا، یہ واقعہ بخاری کتاب المغازی میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔(۳)

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

> ''اے عائشہ رضی اللہ عنہا! مجھے تیرے بارے میں ایسی ایسی بات پہنچی ہے، اگر تو اس سے بری ہے تو اللہ تیری برأت ظاہر کرے گا

(۱) مشکوۃ: ۴۰۰
(۲) مشکوٰۃ: ۲۷۸
(۳) بخاري كتاب المغازي: ۲۷۴

اور اگر تجھ سے گناہ ہوگیا ہے تو اللہ سے استغفار کر اور توبہ کر۔"(۱)

یہ چند احادیث "ذخیرہ حدیث" سے بطور "نمونہ از خروارے" پیش کی گئی ہیں۔

ان میں سے پہلی حدیث بتارہی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی شادی ہوئی؛ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شادی میں حاضر نہیں تھے اور نہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا شادی کرلی؟ پھر یہ بھی پوچھا کہ باکرہ سے یا ثیبہ سے؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر وناظر تھے تو آپ کیوں پوچھتے؟

دوسری حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ آپ کے دراوزے پر موجود ہیں؛ مگر آپ کو معلوم نہیں کہ کون دروازے پر ہیں۔ آپ نے پوچھا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں ہوں، اس پر بھی آپ کو چوں کہ معلوم نہ ہوا کہ کون ہیں؛ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب پر ناگواری ظاہر کی۔ اگر آپ حاضر وناظر تھے تو آپ کو دروازے پر کون ہیں، اس کا علم نہ ہوتا؟

اسی طرح تیسری حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی شادی ہوگئی؛ مگر آپ کو علم نہ ہوا، چوتھی اور پانچویں حدیث سے معلوم ہوا کہ حاطب رضی اللہ عنہ کا خط لکھنا، آپ کو معلوم نہ ہوا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بری ہونا، اللہ کے بتانے تک آپ کو معلوم نہ ہوا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ہدایت کی کہ اگر تم سے غلطی ہوگئی ہو تو توبہ کرلو۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اگر ان سب جگہوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھے اور وہاں کے حالات کے آپ ناظر بھی تھے تو آپ کو یہ سب باتیں پہلے ہی سے معلوم کیوں نہ ہوئیں؟

---

(۱) بخاري، مغازی، باب حديث الافک: ۵۹۶/۲

غرض ان احادیث سے واضح ہوا کہ آپ ہر جگہ نہ حاضر ہوتے ہیں، نہ ہر چیز کے ناظر ہوتے ہیں۔ ہاں جب خدا چاہتا ہے تو بہت سی باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔

قرآن میں ''شاہد'' کا معنی

اس کے بعد یہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ بعض لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''حاضر وناظر'' کہتے ہیں وہ قرآن میں مذکور آپ کی صفت ''شاہد'' سے استدلال کرتے ہیں، قرآن نے ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّا اَرْسَلْنَاکَ شَاهِداً﴾ (الأحزاب : ۴۵)

(یعنی ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ہے۔)

اس آیت میں شاہد کے معنی گواہ کے ہیں، اس سے بعض لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ حاضر وناظر ہیں؛ کیوں کہ گواہی کے لیے واقعہ کے موقعہ پر حاضر ہونا اور اپنی آنکھوں سے اس واقعہ کو دیکھنا ضروری ہے۔ جب آپ تمام لوگوں کے بارے میں گواہی دینے والے ہیں تو سب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

مگر یہ استدلال بالکل غلط ہے، ایک تو اس لیے کہ اگر گواہ ہونے کے لیے حاضر وناظر ہونا ضروری ہے تو قرآن نے امت محمدیہ کو بھی شاہد و گواہ قرار دیا ہے۔

چناں چہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرة : ۱۴۳)

کیوں کہ وہ بھی دوسری امتوں کے خلاف اور نبیوں کے حق میں قیامت کے دن گواہی دے گی، تو کیا کوئی عقل منداس آیت کی رو سے پوری امت محمدیہ کو ''حاضر و ناظر'' مان سکتا ہے؟

دوسرے اس لیے کہ شاہد و گواہ ہونے کے قابل وثوق ذرائع سے علم ہونا کافی

ہے، حاضر و ناظر ہونا ضروری نہیں ۔ جو شخص کتب فقہ سے رجوع کرے گا اس کو اس کی تفصیلات ان میں مل جائیں گی ۔مثلاً فقہ حنفی کی معروف و مستند کتاب مختصر القدوری میں ہے کہ نسب، موت، نکاح، جماع اور تقرر قاضی کی شہادت بلا دیکھے بھی جائز ہے اس شرط سے کہ قابل اعتبار آدمی نے خبر دی ہو۔ (۱)

اور درمختار میں لکھا ہے کہ دس چیزوں کی شہادت بلا دیکھے جائز ہے۔ ان میں سے پانچ چیزیں وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اور پانچ چیزیں یہ ہیں، غلام کو آزاد کرنا، ولاء، مہر، وقف اور کسی کے قبضہ میں کچھ ہونا سوائے غلام کے۔ (۲)

حاصل یہ کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے شاہد ہونے سے حاضر و ناظر ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں اور آپ کے شاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی امتیں قیامت کے دن جب اپنے نبیوں کے بارے میں یہ کہیں گی کہ انہوں نے ہمیں پیغام نہیں پہنچایا تو امت محمد یہ گواہی دے گی کہ یہ جھوٹے ہیں۔نبیوں نے پیغام پہنچایا تھا۔ اس پر حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم امت کے حق میں گواہی دیں گے ۔بعض روایات میں ہے کہ آپ بھی اور آپ کی امت بھی نبیوں کے حق میں گواہی دیں گے اور اس شہادت کی بنیاد وحی الٰہی ہے۔

حاصل یہ کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو اس معنی کر ''حاضر و ناظر'' ماننا جس معنی کر اللہ کو ''حاضر و ناظر'' مانتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ احادیث اس کا رد کرتی ہیں۔

ہاں اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں تو بہت سے امور آپ کو بتا دیتے ہیں؛ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ہر جگہ حاضر اور ہر چیز کے ناظر ہیں۔

---

(۱) قدوري: ۲۵۱

(۲) رد المختار: ۴۷۰/۵

علم غیب

عالم الغیب خدا تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور ہے؟ دیوبندی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ اور بریلوی لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم الغیب ہیں۔ مگر دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی ان دونوں گروہوں کا اختلاف شدید ہے۔ اس مسئلے میں صحیح بات تک رسائی کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ علم غیب کی حقیقت و اصلیت کیا ہے؟

علم غیب کی حقیقت

علما نے اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ بہ قدر ضرورت کلام کرتے ہیں۔ غیب کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور مفسر علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اپنی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں:

"الغیب فی الاصل مصدر غابت الشمس وغیرها اذا استترت عن العین واستعمل فی الشی الغائب الذی لم تنصب له قرینة." (۱)

غیب اصل میں "غابت الشمس" کا مصدر ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں: جب کہ سورج آنکھوں سے پوشیدہ ہو جائے اور یہ (لفظ غیب) اس پوشیدہ چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کے لیے کوئی قرینہ یعنی دلیل قائم نہ ہو۔

(۱) روح المعاني: ۱۰/۲۰

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ شارح بخاری فرماتے ہیں:

"ومایدرک بالدلیل لایکون غیباً." (۱)

(جو چیز دلیل سے معلوم ہوجائے وہ غیب نہیں ہے۔)

ان بیانات کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ جب غیب کا لفظ استعمال میں آتا ہے تو اس کے معنی ہیں وہ چیز جو نظروں سے پوشیدہ ہو اور اس پر کسی قسم کی دلیل بھی نہ ہو اور جس پوشیدہ چیز پر دلیل قائم ہو اور اس دلیل سے اس پوشیدہ بات وچیز کا علم ہوجائے، اس کو غیب نہیں کہتے، جیسے حواس کے ذریعہ کسی مخفی بات کا علم، تجربہ سے کسی بات کا علم، یا کسی کے بتانے سے کسی مخفی بات کا علم، یہ سب علم غیب نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں قرینہ ودلیل اور واسطہ قائم ہے۔

علامہ عبدالعزیز فرہاری رحمۃ اللہ "شرح شرح عقائد" میں علم غیب کی تعریف بتانے کے بعد اسی بات کو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وبهذالتحقيق اندفع الاشكال فی الامورالتی یزعم انهامن الغیب ولیست منه لکونها مدرکةً بالسمع و البصر والضرورة اوالدلیل". (۲)

(مذکورہ بالا تحقیق سے ان چیزوں کے بارے میں جو اشکال ہوتا تھا وہ دفع ہوگیا۔ جن کو غیب کا گمان کرلیا گیا ہے، حالاں کہ وہ غیب نہیں، کیوں کہ وہ کان، آنکھ یا بداہت یا دلیل سے معلوم ہوئی ہیں۔)

اسی طرح علامہ آلوسی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مختلف ذرائع واسباب سے جو علم

---

(۱) ارشاد الساري شرح بخاري: ۲۹۶/۱

(۲) نبراس: ۳۴۳

حاصل ہوتا ہے وہ علم غیب نہیں، کیوں کہ وہ اسباب کے واسطے سے ہے۔(۱)

حاصل یہ ہے کہ علم غیب وہ ہے جو بغیر کسی واسطہ وذریعہ کے حاصل ہو، نہ حواس کا واسطہ ہو، نہ اپنے تجربے کا واسطہ ہو، نہ کسی انسان، فرشتہ، جن یا خدا کا واسطہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسا علم تو صرف اللہ ہی کو حاصل ہے جس میں کسی چیز کا واسطہ وذریعہ نہیں ہے، باقی مخلوق کو جو علم حاصل ہوگا وہ کسی نہ کسی واسطہ وذریعہ وسبب سے ہوگا۔ خود حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کے بتانے اور معلوم کرانے سے ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم غیب صرف اللہ کو حاصل ہے، کسی مخلوق کو نہیں۔ اور کسی مخلوق کو علم غیب کا حاصل ہونا ممکن بھی نہیں، کیوں کہ مخلوق کو اللہ کے بتائے بغیر غیب کا علم حاصل نہیں ہوسکتا۔

مخلوق کے لیے علم غیب ممکن نہیں

چناں چہ حضرت علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ روح المعانی میں بہ صراحت لکھتے ہیں:

> ”علم غیب جس کی نفی غیر اللہ سے کی گئی ہے وہ ہے جو کسی کو ذاتی طور پر حاصل ہو، یعنی اس کے ثابت ہونے میں کسی کا واسطہ نہ ہو اور یہ (بلا واسطہ علم کا حاصل ہونا) زمین وآسمان والوں میں کسی کے لیے بھی عقل باور نہیں کرتی؛ کیوں کہ یہ (مخلوقات) ذات وصفت کے لحاظ سے ممکنات میں سے ہیں اور ممکن ہونا ان کے لیے بلا واسطہ کسی چیز کے ثبوت سے انکار کرتا ہے۔ (یعنی جو ممکن ومخلوق ہے وہ بلا واسطہ علم نہیں پا سکتا۔“(۲)

---

(۱) روح المعاني: ۱۲/۲۰

(۲) روح المعاني: ۱۱/۲۰

غرض یہ کہ علم غیب جس کی تفسیر اوپر آپ نے ملاحظہ فرمائی ہے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے۔ کسی مخلوق کو اس کا حاصل ہونا غیر معقول و ناممکن بات ہے؛ کیوں کہ مخلوق کو جب بھی علم ہوگا تو کسی نہ کسی ذریعہ و وسیلہ سے ہوگا اور حضرات انبیا و اولیا کو جو مخفی باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہ بھی اللہ کے وسیلے و ذریعے سے معلوم ہوتی ہیں، نہ کہ ذاتی طور پر لہٰذا وہ بھی علم غیب نہیں کہلاتا۔

قرآنی تصریحات

چناں چہ قرآن مجید علم غیب کو خاصہ باری عز اسمہ، وجل شانہ، قرار دیتا ہے اور غیر اللہ سے شدت کے ساتھ اس کی نفی کرتا ہے۔ تفصیل کے ساتھ دلائل نقل کرنے یہ موقع نہیں۔ لہٰذا یہاں صرف دو تین آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے، قرآن نے فرمایا:

﴿قُلْ لَایَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہ﴾

(النحل : ٦٥)

(آپ کہہ دیجیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو ہیں وہ غیب نہیں جانتے مگر اللہ (جانتا ہے۔)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو، غیب کا علم صرف اللہ کو حاصل ہے؛ نیز قرآن نے خاص طور پر جناب محمد الرسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں بتایا ہے کہ آپ بھی علم غیب نہیں رکھتے۔

چناں چہ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لاَ اسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ﴾

(الأعراف : ١٨٨)

(اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو بہت سا خیر جمع کر لیتا۔)

اس میں بتایا گیا ہے کہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا علم نہیں ہے، اگر آپ کو غیب کا علم حاصل ہوتا تو آپ کو دنیوی کوئی نقصان ہی نہ ہوتا، آپ پہلے سے اس سے بچاؤ کی تدبیر کر کے، خیر جمع کر لیتے، مگر سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب نہ ہونے کی بنا پر کفار کی طرف سے ایذائیں اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ غرض یہ کہ غیب کا علم جس کی تعریف اوپر گزری، صرف اللہ کو حاصل ہے۔

نقطۂ اختلاف کی تعیین

مگر یہاں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ دیو بندی اور بریلوی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی طور پر علم حاصل نہیں ؛ بل کہ اللہ کے ذریعہ ووسیلہ سے حاصل ہوا۔ دیو بندی علما کا یہ عقیدہ تو ظاہر ہے، بریلوی علما میں سے مولانا امجد علی رضوی صاحب نے اپنی کتاب ''بہار شریعت'' میں لکھا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو اپنے غیوب پر اطلاع دی، زمین وآسمان کا ہر ذرہ ہر نبی کے پیش نظر ہے؛ مگر یہ علم غیب کہ ان کو ہے اللہ کے دینے سے ہے۔ لہٰذا ان کا علم عطائی ہوا۔''(۱)

نیز عقائد نظامیہ جو مولانا فخر الدین چشتی نظامی کی تصنیف ہے اور اب حکیم ادریس خان بریلوی نے تلخص وترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے، اس میں لکھا ہے:

> ''واضح ہو کہ علم غیب کو مستقل طور پر سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، لیکن اللہ چن لیتا ہے، اپنے پسندیدہ رسولوں میں

(۱) بہار شریعت: ۱/۱۰

سے جسے چاہتا ہے، تو جسے چاہتا ہے غیب کا علم بھی عطا فرماتا ہے۔''(۱)

اور خود بریلوی طبقہ کے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب نے بھی اپنی کتاب ''الدولة المکیه'' میں اس کی صراحت کی کہ آپ کو ذاتی علم حاصل نہیں؛ بل کہ عطائی علم حاصل ہے۔

ان حوالجات سے واضح ہے کہ دیو بندی حضرات کی طرح بریلوی حضرات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صرف عطائی علم کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس نقطہ پر دونوں طبقوں کا اتفاق ہے، اسی طرح دونوں طبقوں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ آپ کو تمام غیب کی باتیں اللہ تعالیٰ نے نہیں بتادی ہیں، یعنی جتنا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، اتنا ہی علم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں مانتے؛ بل کہ ایسا ماننے والوں کو بریلوی حضرات کافر کہتے ہیں۔ چناں چہ مولانا امجد علی رضوی نے ''بہارِ شریعت'' میں لکھا ہے:

> ''مساوات (یعنی اللہ کے علم اور نبی کے علم کی برابری) تو جب لازم آئے گی کہ اللہ عزوجل کے لیے بھی اتنا ہی علم ثابت کیا جائے اور یہ نہ کہے گا مگر کافر ذرات عالم متناہی (محدود) ہیں اور اس کا علم غیر متناہی (غیر محدود)۔''(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ دیو بندی حضرات کی طرح بریلوی لوگ بھی یہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام غیب کی باتیں نہیں بتادی گئیں۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان دونوں میں مسئلہ علم غیب پر جو اختلاف ہے آخر کس نقطہ پر ہے؟ احقر نے جہاں تک غور کیا، یہ سمجھ میں آیا کہ نقطۂ اختلاف دو باتیں ہیں۔

---

(۱) عقائد نظامیه: ۲۴

(۲) بہارِ شریعت: ۱/۱۱

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زمین وآسمان کے ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں یانہیں؟

(۲) آپ کو جوغیب کی باتیں اللہ کی طرف سے معلوم ہوئیں، اس کی بناپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوعالم الغیب کہہ سکتے ہیں یانہیں؟

لہٰذا ہم اپنی اگلی بحث کوانہی نقاط پر مرکوز رکھیں گے۔اب ہم ان میں سے پہلے نقطہ کوزیر بحث لاتے ہیں۔

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوذرہ ذرہ کا علم ہے؟

کیا حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین وآسمان کے ہرذرہ ذرہ کا علم حاصل ہے؟ بریلوی نقطۂ خیال سے اس کا جواب اثبات میں ہے۔ چناں چہ اوپر ''بہارشریعت'' کی عبارت ہم نے نقل کی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کا ہر ذرہ ہر نبی کے پیش نظر ہے اور دیوبندی علما کاعقیدہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کواگر چہ اللہ کی طرف سے بہت سارے علوم عطافرمائے گئے ہیں اورغیب کی بہت سی باتوں پرآپ کومطلع کیا گیا ہے،مگرزمین وآسمان کے ہرذرہ کا آپ کے پیش نظر ہونا، قرآن وحدیث سے ثابت نہیں؛ بل کہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ آپ کو ہرذرہ کاعلم نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیوبندی علما حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کومعمولی نظر سے دیکھتے ہیں،نہیں! وہ حضرات تو آپ کوخدا کے بعد سب سے زیادہ علم والا مانتے ہیں، چناں چہ دیوبند کے مدرسہ کے مفتی حضرت مولانا عزیزالرحمان صاحب رحمۃ اللہ ایک فتوے میں تحریر کرتے ہیں:

''وان سیدنا وشفیعنا محمداً صلی اللہ علیہ وسلم اعلمُ

الخلق وافضلهم، فمن سوّی بین علمه او علم الصبی والمجنون اوعلم احد من الخلائق اوتفوّه بان ابلیس اللعین اعلم منه ا فهو کافر ملعون." (۱)

(یعنی ہمارے سردار و شفیع محمد ﷺ تمام مخلوق میں سب سے زیادہ علم والے اور افضل ہیں، جوشخص آپ ا کے علم کو بچے، مجنون یا مخلوقات میں سے کسی کے برابر بتائے، یا یہ بکواس کرے کہ ابلیس آپ ﷺ سے بڑا عالم تھا، وہ کافر وملعون ہے۔)

غرض دیوبندی حضرات آپ ﷺ کوسب سے بڑا عالم مانتے ہیں؛ مگراس کے باوجود قرآن وحدیث کے دلائل کی بناپر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ کوکائنات کے ذرہ ذرہ کا علم نہیں تھا، اس کے کچھ دلائل تو وہی حدیثیں ہیں جوگزشتہ مضمون ''حاضروناظر'' کے تحت ہم نے نقل کیے تھے کہ آپ کوبعض باتوں کاعلم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور دلائل بھی رقم کرتا ہوں۔

(۱) ایک نکاح کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں کچھ لڑکیاں دف بجا کر اشعار پڑھ رہی تھیں، انہی اشعار میں ایک مصرعہ یہ بھی پڑھا کہ ''ہمارے میں ایک ایسے نبی ہیں جوکل ہونے والی بات کو جانتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

''اس کو چھوڑ دو اور وہ پڑھو جو پہلے سے پڑھ رہی تھیں۔'' (۲)

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں لکھا کہ حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ کی

---

(۱) بحواله امدادالفتاوی: ۲/ ۳۲۷

(۲) بخاری: ۲/۷۷۳

روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس کو چھوڑ دو؛ کیوں کہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔''(۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں اس بات کا انکار کیا ہے کہ آپ ہر چیز جانتے ہیں۔

(۲) بخاری و ترمذی میں ایک لمبی حدیث حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک جہاد میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے منافق عبد اللہ بن ابی کو سنا کہ وہ مسلمانوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لب کشائی کر رہا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کی خبر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دی اور آپ نے اس کی تحقیق کے لیے آدمی بھیجا، منافقین نے انکار کیا اور جھوٹی قسم بھی کھالی۔ اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جھوٹا سمجھ لیا اور منافقین کو سچا جانا، پھر جب سورۂ منافقون نازل ہوئی تو آپ کو حقیقت معلوم ہوئی۔ (۲)

اس حدیث میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

''كَذَّبَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَصَدَّقَه''

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جھوٹا سمجھا اور اس منافق کو سچا سمجھا۔)

غور فرمایئے! اگر ہر ذرہ عالم کا علم آپ کو ہوتا تو اولاً آپ کو منافق کی یہ بات خود

---

(۱) فتح الباري: ۲۰۳/۹

(۲) بخاري، کتاب التفسیر: ۷۲۷/۲

ہی معلوم ہوتی، پھر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو تصدیق کے لیے آدمی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز آپ کو علم ہوتا تو آپ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تکذیب اور منافق کی تصدیق کیوں کرتے؟ معلوم ہوا کہ آپ کو ہر ذرہ ذرہ کا علم نہیں ہے۔

(۳) بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ایک قبر کے پاس سے گزرے، جس میں رات میں کسی مردے کو دفن کیا گیا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس کو کب دفن کیا گیا؟ صحابہ نے بتایا کہ رات میں۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟ عرض کیا گیا کہ ہم نے اس کو رات میں دفن کیا تھا، ہم نے برا سمجھا کہ آپ کو بیدار کریں، پھر آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ (۱)

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک کالی عورت (یا ایک نوجوان) مسجد کی صفائی کرتی تھی، آپ عَلَيْهِ السَّلَام نے اس کو نہ پایا تو پوچھا کہ وہ کہاں؟ صحابہ نے بتایا کہ وہ مر گئی یا وہ مر گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتاؤ! چناں چہ صحابہ نے قبر بتائی۔ تو آپ نے نماز پڑھی۔ (۲)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے مرنے، دفن ہونے اور ان کی قبروں کا آپ کو علم نہ تھا۔ آپ کو صحابہ نے بتایا۔

(۵) ایک دفعہ حضرت جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام آپ کی خدمت میں آئے اور کئی سوالات کئے اور آپ نے ان سوالوں کا جواب بھی دیا؛ مگر جب حضرت جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا کہ: "ما المسئول عنھا باعلم من السائل" (کہ سائل (پوچھنے والے) سے زیادہ اس

(۱) مشکوۃ: ۱۴۵
(۲) مشکوۃ: ۱۴۵

کونہیں معلوم جس سے پوچھا گیا ہے۔)(۱)

نمونہ کے طور پر چند احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ ورنہ تو اس سلسلے میں اتنی احادیث ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ان احادیث پر سرسری نظر ڈالنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ بہت سے امور ایسے تھے جن کو نبی کریم ﷺ نہیں جانتے تھے۔تو ذرہ ذرہ کا آپ کو علم حاصل ہونا خلافِ تحقیق بات ہے۔

ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ جو ان دلائل کی وجہ سے بےبس ہو جاتے ہیں وہ اپنی بات کو نبھانے کے لیے کچھ عجیب عجیب تاویلوں سے کام لیتے ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو بالکل آخری عمر میں یعنی وفات سے ذرا قبل ہر ہر ذرہ کا علم دیا گیا تھا۔ممکن ہے کسی کو ان کی تاویل سے شبہ ہو۔لہٰذا اس پر بھی مختصر کلام کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالٰی نے فرمایا:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا﴾

(المائدۃ :۱۰۹)

(جب قیامت کے دن تمام رسولوں کو جمع کر کے پوچھا جائے گا کہ تم کو کیا جواب دیا گیا تھا؟ تو تمام رسول کہیں گے کہ ہم کو معلوم نہیں ہے۔)

یہ حضرات انبیا کا جواب قیامت کے دن ہوگا۔اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام کو بعض باتیں بعد انتقال اور روز محشر بھی معلوم نہ ہوں گی۔اور اس آیت میں جس طرح دیگر انبیاء داخل ہیں، ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ بھی داخل ہیں۔

---

(۱) مشکوۃ :۱۱

معلوم ہوا کہ آپ کو قیامت کے دن بھی بعض باتیں معلوم نہ ہوں گی۔

نیز حدیث میں ہے کہ ”قیامت کے دن حوض کوثر پر میں ہوں گا اور میرے پاس جو آئے گا، میں اس کو سیراب کروں گا، البتہ میرے پاس بعض لوگ آئیں گے اور میں ان کو پہچان لوں گا اور وہ مجھے پہچان لیں گے۔ پھر میرے اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل کردی جائے گی۔ میں کہوں گا کہ یہ تو میرے ہیں مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کیا کیا نئی باتیں پیدا کردی تھیں؟(۱)

یہ واقعہ بھی قیامت کے دن کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض امتیوں کی حالت آپ کو اس دن بھی نہ معلوم ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر آپ کو بتایا جائے گا۔ اس تفصیل کے بعد یہ بھی عرض کردوں کہ نہ صرف ان دنیوی معاملات اور لوگوں کے حالات وکوائف؛ بل کہ بعض حمد وثناء کے مبارک کلمات بھی ایسے ہیں جن کا علم آپ کو صرف قیامت کے دن ہوگا۔ چناں چہ حدیثِ شفاعت میں ہے:

حضرات انبیا لوگوں سے کہیں گے کہ تم محمد کے پاس جاؤ! لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میں اللہ سے اجازت طلب کروں گا اور مجھے اجازت دی جائے گی۔ اس کے بعد فرمایا:

”ویُلْهِمنِی محامد أحمده بهالاتحضرنی الآن“

”مجھے حمد کے کلمات الہام والقاء کیے جائیں گے جن کو اب میں اپنے پاس نہیں پاتا۔“(۲)

غور کیجئے کہ جب کچھ حمد وثناء کے کلمات بھی ایسے ہیں جو وہاں ہی القاء والہام

(۱) مشکوۃ: ۴۸۷

(۲) مشکوۃ: ۴۸۸

ہوں گے، تو یہ دعویٰ کہ آپ کو قبلِ وصال سب چیزوں کا علم دے دیا گیا، حقیقت سے کس قدر دور ہے؟

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہنا؟

اب آیئے دوسرے نقطہ اختلاف کی طرف! ہم نے اوپر واضح کیا ہے کہ دیوبندی حضرات کی طرح بریلویت کے علمبردار بھی یہ مانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ علم حاصل ہے، وہ اللہ کے عطا فرمانے کا نتیجہ ہے اور یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ علم غیب وہی ہے جو ذاتی طور پر حاصل ہو۔

اس سے یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ حقیقی معنی کے لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہی دیوبندیوں کے پاس عالم الغیب ہیں، نہ بریلویوں کے نزدیک، کیوں کہ حقیقی معنی کے لحاظ سے عالم الغیب وہی ہے جو بلا کسی واسطہ کے ذاتی طور پر علم رکھتا ہو اور ایسا علم آپ کو حاصل نہ ہونے پر دونوں طبقے متفق ہیں، جیسا کہ اوپر حوالے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اب اختلاف صرف اس قدر ہے کہ اللہ کی عطا سے آپ کو جو بعض غیب کی باتوں کا علم حاصل ہوا ہے۔ اس کی بنا پر آپ کو عالم الغیب کہنا درست ہے یا نہیں؟ بریلوی لوگ اس کو درست قرار دیتے ہیں اور آپ کے لیے عالم الغیب کا اطلاق ضروری سمجھتے ہیں اور دیوبندی علما اس کو بھی درست نہیں قرار دیتے۔ دیوبندی حضرات کی دلیل یہ ہے کہ شریعت نے بعض الفاظ سے؛ اس لیے منع کر دیا ہے کہ اس سے شرک کا وہم ہوتا ہے۔ مثلاً حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

> ''اپنے غلام و باندی کو ''عبدی اور امتی'' (میرے بندے، میری بندی) نہ کہو تم سب کے سب اللہ کے بندے اور تمہاری عورتیں اللہ کی

بندیاں ہیں۔‘‘(۱)

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

’’تم میں سے کوئی میرا بندہ، میری بندی ہرگز نہ کہے اور غلام بھی (اپنے آقا کو) میرا رب نہ کہے۔ تم سب اللہ کے مملوک وغلام ہو اور رب تو اللہ ہی ہے۔‘‘(۲)

ان حدیثوں میں اپنے غلام وباندی کو بندہ، بندی کہنے سے اور آقا کو رب کہنے سے صاف طور پر منع کیا ہے، اس کی وجہ علما نے یہی بتائی ہے کہ غلام کو بندہ کہنے سے آقا کے معبود ہونے کا وہم ہوتا ہے، اسی طرح کسی کو رب کہنے سے اللہ کی صفت ربوبیت میں اس کے شریک ہونے کا وہم گزرتا ہے، شریعت اس کو بھی ناپسند کرتی ہے۔

اسی طرح مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وبرا آدمی وہ ہوگا جو اپنا نام ’’مَلِکُ الاملاک‘‘ رکھے۔ سوائے اللہ کے کوئی مالک نہیں۔ (۳)

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ یہ نام رکھنا حرام ہے۔ اسی طرح اللہ کے مخصوص ناموں سے نام رکھنا حرام ہے۔ جیسا رحمان، قدوس، مہیمن، خالق الخلق وغیرہ۔ (۴)

جب یہ واضح ہوگیا کہ شریعت بعض ناموں سے منع کرتی ہے جن میں شرک کا وہم ہوتا ہو، تو اب یہ بھی واضح ہے کہ نبی کریم علیہ السلام کو عالم الغیب کہنے سے

(۱) الادب المفرد: ۴۸

(۲) الادب المفرد: ۴۸

(۳) مسلم شریف: ۲/ ۲۰۸

(۴) شرح مسلم: ۲/ ۲۰۸

بھی چوں کہ یہی شرک کا وہم ہوتا ہے۔لہٰذا یہ اطلاق بھی جائز نہ ہوگا۔

ایک طرف نصوص میں عالم الغیب کا اطلاق اللہ ہی کے لیے ہوا ہے، دوسری طرف غیر اللہ سے اس کی نفی کر کے اس کو خدا کی مخصوص صفت قرار دیا گیا ہے، تو اب تاویل کے ذریعہ اس کا آپ پر اطلاق کرنا شرک کا وہم پیدا کرتا ہے۔لہٰذا علما دیوبند اسی وجہ سے اس کو ناجائز کہتے ہیں۔

مخالفین کے دلائل پر نظر

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے، ان لوگوں کے دلائل کا جو نبی کریم عَلَيْهِ السَّلَامُ کے لیے ذرہ ذرہ کا علم کا غیب ثابت کرتے ہیں، اختصار کے ساتھ جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

ان لوگوں کی دلیل ایک تو یہ آیت ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَّمکَ مَالم تکُنْ تعْلَمْ﴾ (النساء : ۱۱۳)

(اے نبی! اللہ نے آپ کو وہ سب کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔)

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اللہ نے خود بتایا ہے کہ آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے وہ سب کچھ آپ کو بتا دیا، تو اس میں تمام چیزیں داخل ہوگئیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کا یہی مطلب ہوتا ہے تو قرآن میں اللہ نے ایسا ہی تمام مسلمانوں سے فرمایا ہے:

﴿كَمَا عَلَّمَكُمْ مَالُمْ تكُونُوا تعْلَمُونَ﴾ (البقرۃ :۲۳۹)

(یعنی جیسے سکھایا تم کو وہ جو تم نہیں جانتے تھے۔)

تو کیا یہاں بھی ''ما'' (جو کچھ) کا یہی معنی لیں گے کہ جو کچھ نہیں جانتے تھے وہ سب سکھایا تو کیا تمام مسلمان بھی ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں، تو

جیسے یہاں ''ما'' کا لفظ عام نہیں۔ ایسے ہی پہلے جملہ میں بھی عام نہیں؛ بل کہ مراد آیت کی یہ ہے کہ اے نبی! منصب نبوت کے متعلق جو کچھ ضروری ہے وہ ہم نے آپ کو سکھا دیا ہے۔

ان حضرات کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''میں نے اللہ کو بہترین صورت میں دیکھا، اللہ نے پوچھا کہ فرشتے کس بات میں جھگڑا کر رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ ہی بہتر جانتے ہیں، اللہ نے کندھے پر ہاتھ رکھا، پس تمام چیزیں میرے لیے ظاہر ہو گئیں، جو آسمان وزمین میں ہیں۔''(۱)

مواہب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ دنیا کو میرے پاس اٹھالایا گیا۔ پس میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں اور ان تمام چیزوں کی طرف بھی دیکھ رہا ہوں جو قیامت تک ہونے والی ہیں۔(۲)

مگر ان روایات سے بھی استدلال کرنا کہ آپ ہر ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں۔ صحیح نہیں۔ اولاً تو ان روایات کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔(۳)

دوسرے ان روایات میں بھی ''ما'' سے عموم مراد لینا صحیح نہیں؛ جب کہ بے شمار روایات سے ثابت ہے کہ آپ کو بہت سے امور دنیویہ کا علم نہ تھا۔ لہٰذا یہاں بھی ''ما''

---

(۱) مشکوٰۃ: ۷۰

(۲) مواھب لدنیه

(۳) دیکھو: احکام القرآن مفتی محمدشفیع صاحب: ۳/۲

سے مراد زمین وآسمان کے اہم واقعات ہیں، تیسرے حدیث کے الفاظ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت زمین وآسمان کوآپ کے لیے منکشف کردیا گیا تھا۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ حالت برقرار رہے۔ اگرایسا ہوتا تو پھر آپ کو بہت سارے ان امور میں دقت پیش نہ آتی جن کی طرف آپ نے توجہ بھی فرمائی۔

غرض یہ کہ ان روایات سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ آپ کوذرہ ذرہ کا علم تھا۔

یادرکھو! عقیدہ کا ثبوت قطعی دلیل سے ہوتا ہے نہ کہ ضعیف خبر واحد سے جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں۔

مشکل کشا وحاجات روا اور مختار کل

اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں کی حاجت روائی ومشکل کشائی فرماتے ہیں اور ساری مخلوق اللہ تبارک وتعالیٰ کی محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ مختار کل ہیں۔مگر کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی مشکل کشا وحاجت روا ومختار کل ہے؟

اس سوال کے جواب میں دیوبندی حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا ومشکل کشا نہیں اور نہ کوئی مختار کل ہے۔اور بریلوی لوگ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات اولیاء اللہ بھی مشکل کشا ہیں اور حاجت روائی کرنے کی طاقت وقوت رکھتے ہیں ،اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے اولیاء اللہ کو کائنات میں تصرف کا پورا اختیار دے دیا ہے۔

بریلوی مسلک کی توضیح

آگے بڑھنے سے پہلے بریلوی مسلک کی وضاحت کر دینا ضروری ہے تاکہ آگے بحث کے موقع پر دقت نہ پیش آئے۔ بریلوی مسلک کی مشہور ومعروف ومستند کتاب ''بہار شریعت'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے:

''حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ عزوجل کے نائب مطلق ہیں، تمام جہاں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے تحت تصرف کر دیا گیا، جو چاہیں کریں، جسے چاہیں دیں، جس سے جو چاہیں واپس لیں، تمام جہاں میں ان کے حکم کا پھیرنے والا کوئی نہیں .... آگے لکھتے ہیں:

''**ملکوت السمٰوٰات والارض**'' حضور کے زیر فرمان جنت ونار کی کنجیاں دست اقدس میں دے دی گئی ہیں، رزق وخیر اور ہر قسم کی عطائیں حضور ہی کے دربار سے تقسیم ہوتی ہیں، دنیا اور آخرت حضور کی عطا کا ایک حصہ ہے۔ احکام تشریعیہ حضور کے قبضہ میں کر دیے گئے کہ جس پر جو چاہیں حرام فرما دیں اور جس کے لیے جو چاہیں حلال کر دیں اور جو فرض چاہیں معاف فرما دیں۔''(۱)

اور اسی کتاب میں حضرات اولیاء اللہ کے متعلق لکھا گیا ہے:

''اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی طاقت دی ہے، ان میں جو اصحابِ خدمت ہیں، ان کو تصرف کا اختیار دیا جاتا ہے، سیاہ وسفید کے مختار بنا دیے جاتے ہیں، یہ حضرات نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سچے نائب ہیں، ان کو اختیارات وتصرفات حضور کی نیابت میں ملتے ہیں۔''(۲)

ان عبارات سے بریلوی مکتبِ فکر کا اولیاء اللہ وآنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں عقیدہ وضاحت وصراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ حضرات سیاہ وسفید کے مالک اور کائنات میں ہر طرح

(۱) بہار شریعت: ۱/ ۱۶
(۲) بہار شریعت: ۱/ ۵۵

کے تصرف کے مجاز ومختار ہیں تو حاجت روائی ومشکل کشائی بھی ان کی صفت ہے۔

مسلکِ دیوبند کی ترجمانی

اس کے بعد علمائے دیوبند کا مسلک بھی واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی غلط وہم نہ ہو جائے۔ علمائے دیوبند حضرات انبیا، حضرات اولیائے اللہ کو بڑی عظمت ومحبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی عظمت ومحبت کو ایمان کا جزو لازم خیال کرتے ہیں؛ مگر ان کو مختار کل اور مشکل کشا نہیں مانتے۔ یعنی اللہ کی صفات بندوں کو بانٹنے کے وہ قائل نہیں۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب خلیفہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”اولیائے اکرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ مسلک علمائے دیوبند کی رو سے اُمت کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے، جن سے ان کی امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے؛ اس لیے علمائے دیوبند ان کی محبت وعظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر غلو کے ساتھ اس محبت وعقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے، ان کی تعظیم ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن ان کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ ورکوع یا طواف یا نذر یا منت وقربانی کا محل بنالیں، وہ ان کی منور قبروں سے استفادہ اور فیض حاصل کرنے کے قائل ہیں؛ لیکن انہیں مشکل کشا اور دافع البلاء والوباء نہیں سمجھتے، کہ وہ صرف شان کبریائی ہے۔“(۱)

اس سے واضح ہوا کہ علماء دیوبند انبیاء واولیاء کی تعظیم ومحبت کرتے ہیں؛ مگر ان

---

(۱) علماء دیوبند کا دینی رُخ: ۱۲۹تا۱۳۰

کوخدا جیسا نہیں سمجھتے، صفات خداوندی سے ان کو متصف کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔لہذا وہ ان کو مشکل کشا و مختار کل نہیں مانتے۔

اب ہمیں قرآن وحدیث کے دلائل سے یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں میں سے کس کا مسلک صحیح ہے اور اسلام کی تعلیم کے مطابق ہے۔

قرآن کا فیصلہ

(۱) پہلے قرآن کو لیجئے! اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں سے علی الاعلان یہ کہہ دیں:

﴿لاَ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَائِنُ اللّٰہِ وَلاَ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلاَ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَکٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلاَّ مَا یُوْحٰی اِلَیَّ﴾ (الانعام: ۵)

(ترجمہ: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو مجھ پر اترتی ہے۔)

اس آیت کی تشریح وتفسیر میں مولانا نعیم الدین صاحب رضوی مرآدبادی لکھتے ہیں:

''کفار کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سید عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے طرح طرح کے سوالات کیا کرتے تھے، کبھی کہتے کہ آپ رسول ہیں تو ہمیں بہت سی دولت اور مال دیجئے کہ ہم کبھی محتاج نہ ہوں، ہمارے لیے پہاڑوں کو سونا بنا دیجئے...... کچھ اور کفار کے مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:...... ان تمام باتوں کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے...... کہ آپ فرما دیجئے کہ میرا دعوی یہ تو نہیں کہ میرے پاس اللہ کے

خزانے ہیں جو تم مجھ سے مال و دولت کا سوال کرو۔"(۱)

آیت پاک اور اس کی مذکورہ بالا تفسیر سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے اپنے خزانوں پر اختیار تصرف نہیں دے دیا ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے وضاحت وصراحت سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اس کی نفی کردی ہے اور آخر میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپ تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں جو وحی کے ذریعہ آپ کو بتایا جاتا ہے، آپ کو کلی اختیارات اور ہر طرح کی قدرت نہیں دے دی گئی ہے۔ اور اسی طرح کی بات قرآن میں حضرت سیدنا نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی بصراحت بتائی ہے۔ (۲)

جب حضرت نوح علیہ السلام اور خود جناب رسالت مآب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن نے یہ بتایا ہے تو اولیاء اللہ اور صوفیاء کرام کے بارے میں کون گمان کرسکتا ہے کہ وہ مختار کل ہوسکتے ہیں، اور سیاہ وسفید ان کے تحت تصرف کردیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نبی کو بھی قرآن یہ حق نہیں دیتا ہے تو غیر نبی کو کس طرح حق مل سکتا ہے؟

(۲) ایک جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ کفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ قیامت کا یا عذاب کا جو وعدہ آپ کرتے ہیں، وہ کب آئے گا؟ آپ جلد اس عذاب کو لائیے! یہ ذکر کر کے اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ اس کا جواب یوں دیجئے۔

﴿لاَ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلاَ نَفْعًا اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ﴾

(یونس: ۴۹)

---

(۱) خزائن العرفان: ۱۹۴

(۲) سورۂ ھود: ۳۱

(میں اپنی ذات کے لیے نقصان یا نفع کا مالک نہیں؛ مگر جتنا کہ اللہ چاہے۔)

یہی بات بعینہٖ سورہ اعراف (آیت:۱۸۸) میں بھی موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں تصرف کا اختیار نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نہیں دیا گیا اور نہ آپ نفع ونقصان کے مالک ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کفار کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ آپ عذاب لائیے! قیامت قائم کیجیے! تو اگر آپ کو کائنات میں تصرف کا اختیار خدا کی عطا سے ہی سہی حاصل ہوتا تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل کرنے سے ان کا جواب کیسے ہو جاتا؟ جواب تو اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کا اختیار نہ ذاتی طور پر حاصل ہوا اور نہ اللہ کی عطا سے حاصل ہو۔

الغرض معلوم ہوا کہ اللہ نے آپ کو نفع ونقصان کا مالک، کائنات میں تصرف کا مجاز، اور تمام خزانوں کا حامل نہیں بنا دیا ہے۔ قرآن اس کی نفی کرتا ہے۔

(۳) قرآن مجید میں رزق کے بارے میں بے شمار آیات ہیں، جن میں رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور بتایا ہے کہ رزق بے حساب دینا، کسی کو کم کسی کو زیادہ دینا، یہ سب اللہ کا کام ہے۔ یہاں ان آیات سے چند کے صرف حوالہ پیش کرتا ہوں۔

رعد:۲۶، نحل:۷۱، بنی اسرائیل:۳۰، قصص:۸۲، عنکبوت:۶۲، روم:۳۷، سبا:۳۶۔ ۳۹، زمر:۵۲، شوریٰ:۱۲، بقرہ:۲۱۲، نور:۳۸ وغیرہ ان حوالوں کو قرآن میں دیکھ لیں۔ صاف طور پر معلوم ہوگا کہ رزق کے دینے، کم کرنے، زیادہ کرنے کو اللہ نے صرف اور صرف اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ نیز دیگر آیات میں مخلوق سے نفی کی ہے۔

چناں چہ فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ یَرْزُقُکُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ﴾
(سبا : ۲۴)

(آپ (ان سے پوچھئے) کون تمھیں رزق دیتا ہے، آسمانوں اور زمین سے آپ خود بتا دیجئے کہ اللہ۔)

اور سورۂ فاطر میں ہے کہ اللہ نے سوال کیا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے؟ جو تمھیں آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے؟ (فاطر:۳)

یعنی کوئی ایسا نہیں۔اس کے بعد کہاں گنجائش ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دربار سے رزق تقسیم ہوتا ہے۔

(۴) قرآن میں ایک جگہ نبی کریم علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ﴾ (التحریم : ۱۰)

(اے نبی! (علیہ السلام) آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں، جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے، اپنی بیویوں کی مرضی کی خاطر۔)

یہ آیت ایک خاص موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے یعنی نہ کھانے کی قسم کھا لینے پر نازل ہوئی۔اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہ تھا کہ شرعی احکامات میں اپنی طرف سے تبدیلی فرما دیں۔ یہاں حالاں کہ آپ نے دین میں تبدیلی نہیں کی تھی کہ اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دے دیا ہو؛ بل کہ آپ نے اپنی ذات کے لیے اس کو حرام کرلیا تھا۔جو دراصل حلال کو حرام کرنا نہیں بل کہ حلال سے پرہیز کرنا ہے،اس پر بھی جب آپ پر عتاب ہوا تو غور فرمایئے کہ شریعت کو تبدیل کرنے کا آپ کو اختیار ہوسکتا ہے؟

یہ چند آیات ہیں، جو بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ دیوبندی علماء جو کہتے ہیں کہ مختار کل اور کائنات میں متصرف صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے، اسی طرح نفع ونقصان کی مالک ذات صرف اللہ ہی کی ہے، لہٰذا مشکلات کو حل کرنا اور حاجت روائی کرنا بھی صرف اسی کے قبضۂ قدرت واختیار میں ہے۔ یہ صحیح ہے۔

حدیثِ نبوی کا فیصلہ

احادیث میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے امت کو اسی کی تعلیم دی کہ جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو! کسی حدیث میں بھی یہ نہیں ملتا کہ آپ نے کسی صحابی کو بھی یہ تعلیم فرمایا ہو کہ اللہ کے بجائے میرے سے مانگو، میں مختار کل ہوں، نفع ونقصان کا مالک ہوں، اور کائنات میں تصرف کا اختیار رکھتا ہوں۔ نہیں، کبھی نہیں۔ بل کہ ہمیشہ یہی سکھایا ہے کہ اللہ سے مانگو۔ چند احادیث ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''اِسْتَعِنْ بِاللّٰہِ.''
(کہ اللہ سے مدد چاہو۔)(۱)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے نصیحت فرمائی، اس میں یہ بھی فرمایا کہ جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور جب مدد چاہو تو اللہ سے مدد چاہو، پھر فرمایا کہ اگر پوری اُمت تجھ کو نفع دینا چاہے تو نہیں دے سکتی؛ مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اگر وہ سب تجھ کو نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے؛ مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے حق میں لکھ دیا ہے۔(۲)

---

(۱) مشکوۃ: ۴۵۲/۴۳۵

(۲) مشکوۃ: ۴۳۵

ان احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو یہی تعلیم دی ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ سے سوال کرو، اسی سے مدد چاہو۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ پوری امت یعنی تمام لوگ مل کر بھی نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان، اور پوری اُمت سے مراد صرف عام لوگ ہی نہیں؛ بل کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مراد تمام مخلوق خاص و عام انبیا و اولیا اور ساری اُمت ہے۔(۱)

معلوم ہوا کہ حدیث نفع و نقصان کی مالک صرف اللہ کو قرار دیتی ہے اور اسی سے اپنی مرادیں و حاجتیں مانگنے کی تعلیم دیتی ہے۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''تم میں سے ہر ایک اپنی سب حاجتیں اپنے رب سے مانگے حتی کہ جوتوں کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ ہی سے مانگے اور حضرت ثابت بُنانی رحمہ اللہ سے مرسلاً مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نمک کی ضرورت ہو تو بھی اللہ سے مانگے۔''(۲)

غور فرمایئے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کو تعلیم دے رہے ہیں کہ جب بھی تمہیں کوئی ضرورت پڑے تو اللہ ہی سے مانگو، حتی کہ نمک اور تسمہ جیسی چیزیں بھی اسی سے مانگو۔

نیز آپ نے اپنے ارشادات میں بتایا ہے کہ ہر چیز کا اختیار کلی صرف اللہ کو ہے مجھے کوئی اختیار نہیں۔ مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ آپ نے اپنے رشتہ داروں کا نام لے لے کر فرمایا: ''اے فلاں، اے فلاں ''لاأغنی عنکم من اللہ شیئاً''

---

(۱) مرقات: ۱۹/۵

(۲) مشکوۃ: ۱۹۶

(کہ میں اللہ کے سامنے تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔)(۱)

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ کیا تو مجھے اللہ کا شریک بناتا ہے؟

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا نہیں؛ بل کہ صرف وہ جو اللہ چاہے۔(۲)

اس حدیث نے بتادیا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، نہ کہ وہ جو حضور چاہیں اور اللہ کے ساتھ مشیت میں آپ کو شریک کرنا شرک ہے۔

غور کیجیے کہ اگر حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو اختیارات اللہ نے دے دیئے ہوتے تو آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ایسا کیوں فرماتے؟

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے حضرت جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام سے فرمایا کہ آپ جتنی مرتبہ میرے پاس آتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ (مریم: ۶۴)

(ترجمہ: ہم تمہارے رب کے حکم کے بغیر نہیں آتے۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضور کے مطالبے کا جواب تھی۔(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خواہش تھی کہ جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام آپ کے پاس زیادہ آئیں؛ مگر آپ کو اس خواہش کے پورا کر لینے کا

---

(۱) بخاری کتاب التفسیر: ۷۰۲/۲

(۲) الادب المفرد: ۲۷۴

(۳) بخاری، کتاب التوحید: ۶۹۱/۲

اختیار نہیں تھا۔آپ کو جواب دے دیا گیا کہ فرشتے بغیر اللہ کے حکم کے آپ کے پاس نہیں آسکتے۔

غور کیجئے اگر آپ کو پوری کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیا گیا تھا تو جبرئیل علیہ السلام کو آپ نے حکم کر کے کیوں نہیں بلالیا؟ پھر درخواست کی کیا ضرورت تھی اور درخواست پر بھی آپ کو یہ جواب دیا گیا کہ اللہ کے حکم کے بغیر فرشتے آپ کے پاس نہیں آسکتے۔

جب آپ کا معاملہ یہ ہے تو اولیا اللہ کا معاملہ کیا ہوگا؟ کیا کوئی گمان کرسکتا ہے کہ اولیاءاللہ صاحب اختیار وتصرف ہوتے ہیں۔مشکل کشا ہوتے ہیں؟

اور ملاحظہ کیجئے کہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کرلی، تو قریش نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کی سزا معاف کرانے کے لیے سفارش کرنے بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ کیا اللہ کے مقرر کردہ حدود میں شفارش کرتے ہو؟ پھر فرمایا کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرے گی تو میں اس کے ہاتھ کاٹوں گا۔(۱)

محبوب سُبحانی کا زرین ارشاد

آخر میں حضرت شیخ محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں، آپ فرماتے ہیں:

''حق تعالیٰ کے موحّد بنو، اس کے دروازے سے مت ٹلو، اسی سے مانگو اور کسی سے مت مانگو، اسی سے مدد چاہو اور غیر سے مدد نہ چاہو، اسی پر بھروسہ کرو اور کسی پر بھروسہ مت کرو۔''(۲)

ایک اور مقام پر مخلوق کا عاجز ہونا، بڑے بلیغ انداز میں بیان فرماتے ہیں:

---

(۱) مشکوٰۃ: ۳۱۴

(۲) خطبات غوثیہ مجلس ص:۴۷۔۳۶۸

”ان کو (اولیاء اللہ کو) معلوم ومحقق ہو چکا کہ مخلوق عاجز ومعدوم ہے، نہ ان کے ہاتھ میں ہلاکت ہے، نہ سلطنت، نہ ان کے قبضہ میں تونگری ہے، نہ افلاس، اور نہ نقصان ہے، نہ نفع، ان (اولیا) کے نزدیک بجز خدائے برتر وبزرگ کے نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قدرت والا اور نہ جلانے اور مارنے والا، اس کے سوا نہ کوئی دینے والا ہے، نہ کوئی روکنے والا، نہ فائدہ یا نقصان پہنچانے والا۔“(۱)

خطبات غوثیہ جو آپ کے مواعظ ومجالس کا مجموعہ ہے، اس میں بے شمار موقعوں پر حضرت رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے کہ مخلوق محتاج ہے۔ صرف اور صرف اللہ مختار کل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس مسئلہ زیر بحث میں قرآن وحدیث کا اور علما کا جو نقطۂ نظر تھا، وہ تو آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اب اس مسئلہ میں جن لوگوں نے اس کے خلاف یہ عقیدہ قائم کیا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے طفیل میں حضرات اولیاء اللہ ہر چیز کی طاقت وقدرت رکھتے ہیں، وہ حاجت روا ومشکل کشا ہوتے ہیں اور کائنات میں تصرف کا حق تعالیٰ نے ان کو دے دیا ہے، ان کی اس غلطی کی وجہ بیان کرنا بھی ضروری ہے۔

ان لوگوں کو جو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے وہ حضرات انبیاء کے معجزات اور حضرات اولیاء اللہ کی کرامات کی وجہ سے ہے، اس میں شک نہیں کہ معجزات انبیاء وکراماتِ اولیاء حق ہیں، مگر یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اختیار میں دے دیا ہے۔ بلکہ معجزات

---

(۱) خطبات غوثیہ مجلس:۵۵۴

اور کرامات دراصل اللہ ہی کے کام ہیں، جو نبی یا ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں، نبی یا ولی کو اختیار نہیں کہ جو معجزہ وکرامت چاہے خود دکھادے۔قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا:

﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ (الأنفال : ١٧)

(جب کافروں پر آپ نے مٹی پھینکی تھی (جس سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ تمام کفار کی آنکھوں میں اس کے ریزے پڑ گئے اور وہ شکست کھا گئے) تو یہ آپ نے نہیں؛ بل کہ اللہ نے پھینکی تھی‘‘۔)

اس آیت کا مطلب علما نے یہ بتایا ہے کہ پھینکنے کا یہ کام کسباً تو آپ نے کیا؛ مگر حقیقت میں اس فعل کا خالق اللہ ہی ہے۔(١)

نیز قرآن میں ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

(الرعد : ٣٨)

(کسی رسول کے اختیار میں نہیں کہ کوئی نشان (معجزہ) لے آئے؛ مگر خدا کے حکم سے۔)

معلوم ہوا کہ اللہ کے حکم کے بغیر نبی اپنی مرضی واختیار سے معجزہ ظاہر نہیں کرسکتا۔اسی طرح کرامت کا مسئلہ ہے۔چنانچہ صحابہ سے بدر کے موقعہ پر جو عجیب قوت ظاہر ہوئی اور چند بے سروسامان صحابہ نے ہزار سے زائد ہتھیاروں سے لیس کفار کا مقابلہ کر کے ان کو قتل کر دیا۔اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ﴾ (الأنفال : ١٧)

(١) دیکھو: شرح فقہ اکبر ملاعلی قاری: ٦٠، روح المعانی: ٩/١٨٥، قرطبی: ١٧/٣٨٥

(ترجمہ: تو تم نے انہیں قتل نہ کیا؛ بل کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا ہے۔)

مطلب یہ کہ یہ کرامت اللہ کا فعل ہے، جو تمہارے ہاتھوں ظاہر ہوا ہے۔ مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جب مسلمان جنگ بدر سے واپس ہوئے تو ان میں سے ایک کہتا تھا کہ میں نے فلاں کو قتل کیا، دوسرا کہتا تھا، میں نے فلاں کو قتل کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ اس قتل کو تم اپنے زور وقوت کی طرف نسبت نہ کرو کہ یہ درحقیقت اللہ کی مدد اور اس کی تقویت وتائید ہے۔''(۱)

الغرض حضرات انبیا واولیا سے جو معجزہ وکرامت ظاہر ہوتے ہیں، وہ حق ہیں، مگر ان کا تعلق اللہ کے فعل سے ہے، اور وہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

جب خدا چاہتا ہے تو ہوتا ہے، ورنہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ انبیا واولیا کو اللہ نے پورا اختیار دے دیا ہے، وہ جو چاہیں اب اپنی مرضی واختیار سے کر سکتے ہیں۔

---

(۱) خزائن العرفان ص: ۲۵۹، تفسیر انفال آیۃ: ۱۷

وسیلہ

حضرات انبیا واولیا، صلحا وشہدا کا وسیلہ لینا شریعت میں کیا درجہ ومقام رکھتا ہے؟
یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے۔ اس کو سمجھنے سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ وسیلہ کی مختلف صورتیں ہیں اوران میں سے ہرصورت کا حکم الگ ہے؛ نیزیہ بھی صاف ہوجانا ضروری ہے کہ وسیلہ کی کون سی صورت میں اختلاف ہے۔

وسیلہ کی پہلی صورت

وسیلہ کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات پیش کرتے ہوئے دعاء میں بزرگان دین ومقبولانِ الٰہی کا واسطہ دیا جائے اوریوں کہے کہ اے اللہ! ان مقبول بندوں کے طفیل وصدقہ میری یہ حاجت ومراد پوری فرمادے۔

یہ صورت دیوبندی حضرات وبریلوی حضرات دونوں کے نزدیک جائز ہےاور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ترمذی، حاکم وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک نابینا شخص حاضر ہوئے اورعرض کیا کہ میں بینائی جاتے رہنے سے پریشان ہوں اورمیرے پاس کوئی رہبرنہیں ہے، آپ نے اس کو دعا سکھائی، جس میں یوں ہے، اے اللہ! میں تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سوال کرتا ہوں تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے جو نبی رحمت ہے۔ (۱)

(۱) شفاء السقام علامہ سبکی: ۱٦٦

یہ روایت صحیح قرار دی گئی ہے، جیسا کہ علامہ سبکی رَحمۃُ اللہ نے فرمایا۔

بزرگانِ دیوبند نے اس وسیلہ کی صورت کو جائز قرار دیا ہے اور خود بھی اس وسیلہ کی صورت کو اپنایا ہے۔ مولانا قاسم صاحب نانوتوی رَحمۃُ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند نے منظوم مناجات، میں اس کو اپناتے ہوئے اللہ سے التجا کی ہے:

بحق سرورِعالم: بحق برتر عالم محمد، نیز حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی رَحمۃُ اللہ ''تقویۃ الایمان'' میں فرماتے ہیں:

> ہاں! اگر یوں کہے کہ ''یا الہ کچھ دے شیخ عبدالقادر کے واسطے'' تو بجا (درست) ہے۔''(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب خلیفہ حضرت تھانوی رحمہما اللہ ''تفسیر معارف القرآن'' میں فرماتے ہیں:

> ''ان (اولیا وانبیا) کا واسطہ دے کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا، روایات حدیث اور ارشادات قرآن سے اس کا بھی جواز ہے۔ وہ بھی اس استعانت (وسیلہ وتوسل) میں داخل نہیں جو حرام وشرک ہے۔''(۲)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان دیوبندی رَحمۃُ اللہ تمام علمائے دیوبند کا مسلک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''وان توسل بالنبی وبعده من الاولياء العظام جائز بان يكون السُوال من الله تعالىٰ ويتوسل بوليّه ونبيه. ''(۳)

(۱) تقویۃ الایمان: ۸۵

(۲) معارف القرآن: ۱/۱۰۰

(۳) بحواله امداد الفتاوی: ۶/۳۲۷

(نبی اوران کے بعد اولیائے اللہ سے وسیلہ پکڑنا جائز ہے،اس طرح کہ سوال تو اللہ تعالیٰ سے ہواور نبی اور ولی کا وسیلہ لیا جائے۔)

الغرض یہ صورت باتفاق جائز ہے،البتہ اہل حدیث جمہور سے ہٹ کراس کوبھی ناجائز کہتے ہیں؛مگران کا یہ کہنا بے دلیل ہے۔

وسیلہ کی دوسری صورت

دوسری صورت وسیلہ کی یہ ہے کہ کہ خود بزرگان دین ومقبولانِ بارگاہ الٰہی سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہماری مرادیں وحاجتیں پوری کرنے کے لیے دعاء کریں،بہ شرطیکہ وہ زندہ ہوں۔اس صورت میں بھی اختلاف نہیں ہے،سب کے نزدیک یہ صورت جائز ہےاورزمانۂ رسالت سے آج تک برابرلوگ حضرات علما صلحابزرگان دین سے اسی طرح دعا کی درخواست کرتے آئے ہیں۔علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ جوتوسل کے مسئلہ میں نہایت متشدد وسخت گیرہوئے ہیں ،وہ بھی اس صورت کو جائزقراردیتے ہیں اوراس کے جواز کے انکارکوکفرقراردیتے ہیں۔وہ اپنے فتاوی میں اس پرتفصیل سے لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''توسل کے لفظ سے تین معنی مراد لیے جاتے ہیں،ان میں سے دو معنی ایسے ہیں جن پرمسلمانوں کے درمیان اتفاق ہے،ایک جو کہ ایمان واسلام کی اصل ہے،یہ کہ حضور پرایمان اورآپ کی اطاعت کے ذریعہ وسیلہ لے۔دوسرے یہ کہ آپ کی دعاء اورشفاعت سے وسیلہ لے۔جوشخص وسیلہ کے ان دومعنوں میں سے کسی ایک کاانکارکرتا ہے، وہ کافرہے۔''(۱)

(۱) فتاوی ابن تیمیہ: ۱/۱۵۳

بہ ہر حال یہ صورت بھی باتفاق مسلمین جائز ہے اور یہ صورت جس طرح نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے وسیلہ لینے کے لیے درست ہے، اسی طرح ابن تیمیہ رَحِمَهُ اللهُ کے نزدیک اولیاء صالحین سے وسیلہ لینے کے لیے بھی درست ہے۔ (۱)

وسیلہ کی تیسری صورت

وسیلہ کی تیسری صورت یہ ہے کہ بعد وصالِ بزرگان دین واولیائے کرام سے، ان کی قبروں پر جا کر دعا کی جائے وہ ہمارے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مرادیں پوری کر دے۔ اس صورت کو علمائے دیوبند ناپسند کرتے ہیں۔ اور ناپسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اولیائے اللہ کے وصال کے بعد قبروں میں ان کا سننا اختلافی مسئلہ ہے۔

بعض علمائے سلف وصحابہ سماع موتی کے قائل ہیں اور بعض قائل نہیں ہیں اور اس سلسلہ میں اکابرین دیوبند کا مسلک وہ ہے، جو مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُ اللهُ نے اپنے عربی رسالہ "تکمیل الحبور بسماع اهل القبور" میں رقم کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

> "ہر فرد اور ہر وقت میں سماع موتی کا اطلاق بے دلیل بات ہے، اس طرح یکسر اس کا انکار، نصوص (مذکورہ بالا) کی مزاحمت ہے، اسی لیے ہم نے فی الجملہ سماع موتی کے ثبوت کا دعوی کیا ہے۔ فی الجملہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت میں ہوگا، کسی وقت میں نہیں، کسی کے لیے ہوگا، کسی کے لیے نہیں، بعض باتوں میں ہوگا، بعض میں نہیں۔" (۲)

اور یہی بات احناف میں سے حضرت علامہ محمود آلوسی بغدادی رَحِمَهُ اللهُ نے

(۱) فتاوی ابن تیمیہ: ۱/۱۳۳

(۲) احکام القرآن عربی: ۳/۱۶۸

اپنی تفسیر روح المعانی میں بیان کر کے فرمایا ہے:

"وھذالوجه ھو الذی یترجح عندی".

(یعنی یہ توجیہ میرے نزدیک راجح ہے۔)(۱)

نیز سلف صالحین سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بعد وصال بزرگوں سے ان کی مزاروں پر جا کر دعا کے لیے کہتے تھے۔ اس لیے دیوبند کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس صورت کو جائز قرار دے کر فرمایا ہے کہ "پھر بھی احتیاط اجتناب میں ہے۔"(۲)

ایک وضاحت

مگر یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وسیلہ کی تیسری صورت کے بارے میں جو لکھا گیا ہے۔ یہ بزرگوں اور اولیائے اللہ کے متعلق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مزار پر آپ سے دعاء کی درخواست علماء دیوبند کے نزدیک جائز ہے۔ کیونکہ آپ کا قبر اطہر میں زندہ ہونا اور زائر قبر کی بات کا سننا ثابت ہو چکا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے آیت:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾

(النسآء: ۶۴)

(اور اگر یہ لوگ جب انہوں نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر، آپ کی خدمت میں آتے پھر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور اللہ کے

---

(۱) احکام القرآن: ۵۸

(۲) امداد المفتین: ۱۹۵

رسول بھی ان کے لیے معافی مانگتے تو یہ لوگ اللہ کو تو اور رحیم پاتے۔)

اس کے تحت میں لکھا ہے:

اس (آیت) کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعائے مغفرت کر دیں، اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی۔ اور آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حاجت کے زمانہ میں ہو سکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔(۱)

اور علمائے دیوبند کا معمول رہا ہے کہ وہ روضۂ اقدس پر حاضری کے موقعہ پر آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللہُ نے اپنی حاضری کے موقعہ پر آپ کے دربار میں جو منظوم نظم پیش کیا تھا۔ اس میں یہ اشعار بھی ہیں:

فانظر الی ظفر قدجاء معتذراً☆والطف بصب کئیب هائم شفق

واستغفر اللّٰہ لی حتی تجاوز عن☆زنات هوت بالجهل فی الزلق

(ظفر کی طرف نظر کرم کیجئے کہ وہ عذر خواہ ہو کر آیا ہے اور اس عاشق پر جو غمگین پیاسا اور خوف زدہ ہے، لطف و کرم کیجئے اور میرے لیے اللہ سے استغفار کیجئے تا کہ وہ میرے نفس کی خطاؤں اور گناہوں کو معاف کرے جو جہالت سے صادر ہوئے ہیں۔)

الغرض علماء دیوبند کا نقطۂ نظر نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے وصال کے بعد بھی آپ کی مزار پر حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرنے کا جواز ہے۔ البتہ آپ کے علاوہ

(۱) معارف القرآن:۲/ ۴۵۹

دوسرے بزرگوں کے حق میں اس صورت وسیلہ کو احتیاط کے خلاف کہتے ہیں، کیوں کہ صحابہ وسلف سے اس کا معمول منقول نہیں ہے۔

چوتھی صورتِ وسیلہ

وسیلہ کی چوتھی صورت وہ ہے جو آج عوام الناس میں معروف ومروج ہے اور بریلوی حضرات بھی اس کی تائید وتوثیق فرماتے ہیں اور عوام کو اس صورت پر کار بند ہونے اور رہنے کی تاکید بھی فرماتے ہیں، وہ یہ ہے کہ خود اولیائے اللہ وبزرگانِ دین سے اس خیال سے اپنی مرادیں مانگے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دربار تک بلاواسطہ رسائی نہیں پا سکتے، جیسے دنیوی بادشاہوں تک بغیر واسطہ ووسیلہ رسائی نہیں ہوسکتی؛ لہٰذا خدا کے بجائے انہی اولیائے کرام سے مانگا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ نے اپنی قدرت کا ایک حصہ ان کو دے دیا ہے؛ لہٰذا وہ اس قدرت سے ہماری مرادیں پوری کردیں گے۔

اس صورتِ وسیلہ کو علمائے دیوبند صحیح نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ اس میں دو غلطیاں ہیں۔

(ا) ایک یہ کہ ان لوگوں نے اللہ کے دربار کو دنیوی بادشاہوں کے درباروں کی طرح سمجھ لیا ہے کہ جس طرح دنیوی بادشاہوں کے دربار میں رسائی کے لیے مختلف درمیانی لوگوں کا واسطہ چاہیے۔ اسی طرح اللہ کے دربار سے حاجت براری کے لیے بھی اولیائے اللہ کا وسیلہ چاہیے۔ یہ دو وجہ سے غلط ہے، اولاً اس لیے کہ اسلام نے اپنی حاجات کے لیے بلاواسطہ اللہ ہی کو پکارنے اور اسی سے مدد چاہنے کی تعلیم دی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے مضمون ''مشکل کشا'' کے تحت ہم نے ثابت کردیا ہے۔

نیز قرآن میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ

الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. الخ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۶)

(اے نبی جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں (کہ میں دور ہوں یا نزدیک) تو فرما دیجئے کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔)

اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ انسان کے قریب ہے اور ہر پکارنے والے کی آواز سنتا ہے۔ لہٰذا اسی سے ہر بندہ مانگے، سوال کرے اور اسی کو پکارے۔

دوسرے اس لیے کہ دنیوی بادشاہوں کے پاس واسطے کی ضرورت اس لیے ہے کہ بادشاہ ہر کسی کی بات خود سن نہیں سکتا۔ نیز سارے لوگ اس کے پاس جمع ہو جائیں تو خود بادشاہ کو بھی بشریت کے تقاضے سے پریشانی ہو جائے۔ تو یہ بادشاہ اپنی کمزوری کی بناء پر واسطے رکھتے ہیں۔ لیکن اللہ کی ذات تو ہر کمزوری سے پاک ہے۔ وہ ہر ایک کی ہر جگہ سے سنتا ہے اور ساری دنیا بھی مل کر اللہ کو بیک وقت پکارے تو اسے ہر ایک آواز کو ممتاز طریقے سے سننے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی۔ تو ایسے خدا کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرنا کونسی عقلمندی ہے؟

(۲) دوسری غلطی اس میں یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس طرح دنیوی حکومتوں میں بعض اختیارات ماتحت افسروں اور گورنروں کو بادشاہ کی طرف سے مل جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ افسر و گورنر اپنے اس اختیار کو استعمال میں لاکر زیر اختیار معاملات میں خود ہی فیصلہ کرتے ہیں اسی طرح اللہ نے اپنے نبیوں وولیوں کو کچھ اختیارات دے دیے ہیں اور وہ اس کی بنا پر کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دو وجہ سے غلط ہے۔

ایک تو اس لیے کہ ہم نے اوپر ''مشکل کشا'' عنوان کے تحت دلائل سے واضح

کردیا ہے کہ اللہ نے ایسا اختیار نہ نبی کو دیا ہے، نہ ولی کو۔ لہٰذا یہ بات من گھڑت ہے۔ جب خدا خود ہی بتائے کہ کسی کو اختیار وقدرت نہیں۔ سارا اختیار مجھ ہی کو ہے تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اللہ کے اختیارات مخلوق کو تقسیم کرکے اپنی فیاضی وسخاوت کا مظاہرہ کریں؟

دوسرے اس لیے کہ دنیا کے بادشاہوں میں یہاں یہ تقسیم مناصب وتفویض اختیارات کا طریقہ اس لیے ہے کہ یہ بادشاہ دوسروں کے محتاج ہیں خود کچھ نہیں کرسکتے، لہٰذا اپنا عجز چھپانے کے لیے ایسا کرتے ہیں؛ مگر اللہ کی ذات تو کسی کی محتاج نہیں۔ اس کو ان بادشاہوں پر قیاس کرنا نری جہالت ہے۔

غرض یہ صورت وسیلہ اصولِ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ اس لیے علماء دیو بند اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

آیت وسیلہ کی تفسیر

بعض لوگ جو وسیلہ کی اس غلط صورت کے حامی ہیں، وہ آیت وسیلہ سے اپنے مطلب پر دلیل لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ آیت یہ ہے۔

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوْا اتَّقُو اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْا اِلیهِ الْوَسِیْلَةَ﴾

(المائدۃ : ۳۵)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو قرآن میں وسیلہ تلاش کرنے کا حکم ہے اور عوام بے چارے صرف لفظ وسیلہ سن کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے مراد یہی صورت ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن میں صرف یہی تو فرمایا کہ وسیلہ تلاش کرو۔ جب وسیلہ کی کئی صورتیں ہیں تو ان میں سے یہاں کون سی صورت مراد ہے؟ اس کو کیوں

نہیں پوچھا جاتا، جب اور بھی صورتیں وسیلہ کی ہیں اوران کے جائز ہونے پر اتفاق بھی ہے،تو یہاں اسی کو مراد لینا چاہیے۔دوسرے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس آیت میں علماء تفسیر نے نیکیاں مراد لی ہیں،یعنی بندہ اپنی عبادات ونیکیوں کے ذریعہ اللہ سے تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔جمہور علما اس کا یہی مطلب لیتے ہیں جیسا کہ روح المعانی،قرطبی وغیرہ میں ہے۔

حاصل یہ کہ بندہ اللہ سے ڈرے اوراللہ سے قرب حاصل کرنے کے لیے نیکیوں میں لگے۔یہی اس کے لیے وسیلہ ہے۔کہاں یہ وسیلہ اور کہاں وہ جس میں خلافِ شریعت امور کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

عوام میں وسیلہ کی بنیاد پر جہالت

آج عوام میں وسیلہ کی بنیاد پر جو خرافات و جہالت کی باتیں پائی جاتی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، مزاروں پر نذر و نیاز، عرس وفاتحہ، بزرگوں کو پکارنا، ان کو سجدے کرنا وغیرہ وہ سب اس وسیلہ کی غلط صورت کو دل میں جمانے کا نتیجہ ہے۔

شفاعت

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ، اولیائے اللہ، صالحین وشہدائے کرام کا شفاعت کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہر زمانے میں اہل سنت والجماعت کا اتفاق رہا ہے۔ صرف ایک گمراہ فرقہ معتزلہ گزرا ہے، جس نے شفاعت سے انکار کیا ہے، مگر وہ بھی رفع درجات کے لیے شفاعت کے قائل ہیں۔

دیوبندی علما اور بریلوی علما دونوں اپنی اپنی کتابوں میں بڑے اہتمام سے اہل سنت کا یہ عقیدہ پیش کرتے ہیں کہ انبیا واولیا، صلحا وشہدا، علما وحفاظ کرام، اپنے اپنے درجہ ومرتبہ کے لحاظ سے گنہ گاروں اور عام مسلمانوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔

مسئلہ شفاعت ایک اتفاقی مسئلہ

چناں چہ یہاں دیوبندی علما میں سے ایک کا اور بریلوی علما میں سے ایک کا حوالہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ دیوبندی علما میں حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے مشہور ومعروف خلیفہ مرشدی حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ اپنی کتاب ''تعلیمات اسلام'' میں لکھتے ہیں:

> ''آپ (نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) قیامت کے روز خدا تعالیٰ کی اجازت سے گنہ گاروں کی بخشش کی سفارش کریں گے۔ اسی لیے آپ کو شفیع المذنبین کہا جاتا ہے۔ آپ کی سفارش قبول کی جائے گی اور

کافر و مشرک کے سوا سب کی سفارش ہوگی۔ آپ کے علاوہ دیگر انبیا واولیا وشہدا صلحا بھی سفارش کریں گے؛ مگر بلا اجازت کوئی سفارش نہ کرے گا۔‘‘(۱)

بریلوی عالم مولانا امجد علی رضوی صاحب ’’بہار شریعت‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’قیامت کے دن مرتبۂ شفاعت کبریٰ حضور کے خصائص سے ہے۔‘‘(۲)

بہ ہر حال یہ طے شدہ ہے کہ شفاعتِ ابنیا واولیا صلحا وشہدا حق ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔

نقطۂ اختلاف کی وضاحت

البتہ اختلاف جو کچھ ہے وہ شفاعت کی صورت میں ہے، ایک شفاعت وجاہت ہوتی ہے کہ کوئی نبی یا ولی محض اپنی وجاہت و مرتبہ سے اللہ کی مرضی کے بغیر کسی کی شفاعت کرے، جیسے دنیوی بادشاہوں کے دربار میں وزیر و مشیر لوگ اپنے مرتبہ کی وجہ سے کسی کے حق میں سفارش کرتے ہیں اور بادشاہ کو اس خیال سے ان کی سفارش قبول کرنی پڑتی ہے کہ کہیں یہ لوگ باغی نہ ہو جائیں۔

دوسری شفاعت محبت کہ محبوب کسی کی سفارش کرے اور محبّ کو محض محبت کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے اس کی سفارش قبول کرنا پڑتا ہے۔

تیسری شفاعت بالاذن یعنی اجازت پا کر سفارش کرنا۔

(۱) تعلیمات اسلام حصہ اول ص:۶۲

(۲) بہار شریعت:۱۳

بریلوی علماء تینوں قسموں کی شفاعت کے قائل ہیں۔[1]

اور علماء دیوبند فرماتے ہیں کہ اگر چہ انبیا و اولیا اللہ کے حضور وجاہت بھی حاصل ہے اور مقام محبوبیت بھی حاصل ہے ؛مگر اس وجاہت ومقام محبوبیت کو دنیوی بادشاہوں کے دربار میں حاصل ہونے والی وجاہت اور لوگوں کے درمیان حاصل ہونے والے مقام محبوبیت پر قیاس کرنا درست نہیں۔لہٰذا کسی بڑے سے بڑے نبی وولی کی وجاہت اللہ کو اپنی مرضی کے خلاف سفارش قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ اسی طرح ان کا مقام محبوبیت بھی اللہ تعالیٰ کو سفارش قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

لہٰذا انبیا و اولیا جو شفاعت کریں گے وہ نہ شفاعت وجاہت ہوگی اور نہ شفاعتِ محبت ؛بل کہ وہ تیسری شفاعت ہوگی جو اللہ کی اجازت ومرضی سے ہوگی۔

یہ ہے علمائے دیوبند کا نظریہ ونقطۂ خیال۔

اللہ تعالیٰ کسی کی وجاہت ومحبت سے مجبور نہیں ہوتا

اب ہم اس کے دلائل پر نہایت اختصار سے کلام کریں گے۔ پہلے وجاہت کی بات لیجئے۔قرآن مجید نے حضرت نوح عَلَيْهِ السَّلَامُ کے واقعات میں بتایا ہے:

انہوں نے اپنے بیٹے (کنعان) کے حق میں اللہ سے سفارش کی ؛مگر اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ان کی یہ سفارش رد فرما دی:

﴿ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ﴾ (هُوْدْ : ۴۵-۴۷)

”تمہارا یہ بیٹا غیر صالح اعمال کی وجہ سے تمہارا بیٹا کہلانے کا مستحق

(۱) دیکھو: بہار شریعت: ۱/۱۴

نہیں، آپ کو جس بات کا علم نہیں اس کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کیجیے۔''

غور کیجیے کیا حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ کے نزدیک وجاہت ومقام محبوبیت حاصل نہ تھا؟ کہ اللہ نے ان کی شفاعت کو رد کر دیا۔ بے شک وجاہت بھی حاصل تھی محبوبیت بھی حاصل تھی ؛مگر یہ وجاہت ومحبوبیت اللہ کو مجبور نہیں کر سکتی ؛بل کہ یہ وجاہت ومحبوبیت جوان کو یا ان کے علاوہ اور انبیا کو حاصل ہے، وہ محض اللہ کی عنایت ورحمت ہے۔اس کو دنیا کی وجاہت ومحبوبیت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

اور ملاحظہ کیجیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے کتنے محبوب اور اللہ کے نزدیک کس قدر مرتبہ والے تھے؛ مگر جب انہوں نے اپنے باپ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی سفارش کی تو اللہ نے قبول نہ فرمائی اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنے باپ کے حق میں مغفرت کی سفارش کی تھی۔ یہ اس وجہ سے تھی کہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو وہ اس سے بری ہو گئے۔''(۱)

نیز شفیع اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا میں اپنے چچا ابو طالب کے لیے استغفار کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

''نبی یا مسلمانوں کو لائق نہیں کہ مشرکین کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں اگر چہ وہ ان کے رشتہ دار ہی ہوں۔ جب کہ انہیں کھل گیا کہ وہ دوزخی ہیں۔''(۲)

---

(۱) توبہ:۱۱۴

(۲) توبہ:۱۱۳

مولانا نعیم الدین مرادآبادی اس کا شان نزول یہی بتاتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا کہ میں تمہارے لیے استغفار کروں گا جب تک کہ مجھے ممانعت نہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر ممانعت فرمادی۔(۱)

یہ معلوم و مسلم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ کوئی اللہ کو محبوب ہے نہ اللہ کے نزدیک ذی وجاہت ؛ مگر آپ کے چچا کے حق میں اللہ نے آپ کی سفارش قبول نہ کی ؛ بل کہ خود سفارش کرنے سے بھی روک دیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شفاعت و سفارش، وجاہت و محبوبیت کی وجہ سے قابل قبول نہ ہوگی ؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کی وجہ سے مقبول ہوگی۔

شفاعت، اجازت پر موقوف ہے

اوپر یہ ثابت ہوگیا کہ محض وجاہت و محبوبیت سے سفارش نہ ہوگی اور ہوگی تو مقبول نہ ہوگی ؛ بل کہ اللہ کی اجازت و مرضی سے ہوگی۔ اس مضمون پر قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں یہاں صرف دو آیات نقل کرتا ہوں۔ ایک جگہ فرمایا۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِه﴾ (البقرۃ : ۲۵۵)

(کون ہے جو اللہ پ کے اس سفارش کرے بغیر اس کی اجازت کے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِه﴾ (یونس : ۳)

(کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس (اللہ) کی اجازت کے بعد۔)

ان سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ کی طرف سے اجازت نہ ہوگی، کوئی سفارش

---

(۱) خزائن العرفان :۲۹٦

نہ کرسکے گا۔یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن سارے انبیا بھی سفارش کرنے سے گھبرائیں گے اور حضرت شفیع اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوگوں کو بھیجیں گے۔اورآپ بھی سجدہ میں پڑ کر اجازت طلب کریں گے۔جب اجازت مل جائے گی تو سفارش کریں گے۔(بخاری وغیرہ) اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں۔

شفاعت کس کے لیے ہوگی؟

پھر یہ سفارش وشفاعت بھی صرف اس کے لیے ہوسکے گی۔جس کے لیے اللہ کی طرف سے اجازت ہوگی۔اس کی مثال ایسی ہے۔جیسے ایک مجرم بادشاہ کے دربار میں لایا گیا اور بادشاہ اس مجرم کو خود معاف کردینا چاہتا ہے۔اس وجہ سے کہ وہ ہمیشہ حکومت کا خیرخواہ رہا ہے یا بادشاہ کا مطیع فرمانبردار رہا ہے۔اب بادشاہ اپنے وزرا ومشیرین کی طرف دیکھ کر کہتا ہے کہ بتاؤ! اس مجرم کو معاف کردیا جائے؟ وزرا ومشیرین بادشاہ کا اشارہ سمجھ جاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ حضور! اس کو معاف کردیا جائے،یہ سفارش بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہے۔اسی طرح جس کے حق میں اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت،معافی کی ہوگی اللہ کا اشارہ پاکر شفاعت کی جائے گی۔
قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهُ﴾ (سبا: ۲۳)

(اس دن اللہ کے پاس شفاعت کام نہ آئے گی مگر اس کو جس کے لیے وہ اجازت دے۔)(۱)

یہ مضمون اور آیات میں بھی آیا ہے۔مثلاً: انبیاء:۲۸،طٰہٰ:۱۰۹،زخرف:۸۶،نجم:۲۶۔
غرض یہ کہ شفاعت کے لیے ایک تو یہ ضروری ہے کہ اللہ کی جازت ہو،دوسرے یہ کہ شفاعت اسی کے لیے نفع دے گی جس کے لیے اللہ کی مرضی ہو اور اللہ کی مرضی

اسی کے لیے ہوگی جو وفادار ہو اور نفس کے تقاضے سے گناہ میں آلودہ ہو گیا ہو، اس لیے کفار کے حق میں شفاعت نہ ہوگی۔

آج کل لوگ شفاعت کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں گناہ کے لیے جرأت پیدا ہو جاتی ہے اور یوں سمجھا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر اتنے شفیق اور مہربان ہیں کہ وہ ہمارے لیے ضرور سفارش کریں گے اور اللہ کو نعوذ باللہ ان کی بات کو ضرور ماننا پڑے گا۔ یہ انداز فکر بلاشبہ غیر مستقیم ہے۔

اختتام

الحمدللہ کہ دیوبندیت وبریلویت کے جن اہم اختلافی مسئلہ پر کلام کرنے کا ارادہ تھا، وہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، دلائل کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

میں تمام ناظرین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ تنگ نظری وتعصب سے دور ہو کر، نہایت وسیع القلبی سے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کریں، اسی لیے ہم نے دلائل کو اسی سادہ طرز پر پیش کیا ہے، جو قرآن وحدیث میں اختیار کیا گیا ہے۔ علمی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں سے پوری طرح پرہیز کیا ہے۔ کہ ان سے مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ورسول نے قرآن وحدیث میں سادگی کے ساتھ ''عقائد'' کی تعلیم وتفہیم کی ہے تاکہ موٹی سے موٹی عقل والا بھی ان کو بآسانی سمجھ لے۔ اسی طرز کو اختیار کر کے ہمیں بھی صحیح راستہ مل سکتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو راہ حق کا رہبر بنائے اور قرآن وحدیث کا سچا پیرو بنائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

منکراتِ رمضان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا مہربان علی صاحب نانوتوی رحمہ اللہ
استاذ مدرسہ عربیہ امداد العلوم ہرسولی مظفر نگر

نحمدہ ونصلی علی الرسول الاکرم:

اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور صاف ستھرے ماحول پر منکرات ومحدثات کا گرد وغبار بھی آ کر کبھی کبھی گرتا رہتا ہے، اگر اس کو اہل علم اپنی خداداد صلاحیت اور دینی علم کی حرارت سے دور نہ کرتے رہیں تو وہ رفتہ رفتہ تہ بتہ جم کر غلاف کی حیثیت لے لیتا ہے اور دینِ حنیف کی اصلی صورت پوشیدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ماہ مبارک رمضان شریف میں بھی کچھ خود ایجاد باتیں تقریباً ہر جگہ پیدا ہوگئی ہیں، جن سے اصلی دین کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، واعظین، خطبا اور اصحابِ قلم کا فریضہ ہے کہ بلا خوف لومۃ لائم امت کو صراط مستقیم سے آگاہ کرتے رہیں اور ''بھیڑ کی صورت میں بھیڑیے'' کو پنپنے کا موقعہ نہ دیں۔

اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائیں مؤلف سلمہ کو کہ انھوں نے جس طرح دیگر بدعات وخرافات پر قلم اٹھایا اور کامیابی سے ہم کنار ہوگئے، رمضان المبارک کے منکرات پر بھی خاصا اور اہم مواد جمع کر دیا۔

میں نے اس کا مسودہ اول سے آخر تک دیکھا ہے، سب مدلل اور محول ہے۔ حق تعالی اس رسالہ سے امت مسلمہ کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر استفادہ کی توفیق نوازیں اور مولانا کے زور قلم میں ترقی عطا فرمائیں۔

فقط

۱۰/ رجب ۱۴۱۲ھ
احقر مہربان علی بڑوتوی
(مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ مؤلف

اسلام دشمن عناصر یا جاہل و بے دین لوگوں نے دین وشریعت میں جو رخنہ اندازیاں کی ہیں، ان میں سب سے کامیاب وہ ہیں جو دین کے نام پر بدعات وخرافات کی شکل میں ہوئی ہیں۔ان بدعات نے دین کا اصلی وحقیقی حلیہ ہی نہایت بے دردی کے ساتھ بگاڑ کر رکھدیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام بدعات وخرافات کے پلندے کے ساتھ کسی غیر مسلم کے سامنے دین کو پیش کیا جائے تو بلا شبہ وہ قطعاً اس سے متاثر نہ ہوگا، جبکہ اصلی وحقیقی دین وہ عجیب التاثیر وکیمیا اثر شئی ہے جو سب ہی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی قبول کرتا ہے،کوئی عناد وتعصب سے قبول نہیں کرتا ہے۔

اور یہ بدعات وخرافات جن کو دین کا لیبل لگا کر پیش کیا جاتا ہے، ان سے کون سا شعبۂ دین خالی ہے؟ ہر شعبہ وہر باب میں ان کو داخل کرنے والوں نے داخل کر کے دین اسلام کے اصلی چہرے کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے، انہی میں سے وہ بدعات بھی ہیں جو رمضان اور عید کے موقعہ پر اپنائے جاتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ میں احقر نے ان بدعات ورسومات پر شرعی دلائل سے مفصل کلام کیا ہے جو رمضان اور عید سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس رسالہ کی ترتیب وتالیف کا داعیہ حضرت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اس حدیث سے پیدا ہوا جس میں فرمایا گیا ہے:

’’جب میری امت میں بدعتیں پیدا ہو جائیں اور میرے صحابہ کو برا کہا جانے لگے تو عالم کو چاہئے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے جو ایسا نہ کرے گا اس پر خدا اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔‘‘(۱)

خیال ہوا کہ اپنی مقدور بھر کوشش سے رمضان وعید سے متعلق غیر شرعی امور ورسوم کی تردید کردوں کہ رمضان جیسے مبارک مہینہ میں اور عید جیسی نعمت کے موقعہ پر ان سے اجتناب کیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مقبول ومفید بنائے، ناظرین سے گزارش ہے کہ اپنی نیک دعاؤں میں فراموش نہ کریں اور سہو وغلطی دیکھیں تو مطلع فرما کر ماجور ہوں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

خادم مدرسہ مسیح العلوم

۳۰/ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ

---

(۱) الصواعق المحرقہ: ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تراویح پر اجرت کا مسئلہ

آج کل تراویح میں قرآن سنانے پر اجرت لینے دینے کا رواج عام ہوگیا ہے اور اب یہ رسم اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اس معاملے کو برا تو کیا مستحسن ومحبوب سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ ناجائز اور قبیح رسم ہے؛ کیونکہ عبادت پر اجرت لینے دینے کو شریعت اسلامیہ نے ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں مثلاً:

(۱) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ اَخَذَ قَوْساً عَلٰی تَعْلِیْمِ الْقُرْآنِ قَلَّدَہُ اللّٰہُ قَوْساً مِّنْ نَارٍ. »

”جو شخص قرآن کی تعلیم پر (بطور اجرت) کمان لے تو اللہ تعالیٰ اس کے گلے میں آگ کی کمان ڈالیگا۔“(۱)

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں سوائے عبد الرحمٰن بن یحییٰ رحمۃ اللہ کے۔ بیہقی رحمۃ اللہ نے ان کو ضعیف قرادیا ہے، مگر ابوحاتم، ابن حبان رحمہما اللہ جیسے ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے۔(۲)

---

(۱) اعلاء السنن: ۱۶/۱۶۶

(۲) دیکھو: تہذیب التہذیب: ۶/۲۹۴

لہٰذا یہ روایت حسن ہوگی۔

(۲) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ يَتَأَكَّلُ بِهِ النَّاسَ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهُ عَظْمٌ لَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ. »

(جو شخص اس لیے قرآن پڑھتا ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں سے لیکر کھائے تو قیامت میں اس کو اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی ہی ہڈی ہوگا، اس پر گوشت نہ ہوگا۔)(۱)

(۳) امام احمد اسحاق ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن شبلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پڑھو اور اس کے ذریعہ مت کھاؤ۔(۲)

ان روایات اور اس معنی کی دیگر روایات کے پیش نظر فقہائے احناف نے عبادات پر اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے. چناں چہ صاحب ھدایہ فرماتے ہیں:

"والاصل عندنا ان كل طاعة يختص بها المسلم لا يجوز الاستيجار عليه." (۳)

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ ہر وہ عبادت جو مسلمان کے ساتھ خاص ہے، اس پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے۔)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "شرح وقایہ" میں ہے:

---

(۱) شعب الایمان: ۵۳۲/۲

(۲) الدرایۃ مع الھدایہ: ۲۸۷/۳

(۳) ھدایہ: ۲۸۷/۳

"والاصل عندنا انه لا یجوز الاجارة علی الطاعات و لا علی المعاصي." (۱)

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ عبادات اور معاصی پر اجارہ جائز نہیں۔)

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ اصل وظاہر مذہب میں عبادات وطاعات پر اجرت لینا دینا جائز نہیں۔اور یہ ظاہر ہے کہ تراویح اور اس میں تلاوت کلام اللہ دونوں عبادات ہیں، لہٰذا اس پر بھی اجرت لینا دینا جائز نہ ہوگا۔ چناں چہ اکابر علما و فقہا نے اس کو صاف وصریح الفاظ میں ناجائز قرار دیا ہے۔

ہم یہاں چند اکابر کے فتاوی نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا دلائل کی بنا پر حضراتِ علما نے تراویح اور ختم قرآن پر اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے:

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"رمضان شریف میں جو قرآن پاک تراویح ونوافل میں سنایا جاتا ہے، اس کی اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں۔اور آمدنی مساجد سے یہ خرچ اور بھی زیادہ برا ہے، بلکہ متولی پر اس کا ضمان آئے گا۔"(۲)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے ایک طویل فتوی کے آخر میں فرمایا ہے:

"حاصل جواب یہ ہوا کہ رواج مذکور فی السوال (یعنی حافظ کو دینے کا رواج) محض باطل اور مخالف شرع ہے۔ اور ایسا ختم ہرگز موجب ثواب نہیں؛ بل کہ موجب معصیت ہے۔"(۳)

---

(۱) شرح وقایه :۲۹۹

(۲) فتاوی رشیدیه:

(۳) امداد الفتاوی: ۱/۴۸۱

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''اجرت دینا اور لینا قرآن کریم کے سننے اور پڑھنے کے لیے جائز نہیں اور اس میں کسی کو ثواب نہیں ملتا، نہ پڑھنے والے کو، نہ سننے والے کو اور سنتِ ختم قرآن اس طرح پر ادا نہیں ہوتی۔''(۱)

مولانا شفیع صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''تراویح میں ختم قرآن پر اجرت مقرر کر لینا خواہ صراحۃً ہو، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں یا بطورِ عرف و عادت ہو جیسا کہ عموماً آج کل رائج ہے، دونوں صورتوں میں جائز نہیں۔''(۲)

حضرت مولانا محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''اجرت مقرر کر کے امام کو تراویح کے لیے بلانا مکروہ ہے''۔(۳)

ان تمام عبارات سے ثابت ہوا کہ تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا اور دینا ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک صریح روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آئی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے بھی اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چناں چہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے ''اعلاء السنن'' میں بحوالہ ''محلی'' یہ روایت نقل کی ہے:

''أَنَّ عَمَّارَ ابْنَ يَاسِرٍ اَعْطٰى قَوْماً قَرَءُوا الْقُرْآنَ فِي رَمَضَانَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَ فَكَرِهَهُ فَقَالَ عُمَرُ اَوُ يُعْطٰى عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ ثَمَناً؟''

(۱) عزیز الفتاوی: ۲۶۳

(۲) امداد المفتین: ۳۶۳

(۳) فتاوی محمودیہ: ۳۵۱/۲

(حضرت عمار بن یاسر ﷛ نے ایسے لوگوں کو جنھوں نے رمضان میں قرآن پڑھا تھا کچھ دیا، یہ بات حضرت عمر ﷛ کو معلوم ہوئی تو آپ نے اس کو برا سمجھا اور ایک روایت میں حضرت عمر ﷛ نے فرمایا کہ کتاب اللہ پر بھی کچھ قیمت دی جاتی ہے؟''(۱)

اس روایت سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت عمر ﷛ نے رمضان میں ختم قرآن پر کچھ دینے کو مکروہ و برا سمجھا، حالاں کہ یہاں دینے اور لینے والے کا مقصد اجرت نہیں تھا اور نہ ہی اس کا وہاں کوئی عرف و رواج تھا۔ خیال فرمایئے کہ جہاں بطور اجرت دینا اور لینا ہوتا ہو اور اس کا رواج ہو، وہاں حضرت عمر ﷛ کا کیا فیصلہ ہوگا؟ الغرض تراویح میں ختم قرآن پر اجرت سراسر ناجائز ہے اور اسی وجہ سے حضرات علما نے بلا اجرت تراویح پڑھانے والے حفاظ نہ ملنے کی صورت میں غیر حافظ کے پیچھے ''الم تر کیف'' سے تراویح پڑھ لینے کا فتوی دیا ہے۔

چناں چہ مرشدی مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت برکاتہم اپنی تصنیف ''تعلیمات اسلام'' میں فرماتے ہیں:

''اگر حافظ صاحب کچھ لیکر قرآن شریف سنائیں تو ہرگز نہ سنیے! بلکہ ''الم تر کیف'' سے کوئی ناظرہ خواں تراویح پڑھا دے، یہ بہتر ہے کچھ لے کر قرآن شریف سننے سنانے سے، یہ قرآن شریف کو بیچنا ہے اور یہ حرام ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَناً قَلِيْلاً ﴾ (۲)

---

(۱) اعلاء السنن: ۱۶/۱۶۹

(۲) تعلیمات اسلام: ۲/۱۰۰

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ پھر علما وفقہا نے پنجوقتہ نمازوں کی امامت، تعلیم قرآن وحدیث وفقہ، اذان و وعظ وغیرہ عبادات پر اجرت کو کیوں اور کیسے جائز قرار دیا ہے؟ اور ان پر اجرت اگر جائز ہے تو تراویح پر کیوں نا جائز ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات فقہا نے ان عبادات پر اجرت کو ضرورت شرعی کی بنا پر جائز قرار دیا ہے۔ اور وہ ضرورت یہ ہے کہ ان چیزوں پر اجرت نہ دی جائے تو یہ اہم فرائض وشعائر اسلام ضائع ہو جائیں گے۔ کیوں کہ یہ روزانہ کی ضروت کی چیزیں ہیں اور ان میں لگنے والے کو مستقل اور اچھا خاصا وقت قربان کرنا پڑے گا اور اپنے آپ کو ان کی خاطر محبوس کرنا ہوگا۔ پس اگر ان حضرات کا وسیلۂ معاش کچھ نہ ہوگا تو بھلا وہ ان چیزوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس لئے بضرورت شرعی اس کو جائز قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف تراویح فرض وواجب نہیں اور نہ ہی تراویح میں ختم قرآن فرض وواجب ہے؛ بلکہ مستحب اور زیادہ سے زیادہ سنت ہے، پھر یہ سال میں ایک ماہ کا عمل ہے اور اس ماہ میں بھی صرف تھوڑا سا وقت اس کے لئے لگتا ہے، مستقل وقت دیکر محبوس ہو جانے کی اس میں نوبت نہیں آتی، لہٰذا یہ شرعی ضرورت کے دائرہ سے خارج ہے۔ اس لئے اس کو اصل حکم کے مطابق حرمت کے حکم میں رکھا گیا ہے۔ اس تفصیل سے دونوں قسم کی عبادات میں فرق واضح ہو گیا۔

اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل علماء کی عبارات کے ساتھ میرے رسالے ''رمضان اور جدید مسائل'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (۱)

اس کے بعد اس سلسلے کے کچھ شبہات کا جواب دے دینا ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ختم قرآن پر دی جانے والی رقم اجرت نہیں ہدیہ ہے۔ مگر یہ سراسر غلط

(۱) رمضان اور جدید مسائل: ۶۰-۶۱

ہیں کیوں کہ ہدیہ وہ ہوتا ہے جو بلا عوض محض طیب خاطر سے دیا جائے اور اس میں جبر واکراہ نہ ہو اور تراویح کی اجرت کے مسئلہ میں جبر واکراہ بھی ہوتا ہے اور عوض کا شبہ بھی موجود ہے۔ لہٰذا اس کو ہدیہ قرار دینا غلط ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اجرت مقرر کرنے اور شرط کرنے سے یہ ناجائز ہوتا ہے، اگر شرط نہ لگائے تو جائز ہے۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ "**المعروف کالمشروط**"(۱) کہ جو عرف میں رائج ہو وہ مشروط کی طرح ہے۔ لہٰذا جب تراویح پر لینے دینے کا رواج ہوگیا تو اب بلا شرط لینا بھی ناجائز ہوگا، جیسے شرط کر کے لینا ناجائز ہے۔

بعض نے یہ حیلہ بھی بیان کیا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں میں سے ایک دو وقت کی امامت بھی تراویح کے ساتھ کر لے تو اجرت لینا جائز ہے؛ مگر یہ بھی لغو ہے، کیوں کہ کسی بھی چیز کا صحیح وغلط ہونا اس کے مقصد کے لحاظ سے ہوتا ہے اور یہاں چوں کہ مقصد تراویح ہے نہ کہ امامت، اس لیے یہاں امامت کا اعتبار نہ ہوگا؛ بلکہ تراویح کا ہوگا اور تراویح پر اجرت لینا ناجائز ہے۔ لہٰذا یہ تاویل بھی غلط ہوگئی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ہم اس عبادت کی اجرت نہیں لیتے ہیں؛ بلکہ اتنے وقت تک محبوس ہو جانے کا نفقہ لیتے ہیں۔ مگر اس کا جواب بقول حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ یہ ہے کہ:

> "یہ توجیہ (تاویل) جس کی مخصوص ہے صورت ضرورت کے ساتھ اور جہاں ضرورت مذکورہ نہ ہو، وہاں یہ تاویل مقبول نہ ہوگی۔ ورنہ طاعت کی ایک فرد بھی باقی نہ رہے گی جس پر حرمت استیجار کا حکم کیا جائے۔"(۲)

(۱) قواعد الفقہ: ۱۲۵

(۲) امداد الفتاوی: ۱/۴۷۹

حاصل یہ ہے کہ جس کی وجہ سے نفقہ ملنا اوراس کا جائز ہونا اس وقت ہے، جب کہ وہ کام ضروری ہو، اور تراویح اوراس میں قرآن کا ختم ضروری نہیں، لہٰذا یہ تاویل مقبول نہیں ۔غرض یہ کہ تراویح پر اجرت ناجائز ہے، اوراس کے جواز کی کوئی تاویل وتوجیہ ممکن نہیں، لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

تہجد میں جماعت کا اہتمام

رمضان مبارک کی آخری راتوں میں بعض جگہ نماز تہجد کو با جماعت ادا کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اوراس عمل کو مستحسن وپسندیدہ خیال کیا جاتا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دین وشریعت میں ایک جدید عمل اور بدعت ہے؛ کیوں کہ دور رسالت وصحابہ میں تہجد کو جماعت سے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ فضیلت اور ثواب حاصل کرنے میں رسول کریم ﷺ اور حضرات صحابہ سب سے آگے ہوتے تھے، اس کے علاوہ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز گھر میں گذارنا افضل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو نماز گھر میں گذاری جاتی ہے، اس میں اصل اخفا وافراد ہے یعنی تنہا گذارنا ہے، لہٰذا نوافل کو جماعت سے پڑھنا ان احادیث کے خلاف ہوگا۔ مثلاً:

(۱) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« صَلُّوْ اَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوْتِكُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوةِ صَلٰوةُ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهٖ اِلَّا الْمَكْتُوْبَة. »

(اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو؛ کیوں کہ سب سے افضل نماز آدمی کی وہ ہے جو گھر میں ہو، سوائے فرض کے۔)(۱)

---

(۱) رواه النسائی بسند جيد و ابن خزيمه اعلاء السنن: ۷/۷۷

(۲) حضرت عبد اللہ ابن سعد ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے گھر میں نماز پڑھنے اور مسجد میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا:

« قَدْ تَرٰی مَااَقْرَبُ مِنْ بَيْتِيْ مِنَ الْمَسْجِدِ فلاَنْ اُصَلِّيَ فِيْ بَيْتِيْ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اُصَلِّيَ فِي الْمَسْجِدِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ صَلٰوةُ الْمَكْتُوْبَةِ. »

(تم دیکھتے ہو کہ میرا گھر مسجد سے کس قدر قریب ہے، پھر بھی میں گھر میں نماز پڑھنے کو مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، مگر یہ کہ فرض نماز ہو۔)(۱)

ان احادیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز مسجد کے بجائے گھر میں گذارنا افضل ہے، وہیں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت فرض نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور نفل میں اصل اخفاء اور انفراد ہے؛ کیوں کہ جو نماز اجتماع کے ساتھ ادا کرنا مشروع ہے، اس کا مسجد میں گذارنا افضل ہے، معلوم ہوا کہ جس کو گھر میں پڑھنا افضل ہے، اس میں جماعت نہیں ہے، لہذا غیر مشروع طریقہ پر نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ البتہ کبھی کبھی صرف دو یا زیادہ سے زیادہ تین آدمی بلا اعلان وتداعی کے جماعت سے نفل نماز ادا کرلیں تو فقہا نے جائز لکھا ہے۔ باقی جماعت کثیر کے ساتھ اعلان وتداعی کے ساتھ باہتمام وانتظام پڑھنا بلاشبہ بدعت ہے۔

علامہ شامی رَحِمَهُ اللهُ نے لکھا ہے:

”ظاہر یہی ہے کہ نفل نماز میں جماعت غیر مستحب ہے۔ پھر اگر کبھی

---

(۱) شرح معاني الآثار: ۱/۱۶۷

کبھی اتفاقاً کر لی جائے تو مباح ہوگا (مستحب نہیں) اور اگر اس کو پابندی سے کیا تو یہ بدعت مکروہہ ہے؛ کیوں کہ یہ متوارث طریقہ کے خلاف ہے۔"(۱)

حضرات علمائے دیوبند نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور تبلیغی جماعت کے اکابر علماء کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ رئیس التبلیغ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللہُ اپنی مایہ ناز تصنیف "امانی الاحبار شرح معانی الآثار" میں فرماتے ہیں:

"درمختار میں ہے کہ رمضان کی وتر میں (جماعت) مستحب ہے۔ اور رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کی وتر میں اور نفل نماز میں تداعی کے ساتھ (جماعت) مکروہ ہے۔"(۲)

اس عبارت میں رمضان کے علاوہ کے الفاظ کا تعلق صرف وتر سے ہے، نفل سے نہیں جیسا کہ اس کی عربی عبارت سے ظاہر ہے۔ اہل علم کے لیے حضرت جی رَحِمَہُ اللہُ کی عربی عبارت بھی درج کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے:

" قال في الدر وفي وتر رمضان مستحبة، وفي وتر غيره وتطوع على سبيل الله التداعي مكروهة."

اس میں ظاہر ہے کہ "غیرہ" "رمضان کے علاوہ" کا تعلق صرف وتر سے کیا گیا ہے، تطوع (نفل) سے نہیں؛ بل کہ نفل کو الگ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رَحِمَہُ اللہُ "لامع الدراری" کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

---

(۱) ردالمحتار مع در مختار: ۲/ ۴۸

(۲) اماني الاحبار: ۴/ ۲۷۷، درمختار کا حوالہ لکھونہ کہ امانی کا، یاسین

''میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ (جماعت نفل) پر علامہ ابن عابد بن شامی رحمۃ اللہ نے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اور خلاصۃ الفتاوی سے نقل کیا ہے کہ یہ (نفل کی جماعت) اگر کبھی اتفاقاً ہو تو جائز ہے، مکروہ نہیں اور اگر اس پر پابندی کریں تو بدعت مکروہہ ہے؛ کیوں کہ یہ متوارث طریقہ کے خلاف ہے۔''(۱)

ہم نے یہاں اکابر وعلما اور تبلیغی جماعت کے سرپرست علما میں سے دو جلیل القدر ہستیوں کو پیش کیا ہے، جنھوں نے نفل کی جماعت کا اہتمام اور اس پر پابندی کو مکروہ و بدعت قرار دیا ہے۔

اسی طرح بریلوی مسلک کے مشہور ومستند عالم مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''بہار شریعت'' میں لکھا ہے:

''نوافل میں اور علاوہ رمضان کے وتر میں اگر تداعی کے طور پر ہو تو (جماعت) مکروہ ہے اور تداعی کے یہ معنی ہیں کہ تین سے زیادہ مقتدی ہوں۔''(۲)

اگر کسی کو مزید علما وائمہ کے فتاوی دیکھنے کا شوق ہو تو وہ ہمارا رسالہ ''جماعت تہجد کا شرعی حکم'' ملاحظہ کرے۔ اس میں ہم نے جماعت تہجد کا مکروہ و بدعت ہونا احادیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں ثابت کیا ہے اور قدیم وجدید فقہا کی عبارات کو مع حوالہ اس میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں اسی سے صرف ایک فتوی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کا نقل کرتا ہوں، آپ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں:

(۱) حاشیة لامع الدراری: ۱/۹۵

(۲) بہار شریعت: ۳/۹۷

''افسوس ہزار افسوس کہ بعض وہ بدعتیں جو دوسرے سلسلوں میں قطعاً نہیں ہیں، ہمارے طریقۂ علیّہ (نقشبندیہ) میں پیدا ہوگئیں ہیں، نمازِ تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں، اطراف واکناف سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور بڑی جمعیتِ خاطر کے ساتھ نمازِ تہجد ادا کرتے ہیں، حالاں کہ یہ عمل مکروہ تحریمی ہے۔ بعض فقہا نے جن کے نزدیک کراہت کی شرط تداعی (ایک دوسرے کو بلانا) ہے اور نفل کی جماعت کو مسجد کے ایک کونے میں جائز قرار دیتے ہیں، وہ بھی تین آدمیوں سے زیادہ کی جماعت کو باتفاق مکروہ کہتے ہیں۔''(۱)

اس مکتوب میں امام ربانی رَحِمَہُ اللہُ نے تہجد کی جماعت کو بدعت اور مکروہ تحریمی صریح الفاظ میں لکھ کر اس رسم پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ جن فقہا نے اس کو بلا اعلان جائز کہا ہے، وہ بھی صرف تین آدمیوں تک کی جماعت کو جائز کہتے ہیں، اس سے زائد باتفاق مکروہ ہے۔

یہاں تک پہونچنے کے بعد امام احمد رَحِمَہُ اللہُ کے اتباع میں سے علامہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ کے کئی فتاوی نظر سے گذرے، تو ان میں سے بھی ایک فتوی نقل کرنا مناسب معلوم ہوا، ایک تو اس لیے کہ اس سے امام احمد رَحِمَہُ اللہُ کا مسلک معلوم ہو جائے گا، دوسرے اس وجہ سے کہ بہت لوگ کعبۃ اللہ میں جماعت تہجد ہونے کا ذکر کرتے ہیں (جس کی احقر کو تحقیق نہیں) اور علامہ ابن تیمیہ رَحِمَہُ اللہُ کو اہل عرب (سعودی والے) سب سے زیادہ مانتے ہیں اور ان کے فتاوی کی (۳۵) جلدیں خادم الحرمین شاہ فہد رَحِمَہُ اللہُ نے اپنے اہتمام سے طبع کرائی ہیں، تو

(۱) مکتوبات امام ربانی، مکتوب نمبر ۱۳۱ دفتر اول

اس کو پیش کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اگر اہل عرب بھی جماعت کا اہتمام کرتے ہیں تو یہ خود ان کے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کے فتوی کی وجہ سے غلط ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''با جماعت نفل نماز کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ اس کے لیے جماعت سنت ہے جیسے نماز کسوف، نماز استسقاء اور تراویح میں، پس یہ قسم وہ ہے جو ہمیشہ جماعت سے ادا کی جائے گی جیسا کہ سنت میں آیا ہے۔ دوسری قسم وہ نفل جس کے لیے جماعت مسنون نہیں، جیسے رات کی نماز (تہجد) اور سنت مؤکدہ نمازیں اور چاشت کی نماز، اور تحیۃ المسجد وغیرہ، پس ان کو اگر کبھی کبھی جماعت سے ادا کرلیا جائے تو جائز ہے؛ لیکن ان میں مستقل جماعت کرنا، غیر مشروع؛ بل کہ بدعت مکروہہ ہے، کیوں کہ نبی کریم ا اور صحابہ وتابعین ان نمازوں کے لیے اجتماع و جماعت کی عادت نہیں رکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی (اتفاقا) قلیل جماعت کے ساتھ نماز نفل پڑھی ہے۔''(۱)

بعض حضرات ان تمام فتاوی وفقہ کی عبارات کو پس پشت ڈال کر، جماعت تہجد پر دلیل کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کے عمل کو پیش کرتے ہیں کہ آپ رمضان میں تہجد جماعت سے ادا کرتے تھے؛ مگر غور کیجیے کہ خود حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے کبھی کسی کو اس کے لیے بلایا نہیں اور جب لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کے فعل کو لوگ حجت بنالیں گے تو فرمایا کہ میں ہی تو کرتا ہوں، کسی کو کہتا تو نہیں ہوں۔ (۲)

---

(۱) مجموعه فتاوی ابن تیمیه: ۲۳/۴۱۳، ۲۳/۴۱۴

(۲) انوار الباري: ۲/۹۱

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کسی کو اس کے لیے کہتے نہیں تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے متعلق حضرت مدنی رحمہ اللہ کا مسلک وہی تھا جو جمہور علما امت کا ہے۔ اگر آپ کو ان علما سے اختلاف ہوتا تو سوال کرنے پر یہ فرماتے کہ مجھے ان علما سے اختلاف ہے اور میرے نزدیک جماعت تہجد جائز ہے؛ لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا، لہٰذا ہم یا تو ان کو معذور کہیں گے یا ان کے فعل کی تاویل کریں گے کہ آپ نے خانقاہ میں رہنے والوں کی عادت کے لیے بطور اصلاح ایسا کیا ہوگا۔ مگر ان کو لے کر مستقل مسلک بنالینا اور عوام کو اس پر جمع کرنا سراسر غلط ہے۔ حضرات علمائے دیو بند بزرگوں کے تفرد کو کس نظر سے دیکھتے اور اس سے کیا برتاؤ کرتے ہیں، اس کو حضرت حکیم الامت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ سے سن لیجیے، فرماتے ہیں:

”ان (علمائے دیو بند) کے یہاں اصل اصول اتباع سنت ہے؛ لیکن معمولات مشائخ بھی جس حد تک غلبۂ حال یا سکر کے دائرہ کے نہ ہوں، راہ تربیت میں بے اعتنائی و بے توجہی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ البتہ وہ شریعت نہیں ہوتے کہ شرائع کی طرح ان کی تبلیغ و ترویج کو اسٹیج کا موضوع بنالیا جائے جس سے سنت نبوی جو اصل مقصد ہے غیر اہم ہو کر رہ جائے ان کے نزدیک طرق اولیاء کی تربیتی باتیں معالجات نفس ہیں، قانون عام نہیں کہ تبلیغی انداز سے ان کا عمومی پرچار کیا جائے۔“(۱)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کا عمل غلبۂ حال یا کسی معالجۂ نفس کے لیے تھا تو وہ اپنی جگہ صحیح ہے؛ مگر اس کو سنت و شریعت سمجھنا اور عوام میں اس کا مظاہرہ و پرچار کرنا راہ اعتدال سے برگشتگی کی علامت ہے۔

(۱) علماء دیو بند کا دینی رخ: ۱۳۶

مگر ہائے افسوس کہ آج ہمارے علاقہ میں یہ رسم و بدعت اچھے اچھے دین داروں میں بھی پھیل رہی ہے۔ان کو علما کے فتوے اور فقہا کی عبارتیں اور احادیث کے مضامین دکھائے جائیں تو ان پیش کرنے والوں کو شیطان کہنے اور ان کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرنے اور مارنے کی دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں اور بدعت مروجہ کے خلاف آواز اٹھانے کو فتنہ قرار دیتے ہیں۔ان حضرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان کا شیطان کہنا،اور بدعت کے خلاف اقدام کو فتنہ قرار دینا،کیا حضرات فقہاء وعلماء تک نہیں پہنچتا؟ ضرور پہنچتا ہے،کیونکہ پیش کرنے والا تو انھیں کے فتاوی اور عبارات پیش کرر ہا ہے۔اگر پیش کرنے والا مجرم ہے تو ان بدعت نوازوں کے پاس اس سے بڑے مجرم فقہاء وعلماء ہوئے۔اب یہ لوگ فیصلہ کریں کہ کس کے خلاف لب کشائی کرر ہے۔ان علما وفقہا میں علامہ شامی،علامہ ابن نجیم،مولانا اشرف علی تھانوی،مفتی اعزاز الرحمٰن دیو بندی،مولانا عبد الشکور لکھنوی،مولانا مفتی محمد شفیع صاحب،مولانا ظفر احمد عثمانی،حضرت جی مولانا یوسف صاحب کاندھلوی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر ائمہ،فقہا وعلما ہیں۔ان سب حضرات اور دوسرے حضرات کے فتاوی ہمارے رسالے ”جماعت تہجد کا شرعی حکم“ میں ملاحظہ فرمالیں۔

شبینہ نماز کا حکم

بعض مساجد اور بعض گھروں میں شبینہ نماز کو بڑی اہمیت وحیثیت حاصل ہے اور اس کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ فی نفسہ ایک دو یا چند راتوں میں قرآن شریف کو نماز میں ختم کرنا جائز ہے؛ مگر مروجہ شبینہ میں کچھ چیزیں ایسی شامل ہوگئی ہیں جن کی بنا پر مروجہ شبینہ کو حضراتِ علما نے مکروہ قرار دیا ہے۔

(۱) منجملہ ان چیزوں کے ایک یہ ہے کہ ختم کرنے کی فکر میں قاری صاحبان قرآن مجید کو عجلت کے ساتھ پڑھتے ہیں جس سے قرآن مجید کی تلاوت صحیح نہیں ہوتی؛ بل کہ حروف کٹ جانے اور بے قاعدہ ادا کرنے کے سبب نہایت غلط ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کو ایسی عجلت سے پڑھنا کہ حروف کی تصحیح وتجوید کا خیال نہ رہے، نہایت غلط اور بے ہودہ بات ہے۔

(۲) حفاظ وقراء کا اس سلسلے میں فخر ونمود کا قصد بھی اس عمل کو کراہت کے درجہ میں لے آتا ہے۔

(۳) لمبی قرأت کی وجہ سے لوگ اس کو ایک بوجھ سمجھ کر، بے دلی وتنگدلی سے سنتے ہیں اور بعض جگہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ شبینہ نماز میں شروع سے شرکت نہیں کرتے، بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے یا آرام کرتے بیٹھے رہتے ہیں اور جب امام رکوع میں جاتا ہے تو فوراً دوڑ کر شامل ہوجاتے ہیں۔ یہ قرآن مجید اور نماز دونوں سے لاپرواہی وغفلت بلکہ ایک طرح اعراض ہے۔

یہ سب عام مفاسد ہیں جو شبینہ نماز کے موقع پر مشاہدے میں آتے ہیں۔ پھر یہ نماز اکثر جگہ نوافل میں ہوتی ہے اور اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ نوافل میں جماعت مکروہ ہے، ان تمام عوارض کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس نماز کو کراہت سے خالی کسی طرح نہیں کیا جاسکتا۔ چناں چہ علما نے انہی عوارض کی وجہ سے شبینہ متعارفہ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جو ختم شبینہ ہمارے زمانے میں مروج ہے، سامعین پر گراں اور بار ہوتا ہے، بعض سامعین صاحب خانہ کی طلب پر آتے ہیں، بعض

دوستوں سے ملنے آتے ہیں اور کوئی ایسا نہیں جو خوش دلی سے قرآن مجید ایک رات میں سننے والا ہو، الا ماشاء اللہ اور یہ بات کراہت کا سبب ہے۔ فقہا نے جگہ جگہ اس کی صراحت فرمائی ہے، علاوہ ازیں حفاظ اس قدر جلدی سے پڑھتے ہیں کہ حرکات وحروف میں خلل واقع ہوتا ہے"۔

حاصل یہ کہ ختم شبینہ فی نفسہ امر مستحسن ہے؛ لیکن چوں کہ ہمارے زمانے میں مقتدیوں کی کراہت اور قرأت میں قاریوں کی عجلت کا سبب ہے، اس لیے کراہت سے خالی نہیں۔ (۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"بعض حفاظ لیالی قدر میں یا کسی اور شب میں سب جمع ہو کر ایک یا کئی شخص مل کر قرآن ختم کرتے ہیں اور عرف میں اس کو شبینہ کہتے ہیں۔ اول تو بعض علما نے ایک شب میں قرآن مجید ختم کرنے کو مکروہ کہا ہے، مگر چونکہ سلف صالحین سے ایک روز میں ختم کرنا منقول ہے، اس لیے اس میں گنجائش ہے۔ مگر اس میں اور بہت سے مفاسد شامل ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے عمل شبینہ کا بطریق مروج ہونا بلا شک مکروہ ہے۔"

اس کے بعد حضرت نے بالتفصیل اس کے مفاسد گنائے ہیں جن کا خلاصہ یہاں درج ہے۔

(۱) تجوید وترتیل کا خیال نہ ہونا (۲) پڑھنے والوں میں ریا وتفاخر ہونا (۳) بعض جگہ نفل میں شبینہ کا ہونا جو کہ مکروہ ہے (۴) اکثر سامعین کا اس کو گراں وبار محسوس کرنا اور آداب سماعت میں لاپرواہی کرنا؛ بل کہ اعراض کی سی شکل بنانا وغیرہ۔ (۲)

---

(۱) مجموعۃ الفتاوی ج:۱/۱۷

(۲) اصلاح الرسوم: ۱۶۶۔۱۶۸

حضراتِ علما کی ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ فی نفسہ شبینہ کے مستحسن ہونے کے باوجود اس میں شامل مفاسد اس کو مکروہ ٹھہراتے ہیں؛ لہٰذا یا تو ان مفاسد کو دور کرنا چاہئے یا اس عمل ہی کو ترک کر دینا چاہئے۔ اور اس کے مفاسد کا دور کرنا یہ ہے کہ شبینہ نماز نفل میں نہ ہو؛ بل کہ تراویح میں ہو اور حفاظ کرام قرآن کو ترتیل سے پڑھیں، ریا و فخر مقصود نہ ہو اور نہ ہی مال مقصود ہو۔ نیز سامعین کرام توجہ سے قرآن سنیں اور بے دلی و تنگدلی کا مظاہرہ نہ کریں۔

رمضان کی بعض راتوں میں بے وجہ روشنی

رمضان مبارک کی بعض راتوں مثلاً پندرہویں رات، ستائیسویں رات وغیرہ میں بعض مساجد میں بے وجہ زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مسجد کے اندر اور باہر اور میناروں پر زائد از ضرورت لائٹوں کا انتظام کیا جاتا ہے، اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ غیر قوموں کی رسم ہے کہ وہ اپنی عیدوں اور تقریبوں میں بے وجہ روشنی کا انتظام کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شریعت اسلامیہ ہر اس رسم کی بیخ کنی کرتی ہے جس میں کفار و مشرکین، یہود و نصاری سے مشابہت لازم آتی ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ. »

(جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔)(۱)

اسی طرح مختلف حدیثوں میں یہود و نصاری اور کفار کی مختلف چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ الغرض زائد از ضرورت روشنی کرنا کفار کا طریقہ ہے، لہٰذا اسلامی عید و تقریب کے موقع پر اس کو اپنانا سراسر

(۱) ابو داود: ۵۵۹/۲

ناجائز ہے۔

(۲) دوسری خرابی یہ ہے کہ اس رسم کو لوگ ایک نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں اور جو کام شریعت میں نہ ہو اس کو دین وشریعت میں سے قرار دینا اور اس کو طاعت و عبادت خیال کرنا بدعت واحداث فی الدین ہے۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذامَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ. »

(جو کوئی ہمارے دین میں نیا کام نکالے جو اس میں نہ ہو تو وہ رد ہے۔)(۱)

(۳) تیسری برائی یہ ہے کہ اس میں اسراف اور فضول خرچی ہے، اور اسلام اسراف وفضول خرچی کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيراً اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ﴾

(اور اسراف نہ کرو؛ کیونکہ اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ (الأعراف :۳۱)

(اور اسراف نہ کرو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

ان تین وجہوں میں سے ایک بھی اگر کسی جگہ پائی جائے تو اس کے ناجائز ہونے کے لیے کافی ہے، چہ جائیکہ ان میں سے ایک نہیں؛ بلکہ کسی جگہ سب کی سب جمع ہوں، جیسے زیر بحث صورت میں تو کیا یہ ممنوع وناجائز نہ قرار دیا جائیگا؟

اس کے باوجود بعض لوگوں نے اس عمل کو جائز بلکہ مستحسن قرار دینے کے لیے عجیب اور بے ہودہ تاویلات سے کام لیا ہے، مثلا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح روشنی کرنے سے اسلام کی شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال لغو وفضول

(۱) بخاري: ۳۷۱/۱

ہے؛ کیونکہ اسلام کی شان وشوکت اسلامی احکام کی خلاف ورزی اور سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی میں نہیں ہے؛ بل کہ اس کی پیروی اور تابعداری میں ہے، اسی طرح اسلام کی شوکت مادی وفانی چیزوں سے نہیں ؛ بل کہ روحانی چیزوں سے ہے اور وہ سوائے اطاعت وعبادت کے کچھ اور نہیں، حضرات صحابہ کے دور میں مساجد کی ظاہری زیب وزینت موجودہ دور کی مساجد کے لحاظ سے ایک فیصد بھی شاید نہ تھی؛ مگر اس کے باوجود ان کا وہ رعب وجلال اور وہ شان وشوکت تھی کہ قیصر وکسری کے عظیم محلات پوری آن بان اور ظاہری زیب وزینت کے باوجود اس سے محروم تھے، لہٰذا ایک مسلمان کی خواہش وجستجو خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت اور پیروی کے لیے ہونا چاہئے، نہ کہ مادی آرائش وزیبائش کے لیے۔ یہی ایک سچے مسلمان کا طغرائے امتیاز ہے۔

ختم قرآن پر مٹھائی کی رسم

ایک بہت پرانی رسم ختم قرآن پر شیرینی تقسیم کرنے کی ہے، جس کا آج بھی بہت سی مسجدوں میں رواج واہتمام ہے۔

جہاں تک اس رسم کی ابتداء کا تعلق ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض نیک دل لوگوں نے قرآن مجید کے ختم پر فرحت ومسرت کے اظہار کے لیے اس کو جاری کیا ہوگا اور اس حد تک یہ بات بلا شبہ جائز ہے؛ بل کہ باعث ثواب بھی، مگر موجودہ دور میں اس میں چند عملی واعتقادی خرابیاں شامل ہو جانے کی بنا پر اس رسم کو علما نے قابل ترک قرار دیا ہے۔

مثلا لوگوں کا اس کو ضروری سمجھ لینا حتی کہ کبھی مٹھائی تقسیم نہ ہو تو لعن طعن اور ملامت کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس رسم کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہ

بات ایک معمولی پڑھا لکھا بھی جان سکتا ہے کہ جس کام کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا، اس کو ضروری سمجھنا عقیدے کی خرابی ہے۔

عام لوگوں کے اس کو ضروری سمجھنے کی بنا پر مساجد کے ذمہ دار گنجائش ہو یا نہ ہو، اس کو پورا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعض جگہ تو یہ غضب ہوتا ہے کہ مسجد کے مال سے یہ رسم ادا ہوتی ہے جو کہ سراسر ناجائز ہے؛ کیوں کہ مسجد کا مال صرف مسجد کے مصارف واخراجات پر لگ سکتا ہے، کسی اور کام میں اس کو لگانا ناجائز ہے۔ نیز بعض جگہ اس رسم کے لیے الگ چندہ کیا جاتا ہے، جس میں بہت سے لوگ شرم کے مارے چندہ دے دیتے ہیں، دلی رضامندی وخوشی سے نہیں دیتے۔ نیز بعض لوگوں سے جبراً وصول کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شرم سے دیا جانے والا اور جبر سے وصول ہونے والا مال جائز نہیں ہوتا، پھر اس سے جو مٹھائی لائی گئی وہ کیسے جائز ہوگی؟ پھر تقسیم کے موقع پر مساجد میں جو شور وغل اور ہنگامہ آرائی ہوتی ہے، وہ مزید برائی ہے۔ ان سب وجوہات کی بنا پر ظاہر ہے کہ یہ تقسیم شیرینی کی رسم ناجائز قرار پاتی ہے۔ اس لیے اس سے بھی احتراز لازم وضروری ہے۔

لیلۃ القدر میں مساجد میں اجتماع

لیلۃ القدر جس کو ایک ہزار مہینوں سے زیادہ افضل وخیر کی رات قرار دیا گیا ہے، اس میں عبادت کرنا اور زیادہ سے زیادہ ثواب کے حاصل کرنے کی تدبیر کرنا بہت اہمیت کا کام ہے اور اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری طور پر ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ عبادت کو اسی طور طریقہ پر انجام دیا جائے جیسے شریعت نے بتایا ہے؛ کیوں کہ شریعت اس سلسلے میں بڑی حساس ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کوئی کام خصوصاً عبادت کا کام انجام دیا جائے۔ اگر عبادت کی

مقدار متعین ہے تو اس مقدار سے گھٹانا یا بڑھانا اور اسی طرح عبادت کی کیفیت میں تغییر وتبدیل شریعت میں نا قابل برداشت جرم ہے۔ مثلاً ظہر کی مقررہ چار فرض رکعتوں میں سے ایک دو کا کم کر دینا یا اس میں اضافہ کر دینا، سراسر نا جائز اور تحریف دین کے مترادف ہے، اسی طرح عبادت کی کیفیت مثلاً تنہا پڑھی جانے والی نماز کو با جماعت پڑھنا یا اس کے برعکس فرض کو بلا وجہ تنہا پڑھنا شریعت کی نگاہ میں بہت بری بات ہے۔

مگر افسوس کہ بہت سے مسلمان اس بات سے یا تو ناواقف ہیں یا اس سے لا پرواہ ہیں اور اسی وجہ سے لیلۃ القدر کی عبادت میں طریق سنت سے ہٹ کر خلاف شریعت وسنت طریقہ پر عبادت انجام دیتے ہیں، وہ یہ کہ لیلۃ القدر میں مساجد میں جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں، جس کو علما نے مکروہ قرار دیا ہے، چناں چہ حنفی مسلک کے زبردست محقق ابوحنیفہ رحمہ اللہ ثانی علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ”مستحبات میں سے یہ بھی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں، عیدیں کی راتوں اور ذی الحجہ کی دس راتوں، شعبان کی پندرھویں رات شب بیداری کرے۔ مراد شب بیداری سے اس میں عبادت کرنا ہے اور ان راتوں میں سے کسی رات کو جاگنے کے لئے مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے۔“(۱)

علامہ حسن بن عمارۃ الشرنبلالی رحمہ اللہ گیارھویں صدی ہجری کے مشہور ومعروف حنفی فقیہ ہیں، وہ اپنی کتاب ”نور الایضاح“ اور اس کی شرح ”مراقی الفلاح“ میں فرماتے ہیں:

> ”مستحب ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی راتوں کو شب

(۱) البحر الرائق: ۵۲/۲

بیداری کرے، لیکن ان راتوں میں سے کسی رات میں شب بیداری کے لئے مساجد میں جمع ہونا مکروہ؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے ایسا نہیں کیا؛ لہٰذا اکثر علما نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔"(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"شب برأت اور شب قدر وغیرہ میں مساجد کے اندر اجتماع کا اہتمام اور التزام یا خود ایک مستقل بدعت ہے، جس کی نظیر قرون مشہود لھا بالخیر میں موجود نہیں، کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اجتماع کوئی محمود چیز ہے، بلکہ مسنون اور مستحب صرف وہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ علاحدہ علاحدہ اس مبارک رات میں بیدار رہ کر اپنی اپنی نوافل اور تلاوت میں مشغول رہیں۔"(۲)

علما کی ان تصریحات سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر وغیرہ میں مساجد میں اجتماع کا اہتمام مکروہ و بدعت ہے؛ اس لیے کہ دورِ رسالت و صحابہ و تابعین میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہاں البتہ بلا اہتمام کچھ آدمی مساجد میں عبادت کرنے آگئے تو الگ بات ہے۔

لہٰذا طریق سنت کے مطابق ان راتوں میں مساجد کے بجائے اپنے گھروں کو عبادات سے رونق بخشیں؛ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« صَلُّوْا فِي بُيُوْتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا. »

---

(۱) نور الایضاح ص: ۹۵ ومراقی الفلاح علی ھامش الطحطاوی :۲۱۹

(۲) امداد المفتیین: ۲۰۹

(اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور ان کو قبرستان نہ بناؤ۔)(۱)

لہٰذا گھروں کو عبادات کے نور سے منور و بارونق بنانا اور برکات و رحمتوں کا اس کو مہبط بنانا چاہیے، ایک طرف تو دیندار لوگوں کا یہ حال کہ وہ لیلۃ القدر میں عبادت کے شوق میں خلاف سنت طریقہ کو اختیار کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگوں کا یہ وطیرہ کہ وہ لیلۃ القدر کی مبارک ساعتوں کو بازاروں کی سیر و تفریح کے لیے خاص کرتے ہیں اور مرد بھی، عورتیں بھی، بچے بھی، بجائے عبادت کے سیر و تفریح، خرید و فروخت کے لیے جاتے ہیں۔

بعض علاقوں میں اس منکر کا رواج ہو چلا ہے اور خاص طور پر بنگلور میں اس لعنتی منکر کو فروغ ہو گیا ہے۔

اس میں سب سے پہلے تو لیلۃ القدر کی بے قدری ہے اور اس بے قدری سے بڑھ کر بھلا اور کیا محرومی ہو سکتی ہے؟ دوسرے مردوں اور عورتوں کا اختلاط و اجتماع اور میلہ کی سی شکل، جس میں ٹڈ بھیڑ بھی ہوتی ہے، کس قدر لعنت کا کام ہے۔ کیا لیلۃ القدر اسی لعنت کے وصول کرنے کے لیے آتی ہے؟

افسوس کہ بعض دین کے نام پر خرافات کو جنم دینے اور پھیلانے والے اس منکر کی حمایت و تائید؛ بلکہ تحسین کرتے ہیں اور اس پر نکیر کرنے والوں کو پریشان کرتے اور گالیاں دیتے ہیں۔

اللہ جزائے خیر دے انجمن خدام المسلمین (بنگلور کے کچھ ہمدرد و نیک دل لوگوں کی ایک انجمن جو رفاہی کاموں میں سرگرم عمل رہتی ہے) کے کارکنوں کو جنہوں نے بنگلور میں اس منکر کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کا بیڑا اٹھایا اور اللہ کا کرم ہے کہ دو سالوں سے انجمن کی تحریک اور سعی کوشش سے یہ منکر قریب بختم ہو گیا ہے۔

(۱) جامع الصغیر مع فیض القدیر للمناوی : ۱۹۹/۴

ستائیسویں میں ختم قرآن کا اہتمام

ہمارے علاقوں میں اکثر مساجد میں ستائیسویں رمضان کو تراویح میں ختم قرآن کا اہتمام کچھ مبالغہ آمیز ہوگیا ہے کہ بعض؛ بلکہ اکثر لوگ ستائیسویں رمضان کو ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور حافظ کو ہر صورت پر اسی تاریخ میں قرآن ختم کرنا ضروری ہوتا ہے، خواہ وہ بیمار ہو یا کسی عذر سے کچھ پارے رہ گئے ہوں۔ بہر حال اس کے لئے یہ تاریخ مقرر ہے، حالاں کہ شرعاً یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض فقہا نے ستائیسویں تاریخ کو قرآن مجید ختم کرنا افضل و پسندیدہ بتایا ہے، مثلاً ”بحر الرائق“ اور ”رد المحتار“ میں لکھا ہے کہ ستائیسویں رمضان کو ختم کرنا مستحب ہے۔(۱)

مگر یہ بعض حضرات کا قول ہے، ورنہ صحیح قول یہ ہے کہ آخری شب میں ختم کرے۔ چناں چہ ”بحر الرائق“ ہی میں مذکورہ قول کے بعد لکھا ہے:

> ”مختارات النوازل کتاب میں ہے کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھے۔ اور یہی صحیح بات ہے؛ کیوں کہ تراویح میں ختم کرنا سنت ہے؛ کیونکہ پورے مہینے کی رکعات کا عدد چھ سو ہے اور قرآن کی آیات چھ ہزار ہیں۔“

علامہ شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

امام حسن بن زیاد رحمۃ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہر رکعت میں دس یا کچھ کم و بیش آیات پڑھے اور یہی صحیح بات ہے؛ کیوں کہ سنت یہ ہے کہ تراویح میں ایک دفعہ ختم کیا جائے اور یہ بات اسی سے حاصل

(۱) رد المحتار مع الدر المحتار: ۲/۴٦

ہوتی ہے اور اس میں سہولت بھی ہے کہ تراویح کی رکعات کا عدد پورے ماہ میں چھ سو ہے اور آیات قرآنی چھ ہزار کچھ اوپر ہیں۔(۱)

ان دو فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوا کہ صحیح بات یہ ہے کہ آخری شب میں ختم کیا جائے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ کا مسلک ہے اور دیگر ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے چناں چہ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری رَحِمَہُ اللہُ اپنی کتاب ''**الفقه علی مذاهب الاربعة**'' میں فرماتے ہیں:

> ''نماز تراویح میں پورے قرآن شریف کا پڑھنا سنت ہے، بایں طور کہ اس کو ماہ رمضان کی آخری شب میں ختم کیا جائے۔''(۲)

علامہ جزیری رَحِمَہُ اللہُ نے اس جگہ کسی امام کا اختلاف نہیں بتایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر تمام ائمہ متفق ہیں۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہوا کہ آخری شب میں قرآن کا ختم کرنا مستحب ہے اور یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے، اس کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری امر کو ضروری سمجھنا بلاشبہ غلط بات ہے، پھر اگر ستائیس تاریخ میں ختم کرنا مستحب بھی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ایسی پابندی اور اہتمام کہ اس کے خلاف کبھی نہ ہونے دیا جائے اور کسی عذر و مجبوری پر بھی اس کے خلاف کرنے کو برا خیال کیا جائے، یہ سراسر احداث فی الدین ہے۔

میرے علم میں ایسے بعض واقعات ہیں کہ ایک حافظ بیمار ہو گئے اور ستائیسویں تک ختم کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا تو ان صاحب کو ہٹا دیا گیا اور ایک دوسرا حافظ بلایا گیا تا کہ وہ ستائیسویں میں ختم کر دے۔اس طرح کے جزوی واقعات سے پتہ

---

(۱) شامي: ۴۶/۲

(۲) الفقه علی المذاهب الاربعه: ۵۴۵/۱

چلتا ہے لوگ اس تاریخ کو ختم کرنا کس قدر ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ تو اس سلسلہ میں اعتقادی خرابی ہے۔

ایک خرابی عملی بھی ہے، وہ یہ کہ جب ستائیس تاریخ کو قرآن مجید ختم ہو جاتا ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب قصہ ختم ہو گیا، اب تراویح تو الگ رہی بقیہ رمضان میں پنج وقتہ نمازیں بھی ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس لیے لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا چاہیے کہ رمضان صرف ستائیس تک ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس کے لیے ایک صورت یہ ہے کہ ستائیسویں کو ختم کرنے کے بجائے آخری شب میں ختم کیا جائے، اور غالباً مراد آخری شب سے انتیسویں (۲۹) شب ہے؛ کیونکہ تیسویں شب کا ملنا لازمی نہیں، کبھی انتیسویں تاریخ کو چاند نظر آ گیا تو تیسویں شب میسر نہیں آتی، لہذا انتیسویں شب میں ختم کرے۔

اجتماعی ذکر کی مجالس

رمضان مبارک کی آخری راتوں میں بعض لوگ مساجد میں یا کسی اور جگہ اجتماعی طریقہ پر ذکر کی مجلسیں قائم کرتے ہیں، اس میں ایک صاحب صوفیائے کرام کے طریقہ پر ضرب کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں، پھر پوری مجلس مل کر اسی طرح ذکر کرتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا ذکر عظیم الشان چیز ہے ''ولذکر اللہ اکبر'' اور اس کے فضائل بے شمار اور اس کے ثمرات بہت بڑے ہیں۔ مگر اس میں بھی شبہ نہ ہونا چاہیے کہ طریقۂ نبوی سے ہٹ کر عبادت انجام دینا بے سود ہے اور یہ ذکر کی مجالس طریقۂ نبوی سے ہٹ کر ہیں؛ کیونکہ (۱) اجتماعی طریقہ پر ذکر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے ثابت نہیں، حالاں کہ وہ حضرات نیکیوں کی تحصیل میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اگر اس طرح اجتماعی ذکر

ثواب اور نیکی کا کام ہوتا تو وہ حضرات ضرور یہ کام کرتے اور ہم تک یہ بات پہنچتی، حالاں کہ اس طرح کی کوئی بات احادیث سے ثابت نہیں؛ بل کہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ ایسا کرنا سنت کے خلاف ہے۔ (یہ حدیث آگے آ رہی ہے۔)

(۲) مساجد میں آواز کو بلند کر کے ذکر کرنا، علما و فقہا نے ناجائز قرار دیا ہے چناں چہ ملا علی قاری رحمہ اللہ ''مرقات شرح مشکوۃ'' میں فرماتے ہیں:

> ''ہمارے بعض علما نے بہ صراحت بیان کیا ہے کہ مسجد میں آواز کا بلند کرنا اگر چہ ذکر ہی میں ہو، حرام ہے۔''(۱)

علامہ حلبی حنفی رحمہ اللہ ''غنیة المستملی'' میں ایک بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

> ''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالی کے اس ارشاد کے خلاف ہے ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ﴾ کہ اللہ کو عاجزی و آہستگی سے پکارو۔''(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور علمائے احناف ذکر میں جہر کو بدعت و ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ لوگ آج اس بدعت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔

اجتماعی ذکر کے اس طریقہ پر خلاف شرع ہونے کا حکم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اب سے بہت پہلے لگا دیا ہے۔ چناں چہ امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی ''سنن'' میں درج کیا ہے:

---

(۱) مرقات: ۲/۴۷۰

(۲) غنیة المستملی: ٥٦٦

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک جماعت پر گذر ہوا جو مسجد میں ذکر کر رہے تھے، ایک شخص کہتا کہ سو (۱۰۰) دفعہ اللہ اکبر پڑھو، تو حلقہ نشین لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ اللہ اکبر کہتے۔ پھر وہ کہتا سو (۱۰۰) دفعہ لا الٰہ الا اللہ پڑھو، تو وہ ایسا ہی کرتے۔ اسی طرح تسبیح کے لیے کہتا، وہ تسبیح پڑھتے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم ان کنکریوں پر کیا پڑھتے ہو؟ بتایا گیا کہ ذکر کرتے ہیں، اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو، تعجب ہے تم پر کہ ابھی تم میں صحابہ موجود ہیں اور ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے برتن نہیں ٹوٹے، تم اتنی جلدی ہلاکت میں پڑ گئے، پھر فرمایا: تم اندر میں حالات بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولنے والے ہو۔''(۱)

اس روایت کو علما نے صحیح قرار دیا ہے۔ غور فرمایئے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو جو مسجد میں اجتماعی ذکر کر رہے تھے، بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولنے والے قرار دے رہے ہیں اور اس طریقہ کو خلاف شرع بتا رہے ہیں۔

اس سے ان حضرات کو عبرت و سبق حاصل کرنا چاہئے جو اس طرح کی مجالس کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کو ثواب خیال کرتے ہیں، جب کہ یہ طریقہ سنت و شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت میں داخل ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینے کی ہے، وہ یہ کہ ان مجالس میں ذکر کرانے والے صاحب حضرات صوفیائے کرام کے طریقہ پر ضرب و شغل بھی کرتے اور لوگوں کو

---

(۱) دارمی: ۲۹۱

کراتے ہیں، اس سلسلے میں معلوم ہونا چاہئے کہ صوفیائے کرام نے ذکر کا وہ طریقہ جو ضرب و شغل پر مشتمل ہے، ایک علاج و دوا کے طور پر تلقین کیا ہے اور بذات خود یہ طریقۂ ذکر جس میں ضرب وغیرہ ہوتا ہے، مقصود اور ثواب کی چیز نہیں ہے۔ ثواب کی چیز ذکر ہے، چناں چہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ جو اپنے زمانے کے سرتاج صوفیاء بھی تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''طریق خاص ضرب نہ مقصود ہے، نہ موقوف علیہ مقصود، جس طرح بے تکلف بن جائے کافی ہے۔''(۱)

اس میں بتایا ہے کہ ضرب (جھٹکا وغیرہ) مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ اپنی کتاب ''شریعت وتصوف'' میں رقمطراز ہیں:

> ''یہ سب طریق مقصود بالذات نہیں؛ بل کہ صرف وسیلۂ یکسوئی ہیں، جو ایک درجہ میں شرعاً مطلوب ہے...... آگے چل کر فرماتے ہیں ...... بس یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کیفیات اگر مقدمۂ عبادت نہ بنائی جائیں تو پھر ان کا کچھ اجر (ثواب) نہیں اور مقاصد میں سے تو کسی حال میں ہی نہیں۔''(۲)

ان دونوں بزرگوں اور فن تصوف کے جلیل القدر اماموں کے بیانات سے معلوم ہوا کہ یہ ضرب وغیرہ کیفیات وطُرق مقصود نہیں ہیں۔ ہاں البتہ یکسوئی کے حصول کے لیے معین ومددگار ہونے کی وجہ سے جب کہ ان کو عبادت کا مقدمہ بنا دیا جائے، یہ

---

(۱) انفاس عیسیٰ: ٦٣

(۲) شریعت وتصوف: ۲/۲۲-۲۳

ایک درجہ میں مطلوب ہوجاتے ہیں ۔مگر ان کو ثواب وعبادت سمجھنا تو کسی حال میں روانہیں ہے، چناں چہ سر تاج صوفیا حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ ''قصد السبیل'' میں بہ صراحت فرماتے ہیں:

''ان (تسبیحات) کو تھوڑی آواز اور ہلکی ضرب سے کریں؛ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زور سے ذکر کرنا اور ضرب لگانا خود کوئی ثواب کی بات نہیں ہے۔ایسا اعتقاد کرنا گناہ ہے۔''(۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو حضرات عوام الناس کو لے کر صوفیا کے طریق پر ذکر کرتے ہیں اور ضرب و شغل کراتے ہیں، یہ کوئی مستقل و مستمر عمل نہیں کہ اس طریقہ کا نفع و فائدہ ظاہر ہو؛ بل کہ محض رمضان کی طاق راتوں اور وہ بھی عشرۂ اخیرہ کی راتوں تک محدود ہے،تو بھلا دو چار راتوں میں اس کا کیا اثر ظاہر ہوگا؟ پھر اس کے باوجود اس طریق پر ذکر کرانے کو محض لغو یا اعتقاد کی خرابی نہ کہیں تو اور کیا کہا جائے؟ جو مستقل طور پر اس طریق کو اختیار کر کے اس کو یکسوئی کا ذریعہ بنائے ،اس کے لیے تو یہ درست ہے جیسا کہ اپنے حضرت کا ارشاد نقل کر چکا ہوں۔مگر جو ایسا نہ ہو تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو کہا جائے گا کہ لغو و فضول یہ ضرب و شغل اختیار کیا جارہا ہے۔یا یہ کہا جائے گا کہ لوگ اس کو ثواب سمجھتے ہیں ، حالاں کہ یہ ثواب کا کام نہیں ،ثواب تو ذکر میں ہے،نہ کہ اس طریق میں۔

حاصل یہ کہ ذکر کی مجالسِ مروجہ شرعاً بدعت کے زمرہ میں داخل ہیں ؛ لہٰذا ان کو ترک کرنا چاہئے اور انفرادی طور پر ذکر کی تلقین کرنا چاہیے۔

(۱) تسهيل قصد السبيل : ۱۷

نابالغ بچوں کو روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم

شریعت مطہرہ سراپا اعتدال ہے اور افراط وتفریط سے بالکل پاک، چنانچہ اس نے نابالغ بچوں کے سلسلہ میں ہدایت کی ہے کہ اگر چہ وہ غیر مکلّف ہیں، مگر عادت ڈالنے کے لیے انہیں بچپن ہی سے عبادات کی طرف راغب کیا جائے۔ مگر بچپن سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں حدیث رسول سے پتہ چلتا ہے کہ سات برس سے بچہ کو عبادات میں لگا دینا چاہیے اور دس برس سے سختی کے ساتھ لگانا چاہیے، چنانچہ نماز کے سلسلے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے:

''اپنی اولاد کو نماز کا حکم کرو جب کہ وہ سات سال کے ہوجائیں اور اس پر اس کو مارو جب کہ وہ دس سال کے ہوجائیں۔''(۱)

علما نے لکھا ہے کہ نماز کے مسئلہ ہی کی طرح روزہ اور دیگر احکام کا حکم ہے کہ سات سال میں بچوں کو اس میں لگا دینا چاہیے اور دس سال ہو جائیں تو مار کر لگانا چاہیے۔(۲)

مگر اتنے چھوٹے بچوں کو جو ان چیزوں کی کوئی تمیز نہیں رکھتے اور انہیں ان کی سہار نہیں ہے، ان مربیوں کو کسی درجہ میں بھی شریعت نے مکلّف و مامور نہیں کیا ہے، اور اگر کوئی بچہ خود خوشی سے انجام دے لے، تو الگ بات ہے؛ مگر بڑوں کی طرف سے اس کو اس پر مجبور کرنا سراسر خلاف شریعت ہے۔ مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ بعض لوگ نہایت کم سن اور معصوم بچوں کو روزہ رکھوانے کی رسم کرتے ہیں اور اس میں روزہ رکھوانے سے زیادہ روزہ کشائی کی رسم مقصود ہوتی ہے اور اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

---

(۱) جمع الفوائد: ۱/۴۵

(۲) شامی: ۲/۳۵۲

(۱) ایک یہ کہ اس سے خواہ مخواہ ایک غیر مکلّف پر جبر ہوتا ہے، جس سے بسا اوقات نقصان کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ ایک جگہ اسی رسم کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھ کو ایک جگہ کا قصہ معلوم ہے کہ اسی طرح کے ایک بچہ کو روزہ رکھوایا اور اپنی امارت اچھالنے کے لیے روزہ کشائی کا بہت زیادہ اہتمام کیا، گرمی کے بڑے اور کڑے دن تھے، عصر کے وقت تک اس نے جوں توں کر کے اس نے کھینچا، آخر طاقت طاق ہوگئی اور صبر و تواں نے جواب دے دیا، ٹھنڈے پانی کے مٹکے بھرے رکھے تھے، ان پر تر کپڑا پڑا تھا، برف گھولنے کا سامان ہو رہا تھا، اس سارے سامان نے آگ بھڑکا دی، ایک ایک سے پانی کے لیے خوشامد کرتا تھا؛ لیکن اگر پانی دے دیتے تو روزہ کشائی کا سامان اکارت جاتا ہے، اپنا سامان بچانے کے لیے پانی کو جواب دے دیا، آخر سخت بیتاب ہوکر، دوڑ کر ایک مٹکے کو جا لپٹا اور محبوب سے وصل ہوتے ہی روح نے قالب کو چھوڑ دیا، اس کی نعش زبان حال سے سراپاں تھی کہ: ''لو بھئی! تم کو تمہارا سامان مبارک رہے، ہم اپنی جان تمہارے سامان پر فدا کرتے ہیں۔''(۱)

غور کیجیے کہ یہ حسرتناک انجام سوائے اس کے کہ شریعت سے اعراض کر کے محض رسم کی پابندی کی گئی اور کس وجہ سے ہے؟

(۲) روزہ کشائی کی رسم انجام دینا اور اس کے لیے بڑا لمبا چوڑا اہتمام اور اس کے خاطر لوگوں کو جمع کرنا، سراسر خلاف شریعت ہے؛ کیوں کہ اس طرح کی رسم شریعت

---

(۱) اصلاح انقلاب: ۱/۱۳۲

میں ثابت نہیں، حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک ختنہ کی دعوت میں بلایا گیا تو آپ نے انکار کردیا اور اس کی وجہ یہ بتائی:

''ہم لوگ زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ختنوں میں نہیں جاتے تھے اور نہ ہی ہم کو اس کے لیے دعوت دی جاتی تھی۔''(۱)

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ختنہ کی دعوت یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ ہمیں اس طرح کی دعوت نہیں دی جاتی تھی۔ غور کرنا ہے کہ روزہ کشائی کی دعوت بھی جب وہاں نہیں تھی، تو اس کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔

(۳) پھر اس میں جو اسراف اور فضولیات ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ مستقل ایک گناہ ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

(۴) اس موقع پر بعض؛ بل کہ بہت سے لوگ اس روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم کا اخبارات میں اعلان بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی بچے کی تصویر بھی شائع کرتے ہیں۔ اسلام میں تصویر لینا، رکھنا، دوسروں کو بتانا، سب حرام و ناجائز ہے ۔پھر اشتہار سے اس کی تشہیر خود ریاکاری پر مشتمل ہونے کی بنا پر ناجائز فعل ہے۔

اب غور فرمالیا جائے کہ اس رسم میں کس قدر ناجائز امور شامل ہیں، اس کے باوجود کیا یہ رسم جائز ہوسکتی ہے؟

ایک طرف تو بعض لوگوں کا یہ حال کہ غیر مکلّف بچوں کو بھی محض رسم کو پورا کرنے کے لیے اس پر مجبور کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگ روزہ کشائی کی غیر شرعی رسم کو ادا کرنے کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو روزہ ہی نہیں رکھواتے اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اس رسم کو ادا کرنے کے لیے اتنے ہزار روپیے جمع وفراہم ہو جائیں تو

(۱) مسند احمد بحوالہ اصلاح الرسوم: ۵۳، راہ سنت: ۱۴۲

رکھوائیں گے، اس طرح بعض بچے جوان بھی ہوگئے اور روزہ رکھنے کی نوبت نہیں آئی، غور کیجیے کہ محض ایک من گھڑت رسم کی خاطر بچوں کو روزہ نہ رکھوانا اور ان پر روزہ فرض ہونے کے بعد بھی اس سے غفلت برتنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

پندرھویں روزے کی تعظیم

کسی چیز کے مرتبہ کی بڑائی اور اس کی تعظیم، ایسی چیز ہے جو محض عقل کی بنیاد پر تراشی نہیں جاسکتی، بل کہ قرآن وحدیث کی دلیل ہی اس کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مثلاً پنج وقتہ نمازوں کا جو درجہ ومقام ہے اور ان میں تفاضل ہے، وہ صرف دلیل شرعی کی بنیاد پر قائم ہوگا، محض اپنی عقل سے نہیں۔ اسی طرح روزوں کا مسئلہ بھی ہے کہ بلا شرعی دلیل کے کسی روزے کو کسی روزے سے بڑا اور زیادہ عظیم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر افسوس کہ بعض لوگ روزوں میں بھی کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ بہت سے عوام میں یہ مشہور ہے کہ منجھلا روزہ یعنی پندرھواں روزہ بڑا روزہ ہے، حالاں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ محض ایک من گھڑت عقیدہ اور بدعت ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

> ”رمضان کی بدعت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منجھلے روزے کو افضل سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ احکام بھی تراش رکھے ہیں جو سب بدعات ہیں۔“(۱)

لہٰذا اپنی جانب سے کسی روزے کو بڑا اور کسی کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہئے، ہمیں اس کا اختیار نہیں ہے۔

---

(۱) اغلاط العوام مولانا تھانوی مرتبہ مولانا مہربان علی صاحب: ۱۲۷

تراویح میں نابالغ کی امامت

تراویح میں نابالغ بچوں کو امام بنانے کا رواج بھی بہت سے مقامات پر زوروں پر ہے، بعض جگہ تو یہ تک ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ بالغ حفاظ کے ہوتے ہوئے بھی نابالغ حافظ کو امام بنا دیا جاتا ہے، یہ مسئلہ کہ تراویح میں نابالغ بچے کو امام بنانا درست ہے یا نہیں؟ اگرچہ اختلافی مسئلہ ہے، لیکن صحیح اور جمہور علماء کا پسندیدہ قول یہی ہے کہ نابالغ کی اقتداء کسی نماز میں بھی صحیح نہیں ہے، نہ تراویح میں اور نہ کسی اور نفل یا فرض میں۔ چنانچہ صاحب ''ہدایہ'' نے فرمایا کہ:

''وفی التراویح والسنن المطلقة جوزه مشائخ بلخ ولم یجوزه مشایخنا والمختار انه لا یجوز فی الصلوات کلها.''

(اور تراویح اور سنت مؤکدہ میں بلخ کے مشائخ نے اس کو (یعنی نابالغ کی اقتداء کو) جائز قرار دیا ہے اور ہمارے مشائخ نے اس کو جائز نہیں قرار دیا ہے اور مختار قول یہی ہے کہ (نابالغ کی اقتداء) تمام نمازوں میں ناجائز ہے۔)(۱)

علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے کہ یہی قول مختار ہے اور جمہور علماء کا ہے اور یہی ظاہر روایت ہے۔(۲)

اور وجہ یہ ہے کہ علامہ حصکفی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''درمختار'' میں اس کو اصح قرار دیا ہے۔(۳)

---

(۱) ھدایه: ۱/۱۰۳

(۲) بحر الرائق: ۱/۵۹

(۳) در مختار مع شامی: ۱/۵۷۸

اور وجہ یہ ہے کہ اکثر علماء کے مطابق بچہ کی نماز حقیقت میں نماز ہی نہیں ہے، بلکہ نماز کی نقل ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے ایک ایسا آدمی جس پر نماز فرض یا سنت ہے، کس طرح نماز پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نہایہ میں ہے کہ یہ اختلاف اس طرف راجع ہے کہ بچہ کی نماز، نماز ہے یا نہیں؟ کہا گیا ہے کہ وہ نماز نہیں ہے، بلکہ صرف عادت ڈالنے کے لیے اس کو نماز کا حکم دیا گیا ہے، اسی وجہ سے بالغ ہونے کے قریب پہنچی ہوئی لڑکی بغیر اوڑھنی نماز پڑھے، تو جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اور اسی لئے مراہق (قریب البلوغ لڑکا) قہقہہ لگائے تو وضو کرنے کا حکم دیا جائے گا، اس کے بعد علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: بظاہر اس کی ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ بچہ کی نماز نماز نہیں ہے، اس لیے اس کی اقتداء میں کسی بھی نماز کا ناجائز ہونا مختار قول ہے۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ راجح بات یہ ہے کہ بچہ کی نماز نماز نہیں، بلکہ نقل نماز ہے، تو اس کہ پیچھے بالغ شخص نماز نہیں پڑھ سکتا۔

ہمارے علما نے بھی اس پر فتوی دیا ہے۔ چناں چہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''فتوی اس پر ہے کہ نابالغ کے پیچھے تراویح بھی جائز نہیں، اگر کوئی بالغ حافظ نہ ملے تو ''الم تر کیف'' وغیرہ سے مختلف سورتیں پڑھ کر تراویح پڑھ لی جائے''۔(۲)

---

(۱) البحر الرائق: ۳۵۹/۱

(۲) امداد المفتیین: ۳۶۳

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ نابالغ کی اقتداء بالغین کو فرض و نفل کسی میں بھی درست نہیں ہے، پس تراویح بھی نابالغ کے پیچھے نہیں ہوتی، یہی حنفیہ کا صحیح مذہب ہے۔''(۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آج بہت سے مقامات پر جو یہ رواج ہے کہ نابالغ بچوں سے قرآن سننے کے شوق میں، ان کو تراویح میں امام بنادیا جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ اگر بچوں کو عادت ڈالنے یا ان کی ہمت افزائی کے لئے امام بنانا ہو تو ان کے پیچھے نابالغ بچوں کو نماز پڑھائیں۔ اس سے ان کو عادت بھی پڑ جائے گی اور بڑے لوگوں کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔

نمک پر افطاری کی رسم

شریعت میں افطاری کسی بھی چیز سے کی جاسکتی ہے۔ البتہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر اور افضل یہ ہے کہ کھجور سے اور کھجور نہ ہو تو پانی سے افطار ہو۔ امام ترمذی وابوداؤد رحمہما اللہ نے حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِذَا أُفْطَرَ اَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى تَمَرٍ فَاِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى مَاءٍ فَاِنَّهٗ طَهُوْرٌ. »

(جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو چاہیئے کہ کھجور پر افطار کرے اور اگر نہ پائے تو پانی پر کرے؛ کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔)(۲)

---

(۱) عزیز الفتاویٰ: ۱۹۶

(۲) سنن ترمذی: ۱/۱۴۹

اورخود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی عمل تھا، چنانچہ حدیث میں ہے:

« عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِک قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یُفْطِرُ قَبْلَ اَنْ یُّصَلِّيَ عَلٰی رُطَبَاتٍ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ رُطَبَاتٍ فَتُمَیْرَاةٌ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تُمَیْرَاةٌ حَسَا حَسْوَاةٌ مِنْ مَّاءٍ. »

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ (مغرب) سے قبل چند تر کھجور پر افطار کرتے اور اگر تر کھجور نہ ہوتے تو چھواروں پر کرتے اور وہ بھی نہ ہوتے تو چند چلو پانی لیتے۔)

پہلی حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔(۱)

اور امام ابوعبداللہ حاکم رحمہ اللہ نے صحیح علی شرط البخاری کہا ہے۔(۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ کھجور یا پانی پر افطار کیا جائے، اس کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنی طرف سے متعین کرنا ''ایجادِ بندہ'' کی فہرست میں داخل ہے۔

مگر افسوس کہ ہمارے ان علاقوں میں بہت سے لوگوں اور خاص طور پر بوڑھی عورتوں میں نمک پر افطاری کا ایک خودساختہ طریقہ رائج ہے اور اس طریقہ کو مستحب سے بھی بڑھا کر درجۂ وجوب تک پہنچا دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اوپر کی حدیث اور معمولِ نبوی کے برخلاف کسی چیز کو اپنی طرف سے ضروری یا مستحب خیال کر لینا اور اس کی عملی پابندی کرنا نہ صرف یہ کہ بدعت ہے، بلکہ ایک درجہ میں سنت کا مقابلہ بھی ہے، بلکہ صحیح بات یہ کہ ہر بدعت میں سنت کا مقابلہ ہوتا ہے، لہٰذا اس طریقہ کی پابندی بلاشبہ غلط ہے اور واجب الترک ہے۔

---

(۱) سنن ترمذی: ۱/۱۵۰

(۲) بحواله بذل المجهود: ۴/۱۴۱

ہاں بلا پابندی اور بلا اعتقاد، یوں ہی کوئی نمک سے افطاری کرلے تو اس کی بھی بلا شبہ اجازت ہے۔ مگر اس کو خاص اعتقاد اور ثواب کی نیت سے اختیار کرنا محض بدعت ہے۔

مساجد میں افطاری کا رواج

ہمارے معاشرے میں اکثر لوگ مساجد میں افطار کرنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں اور بہت ساری مساجد میں لوگ بڑے بڑے خوان بچھاتے اور ان پر متعدد ماکولات ومشروبات کا انتظام فرماتے ہیں، حالانکہ مساجد میں کھانے اور پینے سے علمانے سختی سے منع فرمایا ہے اور صرف ضرورت پر اس کی اجازت دی ہے، جیسے مسافر کو گھر بار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے یا اعتکاف کرنے والے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو مسجد میں کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ "درمختار" میں فرماتے ہیں:

"مکروہ ہے (مسجد) میں کھانا اور سونا، مگر معتکف اور مسافر کو جائز ہے۔"(۱)

اسی طرح علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ نے "الاشباہ و النظائر" میں لکھا ہے:

"منع کیا جائے گا کھانے اور سونے سے غیر معتکف اور غیر مسافر کو۔"(۲)

معلوم ہوا کہ مسجد میں کھانے اور پینے کی اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ مسجد عبادت گاہ ہے جو بلا ضرورت ان چیزوں کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے۔ اسی لئے کبھی بہ ضرورت

---

(۱) در مختار مع شامي: ۱/۶۶۱

(۲) الاشباه مع الحموی

کسی کو مسجد میں کھانے سونے کی بات پیش آئے تو علما نے لکھا کہ اعتکاف کی نیت کر کے پہلے کچھ دیر ذکر واذکار میں مشغول ہو جائے، پھر کھائے پیئے۔ جیسا کہ شامی اور حموی رحمہما اللہ نے تصریح کی ہے۔(۱)

مگر یہ غیر مسافر وغیر معتکف کو بہ ضرورت کھانے پینے کی صورت میں بہ نیت اعتکاف اس کی اجازت دی گئی ہے۔ بے ضرورت کھانے پینے کا مشغلہ بنالینا اور اس کے لیے اعتکاف کی نیت کر لینا غلط ہے؛ کیوں کہ ہر کام مقصد کے تابع ہوتا ہے، لہٰذا کھانا پینا مقصد ہوگا تو اعتکاف کی نیت کر لینے سے اس پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہاں ضرورت کے مواقع اس سے ضرور مستثنیٰ ہوں گے۔

اس کے علاوہ مسجد میں افطار کے موقع پر جو شور وغل اور بچوں کا دوڑنا اور گھومنا اور افطاری کے سامان کی چھینا جھپٹی اور اس کے لیے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا؛ بلکہ دھکے دینا اور مسجد کے فرش کو ملوث کرنا وغیرہ، جو امور پیش آتے ہیں، ان کے پیش نظر کسی صورت میں مسجد میں افطاری کی اجازت نہیں دی جا سکتی، لہٰذا اہل محلّہ کو چاہیے کہ یا تو گھروں میں افطار کر کے مسجد کو آئیں یا مسجد کے باہر آس پاس اس کا انتظام کریں، تا کہ مسجد کی بے حرمتی نہ ہو۔

صبح صادق کے بعد سحری

رمضان مبارک میں جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک عام بے احتیاطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ صبح صادق ہونے بعد بھی کھانے پینے میں مشغول رہتے ہیں، اور بعض لوگ اذان تک اور بعض اذان کے ختم ہونے تک بھی کھاتے رہتے ہیں، حالانکہ صبح صادق ہو جانے کے بعد کھانے پینے کی اجازت نہیں اور اس سے

(۱) شامي: ۱/۶۶۱، غمز عيون البصائر للحموي: ۴/۶۰

روزہ اکارت جاتا ہے۔

قرآن کریم نے بہ صراحت سحری کے انتہائی وقت کو بتا دیا ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرۃ : ۱۸۷)

(کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح (صادق) کا ممتاز ہو جائے سیاہ خط سے (یعنی رات سے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ سحری کا انتہائی وقت صبح صادق کا ظاہر ہونا ہے اور صبح صادق کے یقینی طور پر ظاہر ہو جانے کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی کھانا پینا روزہ کو فاسد کر دیتا ہے اور صبح کا یقین ان چارٹوں سے ہو سکتا ہے جو رمضان میں اوقات سحر وافطار ہی پر مشتمل شائع کیے جاتے ہیں۔ اس میں بتائے ہوئے وقت کے مطابق سحری کا ختم کر دینا ضروری ہے تا کہ روزہ فساد کا شکار نہ ہو جائے۔

بعض لوگ بعض حدیثوں کی بنا پر سحری کو صبح صادق کے بعد بھی جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہیں، مگر یہ دراصل ان حضرات کو احادیث نہ سمجھنے سے دھوکہ لگا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد کھانے، پینے کی اجازت نہیں ہے، اور جن حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اذان کے بعد بھی کھا سکتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ اذان اگر فجر سے پہلے ہو جائے، جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان پہلے ہوتی تھی تو کھانے کی اجازت ہے، مگر صبح صادق کے بعد اجازت نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے کتب حدیث اور ان کی شروحات دیکھیے۔(۱)

---

(۱) مثلاً بذل المجہود وغیرہ

تراویح کی مروجہ دعائیں

تراویح کی نماز کے ہر ترویحہ (چار رکعت) پر استراحت کرنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے؛ مگر اس موقع پر کیا پڑھنا یا کیا کرنا چاہئے، اس کی کوئی تعیین نہیں کی گئی؛ بلکہ اس موقع پر ہر شخص کو آزاد رکھا گیا ہے اور اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، خواہ ذکرواذکار میں مشغول ہو یا نفل نماز پڑھے، یا خاموش بیٹھا رہے۔ چناں چہ حضرات فقہانے اس کی تصریح فرمائی ہے:

چناں چہ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ ''شرح کنز'' میں لکھتے ہیں:

''فقہانے کہا ہے کہ لوگ بیٹھنے کی حالت میں مختار ہیں اگر چاہیں تو تسبیح پڑھیں، اور اگر چاہیں تو قرآن کی تلاوت کریں اور اگر چاہیں تو تنہا چار رکعت نفل پڑھیں اور چاہیں تو خاموش بیٹھے رہیں۔ اور مکہ والے (اس وقت) ایک ہفتہ طواف کرتے ہیں اور دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اور مدینہ والے چار رکعت نفل پڑھتے ہیں۔''(۱)

اسی طرح علامہ ابوبکر الحداد یمنی رحمۃ اللہ نے ''الجوهرة النيرة'' میں لکھا ہے:

''اس جلسہ استراحت میں اختیار ہے، چاہے تو تسبیح پڑھے، ذکر کرے یا خاموش انتظار کرتا رہے اور اس وقت نماز پڑھنے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، بعض نے مکروہ کہا ہے اور بعض نے مستحب کہا ہے۔''(۲)

---

(۱) البحر الرائق: ۶۹/۲

(۲) الجوهرة النيرة: ۱۴۰/۱

اسی طرح علامہ حصکفی رحمۃ اللہ نے ''درمختار'' میں اور علامہ شامی رحمۃ اللہ نے ''ردالمحتار'' میں لکھا ہے۔(۱)

ان تمام عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چار رکعت پر اتنی ہی دیر جتنے وقت میں چار رکعت ہوئی ہے، بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت اختیار ہے، چاہے تسبیح پڑھے یا قرآن یا اور کوئی وظیفہ یا خاموش بیٹھا رہے او نماز پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے مکروہ کہا ہے اور بعض نے اجازت دی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت کے لیے کوئی خاص ذکر یا دعا منقول نہیں ہے؛ بل کہ اپنے طور سے اگر کوئی ذکر بغیر تخصیص کے پڑھ لے تو جائز ہے۔

مگر افسوس کہ ہمارے شہروں اور دیہات کی اکثر مساجد میں بعض دعائیں اور اذکار خصوصیت کے ساتھ اور واجب کی طرح التزام کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، حالاں کہ ابھی اوپر ثابت ہوا کہ اس سلسلے میں کوئی دعا وذکر خصوصیت سے ثابت نہیں اور اس وقت ہر شخص کو اختیار ہے، لہٰذا یہ تخصیص والتزام بلا شبہ دین میں اضافہ اور بدعت ہے۔

مثلاً بعض جگہ: ''فضل من اللہ ونعمۃ ومغفرۃ ورحمۃ الخ'' ہر دو رکعت پر اور پھر ہر چار رکعت پر بالترتیب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود، حضرت صدیق اکبر، عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی رضی اللہ عنہم کی ثناء ومنقبت اور ان پر دعاء رحمت کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں اور ان پر اتنا التزام اور اتنی پابندی کہ ان کے ترک پر مستقل نزاع اور جھگڑا قائم ہو جاتا ہے، اور نہ پڑھنے والوں کو ملامت کی جاتی ہے، اولاً تو ان دعاؤں کا ثبوت نہیں ہے؛ بل کہ یہ کسی شخص کی بنائی ہوئی ہیں۔

---

(۱) دیکھو: در مختار مع شامی: ۲/۴۶

لہٰذا ان دعاؤں کو نمازِ تراویح کے ترویحوں میں پڑھنے کا رواج اپنی طرف سے تخصیص ہے، پھر اس پر واجبات کی طرح التزام کیا جاتا ہے جو دوسری غلطی ہے، پھر ہر دو رکعت پر دعا بھی غلط ہے؛ کیوں کہ استراحت کا حکم چار رکعت پر ہے۔ اسی لیے علماء نے دو رکعت پر نماز کو بدعت و مکروہ قرار دیا ہے، چناں چہ ''درمختار'' میں اس کو مکروہ کہا ہے اور شامی رَحمہُ اللہُ نے اس کے مکروہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ استراحت چار رکعت پر ہے نہ کہ دو رکعت پر۔ (۱)

اور شامی رَحمہُ اللہُ نے ''منحة الخالق'' میں رملی رَحمہُ اللہُ سے اس کا بدعت ہونا نقل کیا ہے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جب دو رکعت پر استراحت نہ ہونے کی وجہ سے نماز درست نہیں تو دعا بھی درست نہیں؛ لہٰذا یہ دعاء کا طریقہ تیسری غلطی ہے۔ اس لیے یہ بدعت میں داخل ہے۔

یہاں یہ بات بھی صاف ہو جانا چاہئے کہ بعض کتبِ فقہ میں چار رکعت پر درج ذیل دعاء پڑھنے کی نشاندہی کی گئی ہے:

''سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزة والعظمة والهیبة والقدرة الخ.''

مگر یہ بھی ضروری و لازم نہیں اور نہ ہی یہی دعا اس وقت کے لیے مخصوص ہے۔ فقہاء کے طرز سے یہی ثابت ہوتا ہے، چناں چہ علامہ شامی رَحمہُ اللہُ نے علامہ قہستانی رَحمہُ اللہُ کے حوالہ سے یہ دعا نقل کی ہے؛ مگر یہ دعا انہوں نے ''درمختار'' کے اس قول

(۱) درمختار مع شامی: ۲/۴۶

(۲) منحة الخالق علی البحر الرائق: ۲/۶۹

کی شرح میں نقل کی ہے:

''اس وقت لوگوں کو اختیار ہے تسبیح، قرأت، خاموشی یا تنہاء نماز پڑھنے میں۔''(۱)

اس پر شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ تسبیح میں یہ پڑھا جائے (جو اوپر نقل ہوا) یہ طرز صاف بتارہا ہے کہ یہ تسبیح ضروری نہیں اور نہ ہی مخصوص ہے۔ البتہ تسبیح میں اس کو بھی پڑھا جاسکتا ہے، لہٰذا اس پر بھی اس طرح التزام کہ واجب معلوم ہو اور اس کی تخصیص نہ کی جائے۔

سحری میں جگانے کے غیر مہذب طریقے

اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ رمضان مبارک میں سحری کے لیے لوگوں کو بیدار کرنا ثواب کا کام ہے اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں بھی لوگوں کو جگانے کا انتظام تھا، مثلاً حدیث میں ہے:

« قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لاَ یَمْنَعَنَّ اَحَدًا مِّنْکُمْ اَذَانُ بِلاَلٍ مِّنْ سُحُوْرِهٖ فَاِنَّهٗ یَاْذَنُ لِیَرْجِعَ قَائِمُکُمْ وَیُوْقِظَ نَائِمُکُمْ. »

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی کو بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری سے نہ روکے؛ کیوں کہ وہ رات میں (صبح صادق سے قبل) اس لیے اذان دیتے ہیں تاکہ تہجد میں مشغول لوگ لوٹ جائیں (اور سحری کرلیں) اور سونے والے جاگ اٹھیں۔''(۲)

(۱) درمختار مع شامی: ۲/۴۶
(۲) بخاری: ۱، مسلم: ۱/۳۵۰

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت بلال ﷜ زمانۂ رسالت میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے اذان کہا کرتے تھے؛ لہٰذا بیدار کرنے کے لیے تدبیر کرنا بلا شبہ دائرۂ سنت کی چیز ہے اور ثواب کا کام ہے؛ مگر یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ بیدار کرنے کے لیے ناشائستہ اور غیر مہذب طریقہ اپنانا غلط بات، اسی طرح ناجائز طریقہ اپنانا ناجائز ہے۔

مثلاً بعض لوگ جو روزہ داروں کو سحری کے لیے جگانے اور ثواب کمانے کا بے حد جذبہ رکھتے ہیں، وہ زور زور سے چیخ کر یا بیہودہ آواز نکال کر یا فلمی گانوں کو گا کر یا میوزک اور باجے کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ناشائستہ ہونے کے ساتھ ناجائز بھی ہے، لہٰذا ان نیک جذبات کو، اچھے اور جائز طریقے سے پورا کرنا چاہئے۔

اس میں اس کا بھی خیال ہو کہ بیمار، بچے اور غیر مکلّف لوگ تکلیف محسوس نہ کریں، اور کفار و مشرکین کے دلوں میں اسلام کے بارے میں بدگمانی پیدا نہ ہو جائے، بلکہ ایسا طرزِ عمل اور طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے کہ لوگوں کو بیدار کرنے کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور کسی کو تکلیف بھی نہ ہو اور نہ اسلام اور اس کی تعلیمات پر کوئی حرف آئے؛ کیوں کہ کفار و مشرکین ہماری بدتہذیبی کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دے لیں گے، تو ہم اسلام کے بارے میں بدگمانی کا ذریعہ وسبب بنیں گے۔ اس لیے اس طرح کی بے تکی و ناشائستہ حرکات سے ضرور احتراز کرنا چاہیے۔

رمضان کے آخری جمعہ میں خطبۃ الوداع کا التزام

رمضان مبارک کے چلے جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے، رمضان کے آخری جمعہ میں الوداع، الفراق، اسلام پر مشتمل خطبہ پڑھا جاتا ہے جس کو خطبۃ الوداع بھی کہتے ہیں، اس میں دو باتیں خلاف شریعت ہیں:

(۱) ایک یہ کہ رمضان کے جانے پر افسوس وتاسف کا اظہار کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے، بلکہ فی الجملہ خوشی کا اظہار کرنا ثابت ہے؛ کیوں کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عید الفطر انعام اور مغفرت کا دن ہے، نیز اس دن خوشی کرنے اور اچھے کپڑوں اور کھانوں سے اس کا اظہار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، لہٰذا اس کے برخلاف افسوس ورنج کا اظہار کرنا خلاف شرع کام ہے۔

چناں چہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ اپنے ایک فارسی میں لکھے گئے فتوی میں فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"خطبۃ الوداع کا حاصل رمضان کے پورا ہونے پر افسوس کا اظہار کرنا ہے اور اس طرح کا افسوس ظاہر کرنا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صالحین خیر القرون میں کسی جگہ منقول نہیں ہے۔ بلکہ غور کریں تو تاسف کے بجائے ایک گونہ سرور ومسرت ختم رمضان پر مطلوب معلوم ہوتی ہے۔"(۱)

(۲) دوسری بات یہ کہ اس رسم کو لازم وواجب کی طرح انجام دیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ آخری جمعہ رمضان میں خطبۃ الوداع والفراق پڑھا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کو شریعت میں لازم نہیں کیا گیا اس کو لازم قرار دے لینا بدعت ہے، اگر چہ فی نفسہ وہ بات خلاف شرع نہ بھی ہو۔ چناں چہ علامہ عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے فی نفسہ خطبۃ الوداع کو مباح قرار دینے کے باوجود اس کے التزام کو بدعت قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

---

(۱) امداد الفتاوی: ۱/۶۸۵

''لیکن اہتمام کرنا خطبۂ وداع کا جیسا کہ اس زمانہ میں مروج ہے اور اس کو حد التزام تک پہنچانا خالی ابتداع (بدعت) سے نہیں، علماء معتمدین کو لازم ہے کہ اس طریقے کے التزام کو چھوڑیں تا کہ عوام اعتقاد استحباب وسنیت بلکہ ضروری ہونے اس طریقہ خاص سے نجات پاویں۔''(۱)

الغرض یہ رسم بھی قابل ترک ہے تا کہ بدعت سے بچا جا سکے اور اصل دین پر محافظت ہو سکے۔

عید الفطر کی سویاں

عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے قبل کچھ کھا لینا سنت ہے اور رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ عید گاہ تشریف لے جاتے تھے اور کھجور بھی طاق عدد استعمال فرماتے تھے۔(۲)

لہٰذا کھجور کا اہتمام کرنا بھی سنت ہے اور علما نے لکھا ہے کہ اگر اس کا انتظام نہ ہو تو کسی میٹھی چیز کا کھانا بہتر ہے۔(۳)

مگر اس دن کے لیے اپنی طرف سے کسی خاص چیز کا التزام کرنا، من گھڑت بات ہے، جیسے بہت سے لوگ عید الفطر کے دن صبح سویاں (شیر خرما) پکاتے ہیں اور اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں اور سنت کی طرح اس کی پابندی کی جاتی ہے، حالاں کہ خاص یہ چیز سنت نہیں ہے، بل کہ سنت تو کھجور ہے یا بعد کے درجہ میں کوئی بھی میٹھی چیز۔

(۱) مجموعة الفتاوى: ۱/۲۱۸

(۲) بخاري مع فتح الباري: ۲/۴۴۶

(۳) در مختار مع شامي: ۲/۱۶۸

اس عمومیت میں خصوصیت پیدا کرنا بلاشبہ من مانی ہے، جس سے بچنا چاہیے۔

کہنا یہ نہیں کہ سویاں پکانا غلط یا برا ہے، بل کہ یہ بتانا ہے کہ اس کو خاص کر لینا اور اسی پر ہمیشہ پابندی کرنا غلط و من گھڑت ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ ''اصلاح الرسوم'' میں فرماتے ہیں:

''عید الفطر میں سویاں پکانے فی نفسہ مباح (جائز) ہے مگر لوگوں نے اس میں خرابیاں پیدا کر لی ہیں) (اس کو ضروری سمجھتے ہیں حتی کہ سویاں نہ پکائی جائیں تو عید ہی نہیں ہوئی، اس کی پابندی کی بدولت یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ اگر پاس نہ ہو تو قرض لے کر گو سود ہی پر ملے، ضرور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔''(۱)

اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عید الفطر میں سویاں بنائی تھیں، یہ آپ پر تہمت اور الزام ہے۔ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ملتا، لہٰذا یہ رسم بھی قابل اصلاح ہے۔

خطبۂ عید کی زبان

عیدین اور جمعہ کے خطبات میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ دو خطبے عربی زبان میں پڑھے جائیں؛ کیوں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ و تابعین اور اس کے بعد بھی ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک پوری اسلامی دنیا میں یہی طریقہ چلا آرہا تھا، لہٰذا عربی زبان میں دو خطبات کا ہونا سنت ہے۔

چناں چہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ''مصفی شرح موطا'' میں لکھتے ہیں:

---

(۱) ملخصا اصلاح الرسوم: ۱۴۹

''جب ہم نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور حضرات صحابہ اور خلفاء راشدین کے خطبات کو ملاحظہ کیا تو اس سے چند چیزوں کی تنقیح ہوئی کہ ان خطبات میں حمد باری تعالی، شہادتین، درود، تقوی کا حکم آیت قرآن کی تلاوت، مسلمانوں کے لیے دعا اور خطبات کا عربی میں ہونا پایا گیا...... آگے فرماتے ہیں کہ اس کا عربی میں ہونا اس لیے کہ مشرق ومغرب میں مسلمانوں کا عمل اسی پر مستمر ہے، حالاں کہ بہت سے ممالک میں ان کے مخاطب عجمی تھے۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ کا عربی میں ہونا بھی خطبہ کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے ایک ہے؛ بل کہ بعض علما نے خطبہ کا عربی میں ہونا خطبہ کے صحیح ہونے کی شرط قرار دیا ہے۔ چناں چہ علامہ نووی شافعی رَحِمَہُ اللّٰہ نے اپنی کتاب ''الاذکار'' میں لکھا ہے:

''خطبہ جمعہ اور دوسرے خطبات کا عربی میں ہونا شرط ہے۔''(۲)

حضرات علما کی ان تصریحات کے باوجود اکثر مقامات پر خطبات جمعہ وعیدین غیر عربی میں ہوتے ہیں، جو کہ سراسر بدعت اور مکروہ ہے، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رَحِمَہُ اللّٰہ اسی بدعت پر تنبیہ فرماتے ہوئے اپنے ایک عربی فتوی میں لکھتے ہیں:

''انہیں (مروجہ بدعات میں) سے جمعہ کے دن اور عیدین میں غیر عربی زبان میں خطبہ دینا ہے یا اس کا عجمی زبان میں ترجمہ کرنا ہے، یہ طریقہ خیر القرون کے بعد بلا علم کے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔''(۳)

---

(۱) بحواله مجموعة الفتاوی عبد الحی لکهنوی: ۲/ ۲۴۸

(۲) بحواله مجموعة الفتاوی: ۲/ ۲۴۸

(۳) ایضا: ۲/ ۲۴۷

اسی فتوے کے آخر میں بہ طور خلاصہ مضمون تحریر فرماتے ہیں:

”خطبہ کل یا اس کا بعض حصہ غیر عربی میں پڑھنا مکروہ اور خلاف سنت متوارثہ ہے؛ کیوں کہ اسلام کے صدر اول سے با وجود اس کے ضرورت کے اس کا ثبوت نہیں ملتا خصوصا جب کہ بہت سے مما لک فتح ہو گئے اور اسلام مختلف دیار کے پھیل گیا (پھر بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔“(۱)

الغرض جمعہ اور عیدین کا خطبہ غیر عربی زبان میں نہیں ہونا چاہئے کہ یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ عربی ہی میں دو خطبے ہونا چاہئے۔ یہاں بعض سطحیت پسند علماء سے فاش غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ لوگ کتب فقہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ آپ کے نزدیک غیر عربی میں خطبہ جائز ہے اور اس سے غیر عربی میں خطبہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کے قول میں جواز کے معنی صحیح ہو جانے کے ہیں، جو فاسد کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ گناہ نہ ہونے کے معنی جو حرام و مکروہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کی کتب فقہ میں بے شمار مثالیں ملیں گی کہ حضرات فقہاء نے جائز کا لفظ صحیح کے معنی میں استعمال کیا ہے، اگر چہ وہ کام مکروہ و نا جائز کیوں نہ ہو۔ یہاں اس کی ایک دو مثالوں پر کفایت کی جاتی ہے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ تکبیر تحریمہ میں اللہ اکبر کے بجائے کوئی اللہ اجل یا اللہ الرحمٰن وغیرہ الفاظ کا استعمال کرے تو جائز ہے۔ (۲)

حالاں کہ خود فقہائے کرام نے اس کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ (۳)

(۱) ایضا: ۲۵۲/۲

(۲) شرح وقایہ مع چلپی: ۳۸

(۳) دیکھو: در مختار مع شامی: ۴۸۳/۱

اسی طرح خطبۂ جمعہ کو بغیر وضو پڑھنا فقہا نے جائز قرار دیا اور مکروہ بھی بتایا ہے۔(۱)

اور اس کو جو بغیر وضو خطبہ دے گنہگار بھی قرار دیا ہے۔(۲)

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک کام کو فقہا جائز بھی کہتے ہیں اور مکروہ بھی اور اس جائز کام کے مرتکب کو گنہ گار بھی، آخر اس کی کیا توجیہ ہے؟ یہی توجیہ ہے کہ جواز کے معنی صحیح و منعقد ہو جانے کے ہیں، اگر چہ وہ کام ناجائز و مکروہ ہو اس کی اصولی بحث کو احقر نے اپنے ایک رسالہ ''املاک مساجد'' میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔(۳)

اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں امام اعظم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے جو فرمایا ہے کہ غیر عربی میں خطبہ جائز ہے، اس کا معنی یہی ہے کہ خطبہ ہو جائے گا، اگر چہ مکروہ و ناجائز ہے۔ چناں چہ علامہ عبدالحی لکھنوی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں:

> ''اس حکم (جواز) میں اور حکم کراہت میں کچھ منافات (مخالفت) نہیں، صدہا جگہ فقہاء ''یجوز'' و ''یصح'' (جائز و صحیح ہے) لکھتے ہیں اور غرض ان کی نفس اجزا و کفایت و جواز بالمعنی الاعم ہوتی ہے، نہ کہ اباحت مطلقہ خالیہ عن الکراہتہ ...... اس کے بعد فقہا کی عبارات نقل کر کے آگے فرماتے ہیں: پس خوب واضح ہو گیا کہ خطبہ غیر عربیہ کی کراہت کا حکم مخالف اقوال فقہاء کے کسی طرح نہیں۔''(۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں جمعہ و عیدین کا خطبہ مکروہ و بدعت ہے

---

(۱) مختصر القدوری: ۳۶

(۲) شامی علی الدرر: ۱۵۰/۲

(۳) دیکھو: املاک مساجد: ۱۰۔۱۱

(۴) مجموعة الفتاوی: ۳۷۸/۲۔۳۷۹

اور فقہاء نے جو جائز لکھا ہے، ان کی مراد اس سے خطبہ کا ہو جانا ہے، اگر چہ مکروہ ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے ان علماء کی غلطی واضح ہوگئی جنہوں نے فقہاء کے کلام سے غیر عربی خطبہ کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے. جیسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' میں کیا ہے کہ فقہاء کی ان عبارات کو جواز بمعنی مباح لے لیا، پھر بعض علماء کی طرف غلط انتساب بھی کر دیا مثلاً علامہ عبد الحی لکھنوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی طرف جواز کا قول منسوب کر دیا پھر آپ کے حوالہ سے حضرت شاہ محدث دہلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی طرف بھی جواز کا قول منسوب کر دیا، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ اوپر ہم نے علامہ عبد الحی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا فتوی نقل کر دیا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمالیں تو مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی بات کا صحیح نہ ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

نماز و خطبۂ عید کے بعد دعا

عید کی نماز اور خطبہ کے بعد دعا کا کیا حکم ہے؟ اس پر حضرات علما کے مابین بحث آئی ہے اور صحیح یہ ہے کہ دعا کے لیے چوں کہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور نماز و خطبہ کے بعد بھی کی جا سکتی ہے، اس لیے عید کی نماز اور عید کے خطبہ کے بعد دعا کرنا فی نفسہ مباح ہے اور یہ جواز کا ثبوت عمومات حدیث سے ہوگا؛ کیوں کہ احادیث کے عموم سے نماز کے بعد اور اسی طرح کسی نیک کام کے بعد دعا کرنا ثابت ہے، پس اسی عموم سے فی حد ذاتہ نماز و خطبہ عید کے بعد دعا جائز ہے، اگر چہ بہ طور خاص آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ سے اس کا ثبوت نہیں ہے، جیسا کہ علامہ عبد الحی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے۔ (۱)

---

(۱) مجموعۃ الفتاوی: ۱/ ۱۲۶

مگر یہاں دو باتوں پر توجہ کرنا ضروری ہے، ایک تو یہ کہ عمومات حدیث سے بلا شک نماز و خطبہ عید کے بعد دعاء کا جواز ثابت ہوتا ہے؛ مگر اس کا وجوب یا التزام ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا اس کی ایسی پابندی کرنا جیسی واجب امور کی کی جاتی ہے، بلاشبہ حد سے تجاوز اور بدعت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نماز و خطبہ دونوں کے بعد اور ان میں بھی زیادہ اہمیت سے نماز کے بعد دعاء کرنے کا ثبوت ہوتا ہے، لہٰذا بلا تخصیص دونوں کے بعد یا اہمیت سے نماز کے بعد دعاء کر لی جائے تو بلاشبہ جائز ہے؛ مگر نماز کے بعد دعاء کرنے کو برا سمجھنا اور خطبہ کے بعد دعاء کو ضروری سمجھنا یہ بلاشبہ تجاوز اور بدعت ہے، جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ان علاقوں میں دعاء کے متعلق ان دونوں اصولوں کی خلاف ورزی جاری ہے کہ اولاً تو نماز کے بعد دعاء نہیں کرتے اور اس کو غلط سمجھتے ہیں اور بعد خطبہ دعاء کو ضروری خیال کرتے ہیں، یہ اپنی طرف سے من گھڑت اور خلاف شرع بات ہے، لہٰذا اس رسم کو ترک کرنا چاہئے۔ چناں چہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اگر چہ دعاء ہر وقت جائز ہے مگر تخصیص بلا دلیل شرعی ہے، البتہ بعد نماز کے آثار کثیرہ میں مشروع ہے اور دبر الصلوۃ (بعد نماز) اوقات اجابت دعاء بھی ہے۔ بہر حال بعد نماز دعاء نہ کرنا اور بجائے اس کے بعد خطبہ مقرر کرنا تغییر سنت ہے اور قابل احتراز۔''(۱)

حاصل یہ کہ دعاء کبھی بھی کی جاسکتی ہے، البتہ ایک وقت کو اپنی جانب سے دعاء کیلئے خاص کرنا اور دوسرے وقت کو دعاء کیلئے نامناسب سمجھنا غلط ہے۔

---

(۱) امداد الفتاوی: ۱/۶۰۲-۶۰۳

عید کا مصافحہ و معانقہ

اسلامی آداب ملاقات میں سلام کے ساتھ مصافحہ منقول ہے اور احادیث میں اس کی تاکید وترغیب آئی ہے۔اسی طرح بوقت رخصت بھی مصافحہ کا ثبوت ملتا ہے۔(۱)

مگر ہمارے یہاں اور دوسرے بعض علاقوں میں مخصوص نمازوں اور عید کی نماز کے بعد جو مصافحہ کا طریقہ رائج ہے، یہ احادیث وآثار صحابہ واقوال سلف سے ثابت نہیں ہے۔ مصافحہ بلاشبہ سنت وعبادت ہے؛ مگر اس کا موقعہ یا تو اول ملاقات ہے یا وقت رخصت، نمازوں کے بعد یا کسی اور تقریب کے موقعہ پر مصافحہ کرنا غیر مشروع ہے۔لہٰذا عید کے موقعہ پر عید کا مصافحہ کرنا خلاف سنت ہے؛ بلکہ بدعت ہے۔ چنانچہ علماء نے مخصوص نمازوں کے بعد کے مصافحہ کو اسی وجہ سے سنت کے خلاف اور بدعت قرار دیا ہے کہ یہ اس کا موقعہ نہیں ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام وهذا كرة العلم وغيره مدة مديدة ثم اذا صلوا يتصافحون فاين هذا من السنة المشروعة ولهذا صرح بعض علماء نا بانها مكروهة وحينئذ انها من البدع المذمومة.“ (۲)

(کبھی کچھ لوگ بغیر مصافحہ کے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور باتوں اور علمی مذاکرہ وغیرہ میں ایک لمبی مدت مشغول رہتے

(۱) قاله الشيخ زكريا في حاشيته على الكوكب الدري: ۲/۱۴۲
(۲) حاشيه مشكوة: ۴۱

ہیں، پھر جب نماز پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہی، یہ سنت مشروعہ کہاں سے ہوا؟ اسی لئے ہمارے بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ مکروہ ہے اور اس وقت یہ مذموم بدعات میں سے ہے۔)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ کی یہ عبارت ہمارے یہاں کے عید کے مصافحہ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کہ باپ بیٹا اور دیگر گھر کے افراد اور دوسرے احباب مل کر گھر سے نکلتے ہیں اور عید گاہ پہنچتے ہیں، آپس میں ملاقاتیں، بات چیت سب کچھ ہوتاہ، جب عید کی نماز وخطبہ سے فارغ ہوتے ہیں تو یہی لوگ آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، حالاں کہ پہلے سے ملاقات ہے۔لہذا یہ بدعت مذموم ومکروہ ہے۔

حاصل یہ کہ مصافحہ کا موقعہ ملاقات کا اول وقت یا رخصت ہونے کا وقت ہے، عید کا کوئی مصافحہ اسلام میں نہیں ہے۔اسی طرح معانقہ (گلے ملنا) بھی بعض مواقع خاصہ میں جیسے سفر سے آنے کے وقت جائز بلکہ سنت ہے۔مگر عید کے موقعہ پر معانقہ کرنا بے اصل بات ہے جب کہ بعض ائمہ کے نزدیک معانقہ تو ویسے بھی سنت نہیں ہے، بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک (ایک قول کے مطابق) مکروہ ہے۔چناں چہ امام محمد رحمۃ اللہ نے تصریح کی ہے:

”ویکره أن یقبل الرجل فم الرجل أ و ید ه أوشیأمنه أو یعانقه.“ (۱)

(مکروہ ہے کہ مرد مرد کا منہ یا ہاتھ یا کوئی اور عضو کا بوسہ لے یا معانقہ کرے۔)

---

(۱) الجامع الصغیرمع شرحه النافع الکبیر: ۳۹۳

یہ امام محمد وابو حنیفہ رحمہما اللہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور الجامع الصغیر (جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے) میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک بیان کرتے ہیں اور چوں کہ اس جگہ اپنایا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں اختلاف نہیں بتایا ہے، اس لئے یہ گویا سب ائمہ احناف کا متفقہ مسئلہ ہوا۔ اگر چہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا اختلاف بتایا ہے، مگر بعض علماء کی تحقیق میں اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (۱)

اور یہ مکروہ ہونا بعض علماء کی تحقیق کے مطابق اس وقت ہے جبکہ شہوت کا خوف ہواور بعض کے نزدیک ملاقات کے وقت مکروہ ہے۔ البتہ سفر سے آنے کے وقت یا غایت محبت واشتیاق کے وقت مکروہ نہیں۔ (۲)

غرض یہ کہ معانقہ اگر جائز وسنت ہے بھی، تو اس کا موقعہ جو ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ عید کے دن نماز کے بعد ہونا چاہئے، یہ درست نہیں ہے، اس سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔

عید کے دن نئے کپڑوں اور عمدہ کھانوں کا اہتمام

عید اہل اسلام کی خوشی وفرحت، بشاشت ومسرت کا سب سے بڑا موقعہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں اچھے کپڑوں، عمدہ کھانوں اور زیب وزینت کا اہتمام کر لینا بلاشبہ جائز اور ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ قربانی کے دنوں بعض بچیاں یوم بعاث کے موقعہ کے اشعار خوشی ومسرت سے پڑھ رہیں تھیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وہیں

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: اعلاء السنن: ۱۷/۴۲۳......۱۷/۴۲۷

(۲) اعلاء السنن: ۱۷/۴۲۳

چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو اور پڑھنے دو؛ کیوں کہ یہ عید کے ایام ہیں۔ (۱)

فقہائے کرام نے بھی عید کے مستحبات میں زینت اور اچھے لباس کو شمار کیا ہے۔ (۲)

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تاریخ وسیر میں آیا ہے کہ وہ عید کے لیے اپنے سب سے اچھے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ (۳)

خلاصہ یہ کہ عید کے دن خوشی وفرحت کا اظہار کرتے ہوئے گنجائش کے مطابق اچھے کپڑوں اور عمدہ کھانوں کا اہتمام کرلینا صحیح و درست ہے؛ مگر یہ بات گوش ہوش سے سننے اور دیدۂ بصیرت سے ملاحظہ کرنے کی ہے کہ اسلام کی عید صرف کپڑوں اور کھانوں اور کھیل تماشوں کا نام نہیں ہے، کہ صرف انہی چیزوں میں اپنے دل و دماغ کے جوہر کو خرچ کر دیا جائے اور اپنی تمام تر کوششوں کا مرکز انہی باتوں کو بنالیا جائے۔

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر لوگ ان کھانوں اور کپڑوں کی فکر میں رمضان جیسے مبارک ماہ کی نور بار گھڑیوں کو خراب کرتے ہیں اور بعض رمضان کے شروع ہی سے اور بعض رمضان کے آخری ایام میں عبادت وطاعت کو چھوڑ کر تراویح اور دوسری نیکیوں کو خیر باد کہہ کر بازاروں میں عید کے کپڑوں، زیب وزینت کی چیزوں، جوتوں اور ٹوپیوں کے خریدنے کے لئے گھومتے پھرتے ہیں اور مزید افسوس یہ کہ ہماری مائیں اور بہنیں، پوری بے حیائی اور مجرمانہ بے پردگی کے ساتھ جاتی ہیں اور گھنٹوں گھنٹوں گھومتی پھرتی ہیں، کیا عید منانے کا یہ اہتمام جس سے

---

(۱) متفق علیه مشکوة: ۱۲۶

(۲) البحر الرائق: ۲/۱۵۸

(۳) فتح الباري: ۴۳۹

رمضان کا بابرکت مہینہ اکارت چلا جائے ،عبادات معطل ہوجائیں اور مزید یہ کہ گناہوں میں اشتغال ہوجائے، جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہرگزنہیں ہرگزنہیں۔

اسی طرح عید کے دن کھانوں کا ایسا اہتمام کہ عید محض ایک کھیل تماشا بن کر رہ جائے ،کسی طرح گوارانہیں کیا جاسکتا۔ صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام ومرتبہ ہے؟ اس سے کون ناآشنا ہوگا۔ آپ عید کے دن عید گاہ چلے جارہے ہیں اور پیر میں جوتے تک نہیں تھے۔ (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عید الاضحیٰ (بقرعید) کے دن ایک دفعہ مہمان کے سامنے حلیم (مختلف اناج ڈال کر ابالا ہوا کھانا) پیش کیا ،تو مہمان نے عرض کیا کہ امیر المومنین! بہتر ہوتا کہ آج بطخ کھلاتے ،اللہ نے تو مال کی زیادتی کررکھی ہے۔ (۲)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کبھی ایسا اہتمام عید کے لباس وکھانے کا نہیں فرماتے تھے، جیسے آج ہم میں رائج وعام ہوگیا ہے، بل کہ بروقت جس قدر گنجائش ہوئی، اتنا اہتمام (حدود میں رہتے ہوئے) کرلیا کرتے تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ عید کے لیے علما وفقہا نے نئے کپڑوں کو مستحب نہیں قرار دیا ہے؛ بل کہ مستحب صرف اس کو قرار دیا ہے کہ اپنے کپڑوں میں سے سب سے اچھے وعمدہ کپڑے پہنے جائیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نئے کپڑوں کے بغیر عید ہی نہیں ہوتی اور اس غلط رسم کی وجہ سے بعض لوگ قرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض تو سودی قرض لے کر نئے کپڑوں کا انتظار کرتے ہیں اور عید جیسی نعمت کو پاکر خدا کو ناراض کرتے ہیں۔ کس قدر افسوس ناک حالت ہے؟

---

(۱) منتخب كنز العمال بحواله حياة الصحابه: ۶۶۲/۲

(۲) بدايه بحواله حياة الصحابه :۳۲۶/۲

پھر عید کے ان فضول اخراجات ،عمدہ کھانوں ، نئے کپڑوں، بہترین جوتوں، خوشنما ٹوپیوں، لڑکیوں کے لیے زیورات وغیرہ وغیرہ جن کی اقسام وانواع گنانے کی بھی ہمیں فرصت نہیں ہے، ان کی خاطر رمضان کا پورا مہینہ لوگ مال جمع کرنے اور جس طرح بھی مل جائے بٹورنے میں لگے رہتے ہیں، کیا رمضان اسی لیے آتا ہے؟

یہ سب اس لیے کہ ہم نے عید کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ کھائیں پئیں ،موج اڑائیں، زیب وزینت کر کے سیر وتفریح کرتے پھریں ؛مگر اچھی طرح یاد رکھو عید کا یہ مفہوم ممکن ہے کہ ہندوؤں کی لغت میں ہو۔ عیسائیوں کی زبان میں ہو، یہود بے بہبود کی اصطلاح میں ہو؛ مگر اسلام کی لغت واصطلاح میں در اصل خدا کی رحمت وبرکت کے اوپر خوش ہونے اور اس خوشی میں شکر الٰہی بجالانے کا نام ہے۔ ہم اپنی اس کتاب کو بھی اور اس مضمون کو بھی حضرت امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کے ایک ملفوظ پر ختم کرتے ہیں جس میں عید کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

> ”عید خوشی ومسرت کا نام ہے اور اہل دنیا کے نزدیک ہر قسم کا سرور وانبساط اور ہر طرح کی فرحت وابتہاج عید کے مترادف ہے؛ لیکن شریعت مقدسہ اور ملت بیضاء کی نظر میں عید اس خوشی ومسرت کو کہتے ہیں جو نعمائے ربانی (اللہ کی نعمتوں) اور کرمہائے الٰہی کے شکر اور اس کے فضل وجود پر ادائے نیاز کے لیے کی جاتی ہے، دنیا خود فانی ہے اور اس کے باغ وبہار فانی ،پھر اس پر کیا مسرت وانبساط؟ عید کی حقیقت اصلیہ اس دائمی سرور میں مضمر ہے جس کی نسبت خود ذات احدیت سے وابستہ ہے۔“(۱)

دعاء ہے کہ اللہ تعالی اہل اسلام کو دین کی حقیقت سمجھنے اور رسومات غیر شرعیہ وبدعات وخرافات سے بچنے کی توفیق بخشے۔ آمین

---

(۱) ملخصا: ملفوظات محدث کشمیری: ۳۵۲

ضمیمۂ مفیدہ

کتاب کی جب کتابت مکمل ہوگئی تو چند صفحے خالی رہ گئے، مناسب خیال کیا ان صفحات میں روزوں کی اغلاط کا تذکرہ جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے، یہاں ضمیمہ کی حیثیت سے نقل کردیا جائے۔

روزے اور عید کی اغلاط

(۱) مشہور ہے کہ ایک روزہ رکھنا اچھا نہیں، اس مشہور کی کوئی اصل نہیں۔

(۲) ایک اعتقاد یہ ہے کہ کسی کی افطاری سے روزہ نہ کھولو، سارا ثواب اسی کو ملجاوے گا، حالاں کہ یہ غلط ہے، روزہ دار کو ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی۔

(۳) یہ مشہور ہے کہ شب برأت کے حلوہ سے اگر پہلا روزہ افطار کیا جاوے، بہت ثواب ہے، یہ بالکل غلط ہے۔

(۴) روزہ کی نسبت تمسخر (مذاق) کے کلمات کہنا مثلاً یہ کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو، یا یہ کہ ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا کفر ہے۔

(۵) اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عید کی شب میں روزہ ہوتا ہے اور صبح کو کہتے ہیں روزہ کھول لو، یہ بالکل بے اصل ہے۔

(۶) بعض عورتیں اپنی لڑکی کے نکاح کے دن روزہ رکھنا ضروری سمجھتی ہیں، یہ محض بے اصل ہے۔

(۷) بعض جگہ مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص شش عید کے روزے رکھ لے تو سود کا گناہ ختم ہو جاتا ہے، یہ بیہودہ بات ہے، سود کا گناہ اس طرح ختم نہیں ہوتا۔

(۸) آج کل عام طور سے بچوں کو عید گاہ لیجانے کا عام رواج ہوگیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھلا ضرور لیے ہوتا ہے، یہ طریقہ صحیح نہیں۔

(۹) بعض جگہ عیدین کی امامت موروثی طریقے پر کرائی جاتی ہے، خواہ امامت میں اہلیت ہو یا نہ ہو، بعض جگہ تو امام قرآن بھی صحیح نہیں پڑھتا، ایسی صورت میں نماز ہی سب کی باطل ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اکثر عوام خطبہ میں حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا اسم مبارک سن کر بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہیں، یہ جائز نہیں۔ زبان سے درود شریف نہ پڑھے، ہاں دل ہی دل میں پڑھ لینے کا مضائقہ نہیں۔

(۱۱) عید، بقر عید اور جمعہ میں لوگ رسم جان کر مصافحہ کرتے ہیں یا گلے ملتے ہیں، یہ کہیں قرآن وحدیث میں ثابت نہیں۔ اس لیے یہ رسم بدعت ہے۔

(م، ع)

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

نفحاتِ رمضان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہ اولیں

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم. امابعد:

رمضان المبارک کا مہینہ، ہر سال اپنی تمام تر برکتوں، فضیلتوں، بڑائیوں اور بزرگیوں کے ساتھ ہم پر جلوہ فگن ہوتا اور پھر رخصت ہو جاتا ہے؛ مگر ہم جن برائیوں، غفلت اندیشیوں، نالائقیوں اور اندھیروں میں گھرے ہوئے، پڑے ہوئے ہوتے ہیں، ان سے ذرہ برابر نہیں نکلتے؛ بل کہ اور گھرتے چلے جاتے ہیں، آخر اس کی وجہ و علت؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ماہ رمضان آتا اور جاتا ہے؛ مگر ہم اس سے استفادہ کرنے اور فیض اٹھانے کی کوئی سعی و کوشش نہیں کرتے، جیسے سورج نکلے، روشنی پھیلے، دن نمودار ہو جائے اور کوئی بے وقوف آنکھ بند کیے بیٹھا رہے، تو اس بے وقوف کو ان عظیم الشان روشنی اور نور سے کوئی حصہ نہ ملے گا اور وہ جیسے رات کی اندھیریوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا رہا تھا، اب بھی بھٹکتا پھرے گا، اب کون کہہ سکتا ہے کہ روشنی نمودار نہیں ہوئی؟ یا روشنی نے فائدہ نہ دیا؟ نہیں؛ بل کہ روشنی پھیلی، اس نے اپنی جلوہ نمائی سے سارے عالم کو منور کر دیا، ہر ایک نے اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق اس سے فیض بھی پایا، ہاں! جس نے نور دیکھنا ہی نہ چاہا، فیض پانا ہی گوارا نہ کیا، آنکھ کھولنے کی زحمت ہی نہ اٹھائی، وہ بلاشبہ محروم رہا اور رہے گا۔

یہی حال ہمارا ہے کہ رمضان کی مبارک ساعتیں ہم پر اپنا سایہ پھیلا دیتی ہیں، اس کے نور کی بدلیاں سارے عالم پر نور افشانی کرتی ہیں اور ذرہ ذرہ معمور اور اس

کے نشہ سے مخمور ہو جاتا ہے؛ مگر ہم اس نور کا مشاہدہ کرنے کے لیے آنکھ نہیں کھولتے، اس کے برکات وفضائل سے اخذ فیض کے لیے کبھی راغب نہیں ہوتے، کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ رمضان جیسے عظیم البرکات مہینہ کا ہم استقبال کریں، اس کا احترام کریں، اس سے اپنے تعلق کا اظہار کریں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم جہاں تھے وہیں اور جیسے تھے ویسے ہی رہ جاتے ہیں، اور رمضان اپنا سایہ ہم پر سے اٹھالیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے، یہ صورت حال کس قدر سنگین اور دردناک اور خطرناک ہے، یہ بالکل ظاہر ہے۔ الغرض ہماری غفلت حد کو پہنچ چکی ہے اور ہم نہایت نکمے ہو چکے ہیں، اس لیے اب ضرورت ہے اس کی کہ ہم ان غفلت کے پردوں کو جو ہم پر پڑے ہوئے ہیں، چاک کر ڈالیں اور بے عملی و بدعملی کی سیاہیوں کو دھوڈالیں اور بیدار، متیقظ ہوشیار اور پاک وصاف ہو جائیں، گناہوں کی جہنم سے اپنے آپ کو آزاد کرائیں، نیکیوں اور اعمال صالحہ کے خزانوں کو جمع کرلیں اور ہر طرح کی محرومیوں سے نکل کر خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے لٹائی جانے والی رحمتوں و برکتوں سے خوب خوب فیض پائیں۔

زیرنظر رسالہ جس کا نام ''**نفحات رمضان**'' ہے، اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ رمضان میں ہم کو کیا کرنا ہوگا؟ رمضان کی برکتوں سے ہم کس طرح مستفیض ہوسکیں گے؟ اسی طرح اس میں ہم نے رمضان کے مخصوص اعمال سے بحث کی ہے اور ان کے احکام کو بہ قدر ضرورت وضاحت سے بیان کیا ہے۔

آخر میں عرض ہے کہ قارئین ومستفیدین اس ناکارہ کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔

فقط

۲۹/رجب ۱۴۰۸ھ محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رمضان کی فضیلت

رمضان مبارک کی فضیلت پر ہم نہایت اختصار سے کلام کریں گے؛ کیوں کہ اس کے فضائل کے سلسلہ میں بہت سے رسائل شائع وعام ہو چکے ہیں، خصوصاً حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ کا رسالہ ''فضائل اعمال'' نہایت مفید ومؤثر اور بہت مشہور ہے، اس کو دیکھ لیا جائے؛ کیوں کہ ہمارا مقصود رمضان کے مخصوص اعمال اور ان کے احکام بیان کرنا ہے۔

رمضان کی فضیلت بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتی ہے۔ چند یہ ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« اذادخل شهر رمضان فتحت ابواب السماء وغلقت ابواب جهنم وسلسلت الشياطين. » (۱)

(جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔)

(۲) ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضرت رسول اللہ نے فرمایا:

« اذاجاء رمضان فتحت ابواب الجنة. » (۲)

(جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔)

---

(۱) البخاري:۱۷۶۶

(۲) البخاری:۱۷۶۵/مسلم:۱۷۹۳

(۳) حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ رمضان آ چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''رمضان کا مہینہ آ گیا ہے جو بڑی برکت والا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں (اپنی رحمت سے) ڈھانپ لیتے ہیں، تم پر رحمت نازل فرماتے ہیں۔ خطاؤں کو معاف کرتے اور دعاؤں کو قبول کرتے ہیں اور تمہارے تنافس (ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے بڑھنے) کو دیکھتے ہیں اور ملائکہ پر فخر فرماتے ہیں، پس تم اللہ تعالیٰ کو نیکی دکھاؤ، بدنصیب وہ ہے جو اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے''۔(۱)

(۴) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر دن ورات میں (جہنم کے) قیدی آزاد کیے جاتے ہیں، یعنی رمضان میں اور ہر مسلمان کے حق میں ہر دن ورات میں ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے''۔(۲)

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« اتاکم شهر رمضان، شهر مبارک فرض الله علیکم صیامه تفتح فيه ابواب السماء وتغلق فيه ابواب الجحيم، وتغل فيه مردة الشياطين، لله فيه ليلة خير من الف شهر،

---

(۱) مسند الشاميين للطبراني:۳/۲۷۱، الترغيب:۲/۹۹

(۲) الترغيب:۲/۱۰۳

من حرم خیرھافقد حرم .» (۱)

(تمہارے پاس ماہ رمضان آچکا ہے،وہ ماہ مبارک جس کے روزے اللہ نے تم پر فرض کیے ہیں،اس ماہ میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اوردوزخ کے دروازے بندکردیے جاتے ہیں اورشریر شیاطین کوبیڑی ڈال دی جاتی ہے،اس ماہ میں ایک ایسی رات ہے جو ایک ہزارمہینوں سے بہتر ہے،جواس کے خیر سے محروم کردیا گیاوہ واقعی محروم ہوگیا۔)

ان چنداحادیث سے رمضان مبارک کی فضیلتوں وبزرگیوں کا بہ خوبی اندازہ لگایاجاسکتا ہے،پہلی اوردوسری حدیث میں رمضان مبارک کے احترام میں جنت وآسمان کے دروازوں کاکھول دیاجانااورجہنم کے دروازوں کابندکردیاجانامذکور ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس مہینہ میں اللہ کی رحمتوں کابڑے وسیع پیمانے پر نزول ہوتا ہے،اوراللہ کاغضب نازل نہیں ہوتا،نیز پہلی حدیث میں مذکور ہے کہ اس ماہ میں شیاطین کوبندکردیا جاتا ہے،اس سے وہ شیاطین مراد ہیں جولوگوں کوگم راہ کرتے اور بہکاتے ہیں۔

تیسری حدیث میں بھی رمضان کابابرکت ہونااوراس میں اللہ کی رحمتوں کانازل ہونااوردعاؤں کاقبول کیاجانامذکور ہے،اورساتھ ہی نیکیوں میں تنافس کاپسندیدہ ہونا اوراس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کافرشتوں میں فخر فرمانابھی بیان ہوا ہے۔

تنافس کامطلب یہ ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں،اس کارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے،اس سے معلوم ہوا

(۱) نسائی:۲۱۰۶، مسند احمد : ۸۹۷۹، الترغیب:۲/۹۸

کہ رمضان کی برکتوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو نیکیوں میں دل چسپی لیتا ہے، ورنہ وہ محروم ہی رہے گا، اسی لیے آخر میں فرمایا کہ وہ بڑا بدنصیب ہے جو اس ماہ میں بھی رحمت سے محروم ہو جائے۔

اور چوتھی حدیث میں دو باتوں کا ذکر ہے، ایک تو یہ کہ رمضان میں ہر دن ورات میں بہت سے لوگوں کو جہنم سے آزاد کیا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ مسلمان کی ایک نہ ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے، یہ بھی رمضان کی برکت کا نتیجہ ہے۔

اور پانچویں حدیث میں ماہ رمضان کا مبارک ہونا اور اس میں روزوں کی فرضیت اور آسمانوں کے دروازوں کا کھول دیا جانا اور جہنم کے دروازوں کا بند کر دیا جانا اور شیاطین کا بیڑیوں میں جکڑ دینا جا مذکور ہے، نیز لیلۃ القدر کی فضیلت اور اس کا مقام بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، پھر آخر میں فرمایا کہ جو اس کے خیر سے محروم رہ گیا وہ واقعی محروم رہ گیا۔

ماہ رمضان کی خصوصیات

ماہ رمضان مبارک بے شمار خصوصیتوں کا حامل ہے، اور یہ خصوصیات کسی اور ماہ کو حاصل نہیں ہیں، اسی لیے اس ماہ کو سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے، چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مامر بالمسلمین شهر خير منه.» (۱)

(مسلمانوں پر کوئی مہینہ اس (رمضان) سے زیادہ بہتر نہیں گذرا۔)

الغرض ماہ رمضان بڑی خصوصیات کا مہینہ ہے، یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اجر وثواب میں زیادتی

رمضان میں اعمال کا ثواب، عام دنوں کے اعتبار سے بہت زیادہ عطا کیا جاتا ہے، چناں چہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی لمبی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اس مہینہ میں نفل عبادت کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہے، وہ اس شخص کے مانند جو اور دنوں میں فرض ادا کرے، اور جو اس مہینہ میں ایک فرض ادا کرے وہ اس آدمی کے مثل ہوگا جو دوسرے دنوں میں ستر (۷۰) فرض ادا کرے''۔ (۲)

---

(۱) صحیح ابن خزیمة :۳/۱۸۸

(۲) صحیح ابن خزیمة :۳/۱۹۱، شعب الایمان:۳/۳۰۵، مسند الحارث:۱/۴۱۲

جنت کے دروازوں کا کھل جانا اور دوزخ کے دروازوں کا بند ہو جانا

جیسا کہ اوپر احادیث گذر چکی ہیں کہ رمضان آتا ہے تو دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

شیاطین کا بند ہو جانا

حدیث میں ہے کہ رمضان میں شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے جیسا کہ اوپر گذرا۔ اور اس سے مراد وہ شیاطین وجن ہیں جو لوگوں کو گم راہ کرتے اور بہکاتے ہیں، کیوں کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث نمبر ۵ میں ہے، اس ماہ میں ان شریر جنات وشیاطین کو بند کر دیا جاتا ہے کہ وہ اب اس قابل نہیں رہتے کہ کہ لوگوں کو گم راہ کر سکیں۔

اب رہا یہ سوال کہ بہت سے لوگ رمضان میں بھی گم راہ ہوتے یا کم راہ رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یا تو نفس کے بہکانے کی وجہ سے ہے یا شیاطین کے ان اثرات کا نتیجہ ہے جو سال بھر لوگوں کے ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں پیوست ہو گئے تھے اور اب اثر انداز ہوتے ہیں۔

قرآن کا اسی ماہ میں نازل ہونا

رمضان مبارک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی مہینہ کو اللہ نے قرآن پاک کے نازل کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔

چناں چہ خود قرآن میں اس کا ذکر ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ.﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

(رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔)

لیلۃ القدر کا آنا

ایک خصوصیت رمضان کی یہ بھی ہے کہ لیلۃ القدر جو ہزاروں مہینوں سے افضل ہے وہ اسی مہینہ میں آتی ہے۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس مہینہ میں ایک رات آتی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے''۔(۱)

(۱) نسائی:۲۱۰۶،مسند احمد:۱۴۸/۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رمضان

اب ہم رمضان مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معمولات اور جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں؛ تاکہ ان حضرات کے اسوہ پر چلنے کی رغبت پیدا ہو۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ شَدَّ مِئْزَرَهُ ثُمَّ لَمْ يَأْتِ فِرَاشَهُ حَتّٰى يَنْسَلِخَ. »(۱)

(جب رمضان داخل ہوجاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازار کو سخت باندھتے، پھر جب تک رمضان گذر نہ جاتا آپ بستر پر نہ آتے تھے۔)

فائدہ: ازار کو سخت باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ پورے اطمینان سے عبادت میں مشغول ہوجاتے تھے، یہ عبادات میں جدوجہد کرنے سے کنایہ ہے اور بعض علمانے فرمایا کہ یہ عورتوں (ازواج مطہرات) سے علیحدہ رہنے سے کنایہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ بہ یک وقت اس سے دونوں باتیں مراد ہوں۔(۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کا پورا مہینہ عبادت میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہتے تھے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں:

---

(۱) صحیح ابن خزیمہ:۳/۳۴۲،شعب الایمان:۳/۳۱۰،و اسنادہ حسن کما فی اعلاء السنن:۲/۲۱

(۲) شرح مسلم للنووی :۱/۳۷۲،فتح الباری:۴/۲۶۹،نیل الاوطار:۴/۳۶۲

«إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَ كَثُرَتْ صَلٰوتُـهُ وَ ابْتَهَلَ فِيْ الدُّعَاءِ وَأَشْفَقَ مِنْـهُ .» (۱)

(جب رمضان آتا،تو رسول اللہ ﷺ کا رنگ بدل جاتااورآپ کی نماز زیادہ ہوجاتی اور آپ دعا میں گڑگڑاتے اور رمضان کی حرص کرتے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں آپ کثرت کے ساتھ نماز پڑھتے اور دعائیں کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ نماز سے یہاں نفل نماز ہی مراد ہے؛ کیوں کہ فرائض و واجبات تو مقرر ہیں، ان میں نہ کمی ہوسکتی ہے نہ زیادتی اور رنگ بدل جانے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ کثرتِ عبادات کی وجہ سے اور پے در پے روزوں کی وجہ سے آپ کا رنگ متغیر ہوجاتا، جیسا کہ عام طور پر مجاہدہ وریاضت کرنے سے ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ حالت بدل جانے سے کنایہ ہے، مطلب یہ ہے کہ عام دنوں کی حالت سے رمضان میں آپ کی حالت دوسری ہوتی کہ عام دنوں میں اتنی کثرت سے نمازیں اور دعائیں نہ ہوتیں، جیسے رمضان میں ہوتیں، ہمارے محاورے میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں کا رنگ ہی بدل دیا گیا، یعنی حالت بدل گئی اور حرص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں نیکیوں کی حرص کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهُ وَ أَحْيَا لَيْلَهُ وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ. » (۲)

---

(۱) شعب الایمان:۳/۳۱۰

(۲) البخاری:۱۸۸۴، و اللفظ له ،مسلم:۲۰۰۸،نسائی:۱۶۲۱،ابو داوٗد:۱۱۶۸،ابن ماجه:۱۷۵۸،مسند احمد:۲۳۰۰۱،صحیح ابن حبان:۲/۲۵

جب (رمضان کا آخری) عشرہ آجاتا تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی ازار سخت باندھتے اور راتوں کو جاگتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگا دیتے۔

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهَا. » (۱)

(آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آخری عشرہ میں اتنی جدوجہد (عبادت میں) کرتے تھے کہ دوسرے دنوں میں اتنی نہیں کرتے تھے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ خاص طور پر آخری عشرہ میں بڑا مجاہدہ فرمایا کرتے تھے؛ حتیٰ کہ اپنے اہل خانہ کو بھی عبادات کے لیے جگا دیا کرتے تھے۔

(۵) حضرت زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«لَمْ يَكُنِ النَّبِيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم إِذَا بَقِيَ مِنْ رَمَضَانَ عَشَرَةُ أَيَّامٍ يَدَعُ أَحَدًا مِّنْ أَهْلِهِ يُطِيقُ الْقِيَامَ إِلَّا أَقَامَهُ.» (۲)

(جب رمضان کے دس دن باقی رہ جاتے تھے تو آپ اپنے گھر والوں میں سے کسی ایسے شخص کو اٹھائے بغیر نہ چھوڑتے جو اٹھنے کی طاقت رکھتا۔)

---

(۱) مسلم:۲۰۰۹،ترمذی:۲۶۷،ابن ماجه:۱۷۵۷، احمد:۲۳۷۶۶،ابن خزیمه:۳۴۲/۳

(۲) ذکره الحافظ عن الترمذی فی الفتح:۲۶۹/۴،وکذا ذکره الشوکانی فی النیل و المبارکبوری فی تحفة الاحوذی ،ولکنی لم أجده فیه ولا فیما عندی من کتب الحدیث۔

(٦) حضرت عائشہ، ابن عمر وابو سعید خدری، انس رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ وفات تک جاری تھا۔ (۱)

(۷) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُوقِظُ أَهْلَهُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ.» (۲)

(رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اپنے گھر والوں کو جگا دیا کرتے تھے۔)

(۸) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمام اوقات سے زیادہ رمضان میں سخی ہو جاتے تھے، جب جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے، اور جبرئیل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملتے تھے، یہاں تک کہ رمضان گذر جاتا، نبی کریم ﷺ انہیں قرآن سنایا کرتے تھے۔ غرض جب جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے تو آپ تیز ہوا سے بھی زیادہ نیکی میں سخی ہو جاتے تھے۔ (۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ رمضان میں سخاوت وخیرات بہت زیادہ کرتے تھے، دوسرے یہ کہ آپ رمضان میں قرآن پاک کے سنانے میں اہتمام فرماتے تھے،

---

(۱) البخاری: ۱۸۸۵-۱۸۸۷، مسلم: ۲۹۹۲، ترمذی: ۷۲۰، ابن خزیمہ: ۳/۳۴۶، ابن حبان: ۸/۴۲۲

(۲) ترمذی: ۷۲۵، مسند بزار: ۲/۳۰۰، مسند احمد: ۷۴۲

(۳) بخاری: ۱۷۶۹، مسلم: ۴۲۶۸، نسائی: ۲۰۶۸، احمد: ۳۲۵۰، ابن خزیمہ: ۳/۱۹۳، ابن حبان: ۸/۲۲۵

بعض روایات میں ہے کہ آپ ہر سال رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن کا وہ حصہ جو نازل ہو چکا ہوتا سنایا کرتے تھے اور آخری سال آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ (۱)

(۹) ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رمضان کی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے تو آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ مسجد کے ایک کونے میں نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ ایک نے عرض کیا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس قرآن نہیں ہے، یعنی حفظ یاد نہیں ہے اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ پڑھتے ہیں اور یہ لوگ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا کیا، ٹھیک کیا۔ (۲)

(۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے درمیانی حصہ میں باہر نکلے اور مسجد میں نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ چند لوگوں نے بھی نماز پڑھی، صبح لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا اور دوسری رات اس سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے، آپ نے نماز پڑھی اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر صبح اس کا چرچا ہوا، تو تیسری رات بہت لوگ جمع ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات بھی نماز پڑھائی اور لوگوں نے نماز پڑھی اور چوتھی رات اس قدر مجمع ہو گیا کہ مسجد میں گنجائش نہ رہی؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات نہیں آئے اور فجر کی نماز کے لیے تشریف لائے اور نماز کے بعد فرمایا کہ میں تم لوگوں کے یہاں موجود

(۱) مسند عبد بن حمید: ۱/ ۲۱۷، شعب الایمان: ۲/ ۴۱۴

(۲) ابو داؤد: ۱۱۶۹، ابن خزیمہ: ۳/ ۳۳۹، ابن حبان: / ۲۸۲، سنن بیھقی: ۲/ ۴۹۵

ہونے سے بے خبر نہیں تھا؛ مگر مجھے خوف و اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہو جائے اور تم اس کو ادا نہ کر سکو۔(۱)

(۱۱) حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم خود روزہ رکھتے تھے اور اپنے بچوں کو روزہ رکھاتے تھے اور روئی کے کھلونے بنا کر رکھتے، کہ جب وہ روتے تو وہی کھلونے ان کو دے دیتے تھے۔(۲)

فائدہ: حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کی یہ بات اگرچہ عاشوراء کے روزے کے بارے میں آئی ہے اور یہ عاشوراء کا روزہ، رمضان کے روزوں کی فرضیت سے قبل فرض تھا، جب عاشوراء کے فرض روزے کا اس قدر اہتمام ان حضرات میں تھا کہ وہ بچوں کو تک روزہ رکھواتے تھے تو اندازہ کرنا چاہئے کہ رمضان کے روزوں کا کیا حال ہوتا ہوگا اور اس کا کس قدر اہتمام کرتے ہوں گے؟

(۱۲) ایک شخص کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ اس نے رمضان میں شراب پی لیا ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تیری خرابی ہو، ہمارے بچے تک روزہ دار ہیں اور اس پر حد (سزا) جاری کیا اور اسی کوڑے لگوائے۔(۳)

یہ چند روایتیں ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول رمضان میں معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱) البخاري:۱۸۷۳، مسلم:۲۱۷۱، نسائي:۱۵۸۶، ابو داؤد:۱۱۲۶، احمد:۲۳۱۹۴

(۲) البخاري:۱۸۲۴، مسلم:۱۹۱۹

(۳) بخاري تعليقا: وسعيد بن منصور والبغوي موصولاً، كذا في فتح الباري: ۲۰۱/۴

عشرۂ اخیرہ کی فضیلت

ایک طویل حدیث میں جس کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن خطبہ دیا، اور اس میں ایک بات یہ بھی فرمائی:

« وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَّ أَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَّ آخِرُهُ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ. » (۱)

(ماہ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت، اور آخری حصہ آگ سے آزادی وہ خلاصی ہے۔)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رمضان کے تین حصے قرار دیے گئے ہیں: اول، اوسط اور آخر اور یہ دس دس ایام پر مشتمل ہوں گے، یا پہلا اور اوسط حصہ دس دس ایام کا اور آخری حصہ نو ایام کا ہوگا، پھر پہلے عشرے کو رحمت کا دوسرے کو مغفرت کا اور تیسرے کو یعنی آخری حصہ کو دوزخ سے خلاصی کا قرار دیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

”آدمی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن پر گناہوں کا بوجھ نہیں، ان کے لیے شروع ہی سے رحمت و انعام کی بارش ہو جاتی ہے،

---

(۱) أخرجه ابن خزيمة في صحيحه: ۳/۱۹۱، و البيهقي في شعب الايمان: ۳/۲۰۵، عن سلمان الفارسي في حديث طويل

دوسرے وہ لوگ جو معمولی گناہ گار ہیں، ان کے لیے کچھ حصہ روزہ رکھنے کے بعد ان کے روزوں کی برکت اور بدلے میں گناہوں کی معافی ہوتی ہے، تیسرے وہ جو زیادہ گناہ گار ہیں ان کے لیے زیادہ حصہ روزہ رکھنے کے بعد آگ سے خلاصی ہوتی ہے۔(۱)

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی مایۂ ناز کتاب ''معارف الحدیث'' میں اسی شرح کو اختیار فرمایا ہے۔(دیکھو معارف الحدیث: ۱۰۳/۵)

اس تشریح کے مطابق ثابت ہوا کہ رمضان کا آخری عشرہ بڑے سے بڑے گناہ گاروں کے لئے بھی مغفرت کا پیغام لے کر آتا ہے، اس میں رمضان کے آخری عشرہ کی کتنی بڑی فضیلت نکلتی ہے؟ جو لوگ اپنی سال بھر کی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق ہو چکے ہوتے ہیں اگر وہ رمضان میں روزوں اور تراویح اور دیگر عبادات کے ذریعہ جہنم سے آزاد ہونا چاہیں، تو ان کو یہ بات ضرور حاصل ہوگی۔

بہ ہر حال اس حدیث سے آخری عشرہ کی ایک اہم ترین فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ بد بخت سے بد بخت آدمی بھی اگر اس ماہ میں ان نیکیوں میں لگا رہے، تو اس کی بھی نجات ہو جاتی ہے۔

عشرۂ آخرہ کا ذکر قرآن میں

اور اس عشرۂ اخیرہ کی فضیلت کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ (الفجر :۱-۲)

(قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی)

(۱) فضائل رمضان: ص ۱۱

اس میں دس راتوں سے کیا مراد ہے؟ اس میں علما کے متعدد اقوال ہیں۔ان میں سے ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ اس سے مراد رمضان المبارک کے آخری دس دن ہیں۔

چناں چہ روح المعانی میں ہے کہ ابن المنذر رحمہ اللہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد رمضان کے آخری دس دن ہیں اور ضحاک رحمہ اللہ سے بھی یہ نقل کیا گیا ہے؛ بل کہ علامہ تبریزی رحمہ اللہ نے اس بات پر اتفاق کا دعویٰ کیا ہے کہ اس سے یہی دس (رمضان کے دس دن) مراد ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔(۱)

اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ضحاک سے اپنی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے۔(۲)

اس قول پر رمضان کے عشرۂ اخیرہ کی فضیلت یوں ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان دس دنوں کی قسم کھائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کی قسم کھانا ان ایام کی فضیلت کی دلیل ہے۔

---

(۱) روح المعاني:۳۰/۱۳۷

(۲) تفسير قرطبي: ۲۰/۳۹

رمضان کے مخصوص اعمال

رمضان میں اگر چہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی عبادات کا اہتمام ہونا چاہئے اور ان اعمال وعبادات میں میں سے جن اعمال وعبادات کو رمضان مبارک کے ساتھ خصوصیت کا تعلق ہے ان کا اہتمام والتزام بھی خصوصی طریقے پر ہونا چاہئے اور وہ چار اعمال ہیں:

(۱) صوم یعنی روزہ

(۲) نماز تراویح

(۳) آخری عشرہ کا اعتکاف

(۴) تلاوت

لہذا اتمام عبادات واعمال صالحہ میں اضافہ اوران کا اہتمام والتزام کرنا اور بالخصوص ان چار عبادات کا اہتمام کرنا رمضان کو صحیح طریقے پر گذارنے کے لیے ضروری ہے، اب ہم ان چار عبادات کا الگ سے ذکر کرتے ہیں۔

روزے کا بیان

روزے کی فرضیت واہمیت

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. ﴾ (البقرۃ: ۱۳۸)

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے، تا کہ تم متقی بن جاؤ۔)

اس آیت سے روزے کی فرضیت واہمیت صاف ظاہر ہے، فرضیت تو اللہ کے یہ فرمانے سے معلوم ہوئی کہ تم پر روزے لکھ دیئے گئے ہیں اور اہمیت کا پتہ اس طرح چلا کہ روزے کی فرضیت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ تقویٰ ہی کی بنیاد پر انسان اللہ کے نزدیک مکرم ومقدس بنتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. ﴾ (الحجرات: ۱۳)

(اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔)

اور جو چیز کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرنے والی ہو، وہ اس لحاظ سے کہ تقویٰ کا سبب و باعث ہے کس قدر اہم ہے۔

نیز اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اکثر حضرات کے نزدیک

صوم، اسلام کے ارکان میں سے زکاۃ کے بعد سب سے اہم عبادت ہے اور بعض علما کے نزدیک نماز کے بعد سب سے زیادہ اہم روزہ ہے اس کے بعد زکاۃ کا درجہ ہے اور امام محمد رحمہ اللہ نے اسی کے پیش نظر اپنی کتاب ''الجامع الصغیر'' اور ''الجامع الکبیر'' میں نماز کے بعد صوم کا بیان لکھا ہے۔(۱)

روزے کی فضیلت

اس اہمیت کی وجہ سے روزے کی بڑی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے۔

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من صام رمضان ايمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه. ومن قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه. » (۲)

(جو شخص ایمان کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر رمضان کے روزے رکھتا ہے، اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ اور جو لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر عبادت کرتا ہے، اس کے بھی تمام گزشتہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قال الله تعالىٰ : كل عمل ابن آدم له الا الصيام ، فانه

---

(۱) دیکھو فتح القدير:۱/۳۰۰، حاشية الطحطاوي على المراقي ۱/۴۱۹، البحر الرائق:۲/۲۸۶

(۲) البخاري:۱۷۶۸، مسلم:۱۲۶۸، نسائي:۲۱۸۳، ابو داؤد:۱۱۶۵، احمد:۱۹۰۰

لي وأنا أجزي به. والصيام جنة، واذا كان يوم صوم احدكم فلايرفث ولايصخب، فان سابه احداوقاتله فليقل انى امرأ صائم، والذى نفس محمدبيده لخلوف فم الصائم اطيب عندالله من ريح المسک، للصائم فرحتان يفرحهما، اذا افطرفرح واذالقى ربه فرح بصومه.»

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزہ کے، کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزادوں گا، اور روزہ (جہنم سے بچاؤ کے لیے) ڈھال ہے اور جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہوتو بے حیائی کی باتیں نہ کرے اور نہ چیخے، اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑائی کرے، تو کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے بلاشبہ روزہ دار کی منہ کی بُو اللہ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ بہتر ہے، اور روزہ دار کو دو فرحتیں ملتی ہیں: ایک اس وقت جب وہ افطار کرتا ہے، اور دوسرے اس وقت جب وہ اللہ سے ملے گا تو وہ اپنے روزہ سے خوش ہوگا۔)(۱)

(۳) حضرت سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ان فى الجنة بابا يقال له الريان، يدخل منه الصائمون يوم القيامة، لايدخل منه احد غيرهم، يقال اين الصائمون؟ فيقومون لايدخل منه احدغيرهم، فاذادخلوااغلق، فلم يدخل منه احد.»(۲)

(۱) البخاري: ۱۷۷۱، مسلم: ۱۹۴۷، نسائي: ۲۱۸۶، احمد: ۷۳۶۸

(۲) البخاري: ۱۷۶۳، مسلم: ۱۹۴۷

(جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام باب الریان ہے، اس سے قیامت کے دن روزے دار داخل ہوں گے، اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس سے داخل نہ ہوگا، کہا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ وہ کھڑے ہوں گے ان کے علاوہ کوئی اور اس سے داخل نہ ہو سکے گا، جب یہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا، پس کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔)

(۴) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام ریان ہے، روزے دار اسی سے بلائے جائیں گے، جو روزہ رکھنے والا ہوگا وہ اسی سے داخل ہوگا اور جو اس سے داخل ہوگا وہ کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔(۱)

(۴) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''جو اللہ کے راستہ میں روزہ رکھتا ہے اس کو دوزخ سے ستر برس کی مسافت کی مقدار دور رکھے گا''۔(۲)

(۵) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

« من صام رمضان وعرف حدوده وتحفظ مما كان ينبغي له ان يتحفظ فيه كفر ماقبله. »(۳)

---

(۱) ترمذي:۷۶۶، نسائي:۲۲۰۴، ابن ماجه:۱۶۳۰، احمد:۲۱۷۷۵

(۲) البخاري:۲۶۲۸، مسلم:۱۹۴۸، نسائي:۲۲۱۹، ترمذي:۱۵۴۸، ابن ماجه: ۱۷۰۷، احمد:۱۷۷۸

(۳) مسند احمد:۱۱۵۴۱، ابن حبان:۸/۲۱۹

(جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کے حدود کو جانا، اور ان باتوں سے اپنے کو محفوظ رکھا جن سے بچنا مناسب ہے، تو یہ روزہ اس کے گذشتہ گناہوں کا کفارہ بنا دیا جاتا ہے۔)

ان احادیث سے روزے کے فضائل معلوم ہوئے اور اس پر بڑے بڑے وعدوں کا علم ہوا، لہذا اس فضیلت سے کسی مسلمان کو محروم نہیں ہونا چاہئے۔

روزے کی حقیقت اور قسمیں

روزے کو عربی میں ''صوم'' کہا جاتا ہے، اور صوم کے معنیٰ ''امساک'' (رک جانے) کے ہیں، اور شریعت میں صوم کی حقیقت یہ ہے کہ پورا دن کھانے، پینے اور بیوی سے مباشرت کرنے سے رک جائے۔(۱)

علما نے فرمایا ہے کہ روزے کی تین قسمیں ہیں: ایک عوام الناس کا روزہ، دوسرے خواص کا روزہ اور تیسرے اخص الخواص کا روزہ۔

(۱) روزے کی پہلی قسم

عوام کا روزہ یہ ہے کہ صرف کھانے پینے اور جماع کرنے سے اپنے آپ کو روک لیا جائے، باقی دیگر اللہ کی منع کردہ چیزوں سے باز نہ آئے، یہ سب سے کم درجہ کا روزہ ہے۔ اس سے روزہ ادا تو ہو جاتا ہے؛ مگر اس پر ان فضائل و برکات کا ترتب نہیں ہوتا، جن کا ذکر احادیث میں گذرا ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ . »(۲)

---

(۱) التعریفات للجرجانی: ۱۷۸، انیس الفقهاء: ۱/ ۱۳۷

(۲) البخاری: ۱۷۷۰، ترمذی: ۶۴۱، ابو داؤد: 2015

(جو شخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے، اللہ کو کچھ حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔)

اور بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ جو جہل اور جہل پر عمل کو نہ چھوڑے، اس کے کھانے پینے کو چھوڑنے میں اللہ کی کچھ حاجت نہیں۔(۱)

اس حدیث کے تحت علامہ ابن عبدالبر مالکی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جو ان باتوں (یعنی جھوٹ وغیرہ) کا ارتکاب کرے، اس کے روزے پر ثواب نہ دیا جائے گا۔ اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ روزے کی مشروعیت سے صرف بھوک و پیاس مقصود نہیں ہے؛ بل کہ اس سے مقصود شہوتوں کو توڑنا اور نفس امارہ کو نفس مطمئنہ کا مطیع بنانا ہے۔(۲)

الغرض! کھانا پینا چھوڑنے سے اگرچہ روزہ ادا ہو جاتا ہے اور ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے؛ مگر اس پر ثواب اور وہ فضائل مرتب نہیں ہوتے جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) روزے کی دوسری قسم

دوسری قسم خواص کا روزہ ہے، وہ یہ ہے کہ کھانے پینے اور جماع سے رکنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعضا: ہاتھ، پیر، زبان، آنکھ، کان، وغیرہ کو بھی اللہ کی منع کردہ چیزوں سے محفوظ رکھا جائے، یعنی شریعت کے خلاف کوئی بات ان اعضا سے صادر ہونے نہ دیا جائے۔

شریعت میں یہ روزہ مطلوب ہے، جیسا کہ اوپر کی حدیثوں سے معلوم ہوا۔ اور اوپر پیش کردہ اس حدیث میں اسی طرف رہ نمائی کی گئی ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

---

(۱) ابن ماجہ: ۱۶۷۹، احمد: ۹۴۶۳

(۲) فتح الباری: ۴/۱۱۷

«من صام رمضان وعرف حدوده وتحفظ مما كان ينبغي له ان يتحفظ فيه كفر ماقبله.»

(جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کے حدود کو جانا، اور ان باتوں سے اپنے کو محفوظ رکھا جن سے بچنا مناسب ہے، تو یہ روزہ اس گذشتہ گناہوں کا کفارہ بنا دیا جاتا ہے۔)

اس سلسلہ میں ایک عبرت ناک حدیث ملاحظہ کیجیے، وہ یہ کہ دو عورتوں نے روزہ رکھا اور پیاس کی شدت سے مرنے کے قریب ہوگئیں، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلوایا، اور جب وہ آئیں تو آپ نے ان کو ایک پیالے میں قے کرنے کے لیے فرمایا ان عورتوں نے جب قے کیا تو اس میں خون، پیپ اور کچا گوشت نکل آیا، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«ان هاتين صامتا عما احل الله و افطرتا على ما حرم الله عزوجل عليهما، جلست احداهما الى الاخرى فجعلتا تأكلان لحوم الناس.» (۱)

(ان عورتوں نے ان چیزوں سے تو روزہ رکھا جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور ان چیزوں سے روزہ کو توڑ دیا جن کو اللہ نے حرام کیا ہے، ان میں سے ایک دوسری کے پاس بیٹھ کر لوگوں کے گوشت کھانے لگیں، یعنی غیبت کرنے لگیں۔)

الغرض اپنے اعضاو جوارح کو ہر قسم کے گناہوں سے بچانے کی فکر کرتے رہنا

(۱) مسند احمد: ۲۲۵۴۵، مسند ابو یعلیٰ: ۳/۱۴۶، قلت: اسناده ضعيف

اور روزے کی حدود کا خیال رکھنا مطلوبہ روزہ کے لیے نہایت ضروری ہے۔

روزے کی تیسری قسم

تیسری قسم کا روزہ اخص الخواص کا روزہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی تمام برائیوں اور گندگیوں سے پاک وصاف کرلیا جائے، مثلاً حسد، بغض، کینہ، تکبر، ریا کاری وغیرہ امراض قلبی سے پاک وصاف ہوجائے۔

یہ روزہ بھی شرعاً مطلوب ہے، چناں چہ بعض حدیثوں میں یہ آیا ہے:

یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور مواساۃ وہم دردی وغم خواری کا مہینہ ہے۔ (۱)

حاصل یہ کہ پہلا روزہ ناقص ہے، دوسرا کامل اور تیسرا اکمل، ہم کو کوشش کرنا چاہیے کہ ہم اخص الخواص یا کم از کم خواص کے روزے کی طرح روزہ رکھیں، صرف پیاسے، بھوکے نہ رہیں، جیسے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«رب صائم ليس له من صيامه الا الجوع ورب قائم ليس له من قيامه الا السهر.» (۲)

(بہت سے روزے دار ایسے ہیں جنہیں سوائے بھوک کے کچھ حاصل نہیں، اور بہت سے رات بھر نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جنہیں سوائے رات گذاری کے کچھ حاصل نہیں۔)

ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

---

(۱) اخرجه ابن خزيمة: ۳/۱۹۱، والبيهقي في شعب الايمان: ۳/۲۰۵، عن سلمان الفارسي في حديث طويل.

(۲) ابن ماجه: ۱۶۸۰، احمد: ۳۹۰۸.

« رب صائم حظه من صيامه الجوع والعطش ورب قائم حظه من قيامه السهر . »(۱)

(بہت سے روزہ دار ہیں جن کا نصیب بھوک و پیاس ہے، اور بہت سے رات بھر نماز پڑھنے والے ہیں جن کا حصہ رات گذاری ہے۔)

ہم نے اس جگہ بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے، ورنہ یہ موضوع بڑا طویل ہے؛ مگر عاقل کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔

(۱) احمد:۸۵۰۱

روزے کے احکام و مسائل

روزہ کن لوگوں پر فرض ہے؟

ہر اس مرد و عورت پر رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے جو مسلمان ہو، بالغ ہو اور عاقل ہو۔(۱)

البتہ ان عذروں میں سے کوئی عذر لاحق ہو اس کو جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور بعد میں ان کی قضا کر لے۔ اور وہ اعذار یہ ہیں:

(۱) سفر میں ہونا، یاد رہے کہ سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت ہو اور آرام و راحت کا سفر ہو، تو روزہ رکھ لینا اچھا ہے۔

(۲) روزہ رکھنے سے کسی مرض و بیماری کے پیدا ہو جانے سے یا بڑھ جانے یا مر جانے کا خوف ہو۔

نوٹ: مگر یاد رہے کہ محض دل میں اس طرح کا خیال جما لینے سے روزہ چھوڑنا جائز نہ ہوگا؛ بل کہ کسی حاذق وثقہ متقی مسلمان ڈاکٹر وطبیب نے اگر ایسا کہا ہے، تو اس کا اعتبار ہوگا۔

(۳) ایسی کم زوری ہے کہ یہ روزہ نہ رکھ سکتا ہو اور اسی میں وہ بھی داخل ہے کہ کسی کو جہاد درپیش ہو اور روزہ رکھنے سے کم زوری کا خوف ہو۔

(۴) دشمن کی طرف سے جان یا بدن کا خوف ہو، مثلاً کہے کہ اگر تو روزہ رکھے گا

---

(۱) فتح القدیر:۲/۳۰۲، البحر الرائق:۲/۲۷۶

تو ہم تیری جان لے لیں گے یا ہاتھ کاٹ دیں گے وغیرہ۔

(۵) عورت کو حیض یا نفاس ہو۔

(۶) عورت کو حالت حمل میں روزہ رکھنے سے اپنے یا بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہونا۔

(۷) عورت اپنے یا کسی اور کے بچے کو دودھ پلانے کے دنوں میں ہو اور روزہ رکھنے سے بچے کو نقصان ہونے کا خوف ہو۔

(۸) سخت بھوک و پیاس کا ہونا۔

(۹) بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی سکت نہ ہونا۔(۱)

ان تمام اعذار کی وجہ سے رمضان کے روزے ان دنوں میں چھوڑ دینا جائز ہے؛ لیکن عذر کے ختم ہو جانے پر ان روزوں کی قضا کرنا لازم ہے، مثلاً مسافر سفر سے واپسی پر، عورت حیض ونفاس سے پاک ہونے کے بعد اور مریض صحت یاب ہونے کے بعد، اسی طرح مجاہد جہاد سے واپسی پر ان روزوں کی قضا کرے گا۔

روزہ کب صحیح ہوگا؟

روزہ اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ تین شرطیں پائی جائیں:

(۱) روزہ رکھنے والا مسلمان ہو، لہذا کافر کا روزہ صحیح نہیں۔

(۲) روزہ دار حیض ونفاس سے خالی ہو، لہٰذا حیض ونفاس والی عورت کا روزہ صحیح نہیں ہوگا؛ بل کہ ان عورتوں کو روزہ رکھنا جائز نہیں ہے؛ بل کہ حیض ونفاس کے بعد ان کے روزوں کی قضا کرنا چاہیے۔

ہاں! مرد کو حالت جنابت میں روزہ رکھنا درست ہے، اس کا روزہ صحیح ہو جائے گا،

---

(۱) البحر الرائق:۲/۳۰۲-۳۰۳، البدائع:۲/۹۴

البتہ بے عذر نہ نہانا گناہ کی بات ہے۔

(۳) روزے کی نیت کرنا، یعنی دل سے روزہ رکھنے کا ارادہ کرنا، لہذا اگر کوئی بلا نیت روزہ رکھے، تو اس کا روزہ نہ ہوگا۔(۱)

مگر یہاں یاد رہے کہ روزہ کی نیت کا زبان سے ادا کرنا ضروری نہیں؛ بل کہ دل سے ارادہ کرنا ضروری ہے کہ میں فلاں دن کا روزہ رکھتا ہوں۔

نیت کے ضروری مسائل

(۱) نیت رمضان کے روزوں کی ہر روز الگ الگ کرنا چاہئے، ایک ہی دن پورے رمضان کے روزوں کی نیت کرنا کافی نہیں۔(۲)

(۲) ہر قسم کے روزے میں افضل یہی ہے کہ طلوع فجر ہی پر نیت کرلے؛ لیکن اگر کسی نے اس وقت نہیں کی تو رمضان کے ادائی روزوں میں اس قدر گنجائش ہے کہ آدھے دن یعنی زوال سے پہلے تک بھی نیت کرلینا درست ہے، اس کے بعد نیت کرنا درست نہیں۔(۳)

(۳) رمضان کے ادائی روزوں کی نیت میں فرض کی تخصیص نہ کرنا بھی درست ہے، یعنی صرف یہ نیت کرلیا کہ میں روزہ رکھتا ہوں تو رمضان کا روزہ ادا ہوجائے گا۔(۴)

روزے کے فرائض

روزے میں تین چیزیں فرض ہیں:

(۱) صبح صادق کے طلوع ہونے سے آفتاب کے غروب ہونے تک کچھ نہ کھانا۔

---

(۱) فتح القدير:۳۰۲/۲،البحر الرائق:۲۷۷/۲،نور الايضاح:۱۰۰

(۲) البدائع:۸۵/۲،عالمگیری:۱۹۵/۱

(۳) فتح القدير:۳۰۳/۲،البدائع:۸۵/۲،مراقی الفلاح:۲۳۲

(۴) البدائع:۸۴/۲،البحر الرائق:۲۸۰/۲

(۲) طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک کچھ نہ پینا اور جو چیز کھانے اور پینے کے مشابہ ہو وہ بھی اسی میں داخل ہے، مثلاً کان یا ناک میں تیل ڈالنا کہ اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، تفصیل آگے آئے گی۔

(۳) صبح صادق سے غروب آفتاب تک جماع اور ان چیزوں سے رک جانا جن سے عادۃً منی نکل جاتی ہے۔(۱)

روزے کی سنتیں اور مستحبات

روزے کو اس کی تمام سنتوں اور آداب کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، تاکہ وہ عنداللہ مقبول و منظور ہو، جیسے ہم اپنے کسی بڑے کو کوئی چیز پیش کرنا چاہتے ہیں تو اس کی کوشش کرتے ہیں کہ بہتر سے بہتر چیز پیش کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دربار عالی شان میں جس سے عظیم کوئی نہیں، عبادت بھی ایسی پیش کرنا چاہیے جو اس کے دربار کے شایان شان ہو، اس لیے حضرات فقہا نے روزے کی سنتیں اور اس کے آداب کا ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

(۱) ایک ادب یہ ہے کہ ہر گناہ سے بچے، کیوں کہ روزہ کی اصلیت اسی سے حاصل ہوتی ہے، قرآن پاک میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

چناں چہ ارشاد ہے:

﴿ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. ﴾ (البقرۃ: ۱۳۸)

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کیے گئے تھے؛ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔)

اس سے معلوم ہوا کہ روزے کا اصل مقصد تقویٰ ہے اور تقویٰ گناہوں سے

---

(۱) نور الایضاح:۱۰۰

بچنے کا نام ہے۔

نیز اوپر حدیث گزر چکی کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو جھوٹ اور جھوٹ پر عمل کو نہ چھوڑے، اللہ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی حاجت نہیں۔

نوٹ: یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ سے بچنا تو ہر حال میں فرض ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنا ہر حال میں حرام ہے اور ہم نے جو اس کو سنتوں میں شمار کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹے گا نہیں، جیسا کہ کسی روزے کے فرض کو چھوڑنے سے ٹوٹ جاتا ہے، اس لحاظ سے اس کو سنت کہا گیا ہے ورنہ گناہ سے بچنا-قطع نظر روزے کی حالت کے- فرض ہے۔

(۲) روزے کی ایک سنت یہ ہے کہ دوسرے دنوں کے اعتبار سے روزے کے دنوں میں زیادہ عبادت کی جائے، خصوصاً رمضان کے اخیر عشرہ میں اس کا زیادہ اہتمام کیا جائے؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا فرماتی ہیں کہ جب رمضان داخل ہوجاتا تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی ازار کو سخت باندھ لیتے، پھر جب تک رمضان گذر نہ جاتا آپ بستر پر نہ آتے تھے۔ اور دوسری حدیث میں حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا ہی فرماتی ہیں کہ جب رمضان آتا تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہوجاتی اور آپ دعا میں گڑگڑاتے اور رمضان کی حرص کرتے ۔ یہ دونوں حدیثیں اوپر باحوالہ گزر چکی ہیں۔

(۳) ایک سنت یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں شب بیداری کریں اور اس میں عبادت کا اہتمام کریں؛ جیسا کہ ابھی حدیث گزری۔

(۴) ایک سنت یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا جائے، حضرت عائشہ، ابن عمر و ابوسعید خدری، انس رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ سے

مروی ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ وفات تک جاری تھا۔ یہ حدیث بھی اوپر گزر گئی۔

(۵) روزے کی سنت یہ بھی ہے کہ سحری کی جائے، حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« تَسَحَّرُوْا فَإِنَّ فِي السُّحُوْرِ بَرَكَةً . » (۱)

(سحری کھایا کرو؛ کیوں کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔)

(۶) ایک سنت یہ کہ سحری آخری وقت میں کی جائے اور افطار اول وقت پر کیا جائے، یعنی سحری ایسے وقت کی جائے کہ اس کے بعد فجر ہو جائے، اگر کوئی شخص مثلاً رات ہی میں سحری کر کے سو جائے گا، تو بھی سحری ہو جائے گی؛ مگر ایسا کرنا سنت کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح افطار سورج غروب ہوتے ہی کر لیا جائے، وقت ہو جانے کے بعد بھی خوا مخواہ تاخیر کرنا سنت کے خلاف ہے۔

سحری کے متعلق حدیث میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ سحری کھائی، پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ سحری کھانے اور اذان کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پچاس آیتیں پڑھنے کے بہ قدر فاصلہ تھا۔ (۲)

اس حدیث سے اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا معمول سحری کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ آپ آخری وقت میں سحری کرتے تھے۔

---

(۱) البخاری:۱۷۸۹، مسلم:۱۸۳۵، نسائی:۲۱۱۷، ابن ماجه:۱۶۸۲، احمد:۱۱۵۱۲

(۲) البخاری:۱۷۸۷، مسلم:۱۸۳۷، ترمذی:۶۳۸، نسائی:۲۱۲۶، ابن ماجه:۱۶۸۴، احمد:۲۰۶۰۳

اور افطار کے متعلق ایک حدیث میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ.»

(لوگ خیر پر باقی رہیں گے جب تک کہ وہ افطار میں جلدی کریں گے۔)(۱)

اور ایک حدیث میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِي بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْإِفْطَارَ وَ أَخَّرُوا السُّحُورَ.»

(میری امت خیر پر رہے گی جب تک کہ وہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرے گی۔)(۲)

روزے کو توڑنے والی چیزیں

یاد رکھنا چاہئے کہ روزہ کو توڑنے والی چیزیں دو قسم کی ہیں: (۱) ایک وہ جن سے صرف قضا لازم آتی ہے، (۲) دوسری وہ جن سے قضا اور کفارہ دونوں لازم آتے ہیں۔

اس کا قاعدہ یہ ہے کہ قضا و کفارہ دونوں اس وقت لازم آتے ہیں جب کہ رمضان کے روزے میں جس کی نیت سحری کے وقت سے ہی کر لیا ہو، جان بوجھ کر بلا عذر صورۃً و معنےً کوئی چیز کھا لے یا پی لے یا جماع کر لے۔ (۳)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ صورۃً کھانے پینے سے مراد یہ ہے کہ منہ کے ذریعہ معدہ میں چیز پہنچائی جائے اور معنےً کھانے پینے سے مراد یہ ہے کہ ایسی چیز معدہ میں

---

(۱) البخاری: ۱۸۲۱ مسلم: ۱۸۳۸، ترمذی: ۶۳۵، ابن ماجہ: ۱۶۸۷، احمد: ۲۱۷۳۹، مالک: ۵۶۱

(۲) مسند احمد: ۲۰۳۵۰

(۳) بدائع: ۲/۹۷-۹۸، مراقی الفلاح: ۲۴۱، شامی: ۲/۴۱۰

پہنچائی جائے ، جو غذا کی قسم کی ہو یا دوا کی قسم کی ہو، اور صورۃً جماع سے مراد یہ ہے سامنے کے یا پیچھے کے راستے سے صحبت کی جائے، اور معنیً جماع سے مراد ایسا کام کیا جائے جس سے جماع کی لذت حاصل ہو جائے، پس جب دونوں طرح سے کھانا پینا اور جماع ہو، تو اس کی وجہ سے قضا و کفارہ دونوں لازم ہوتے ہیں۔

اور صرف قضا اس وقت لازم آتی ہے جب کہ کھانا پینا اور جماع صرف صورۃً پائے جائیں یا صرف معنیً پائے جائیں، لہذا اگر منہ سے کوئی چیز کھایا پیا؛ مگر وہ چیز غذا یا دوا میں استعمال نہیں ہوتی، مثلاً کنکر کھا گیا، تو اس سے صورۃً کھانا پایا گیا؛ مگر معنیً کھانا نہیں پایا گیا اس لیے روزہ ٹوٹ تو جائے گا اور قضا بھی لازم ہوگی؛ لیکن کفارہ لازم نہ ہوگا، یا معدہ میں ایسی چیز پہنچایا جو نفع بخش ہے اور غذا یا دوا میں استعمال کی جاتی ہے؛ مگر یہ منہ سے نہیں؛ بل کہ ناک سے یا کسی اور جگہ سے پہنچائی تو اس سے معنیً کھانا تو پایا گیا؛ مگر صورۃً کھانا نہیں پایا گیا، لہذا اس سے بھی صرف قضا لازم ہوگی کفارہ نہیں۔ اس کے بعد ہم یہاں ان دونوں قسموں کی چند جزئیات لکھتے ہیں:

پہلی قسم

وہ باتیں جن سے قضا و کفارہ دونوں لازم آتے ہیں:

(۱) رمضان شریف کے مہینے میں روزہ رکھ کر ایسی چیزیں قصداً کھانا یا پی لینا جو غذا یا دوا یا لذت کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔(۱)

(۲) قصداً ہم بستری کرنا، چاہے سامنے کی راہ سے ہو یا پیچھے سے ہو، اور خواہ منی نکلے یا نہ نکلے، اور یہ قضا و کفارہ صحبت کرنے والے پر بھی اور جس سے صحبت کی

(۱) در مختار و شامي:۲/ ۴۰۹-۴۱۰

جائے اس پر بھی واجب ہے۔(۱)

(۳) فصد کھلوائی یا سرمہ لگایا یا اور کوئی ایسا کام کیا جس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ مگر اس نے یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا قصداً کھالیا، یا پی لیا تو ان صورتوں میں بھی قضا کفارہ دونوں واجب ہیں۔(۲)

(۴) بارش کا پانی روزے دار کے منہ میں پڑ گیا اور وہ اس کو نگل گیا تو اس سے بھی قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔(۳)

(۵) اگر گنے کا رس چوسا تو اس پر قضا و کفارہ دونوں واجب ہیں، کیوں کہ گنا اسی طرح کھایا جاتا ہے۔(۴)

(۵) اگر روزے کی حالت میں بیڑی یا سگریٹ یا حقہ پئے، تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس سے قضا لازم ہوگی اور بعض علما کے نزدیک قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے، علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔(۵)

دوسری قسم

وہ چیزیں جن سے صرف قضا لازم آتی ہے:

(۱) کسی نے زبردستی روزہ دار کے منہ میں کوئی چیز ڈال دی اور وہ حلق سے اتر گئی۔

(۲) روزہ یاد تھا اور کلی کرتے وقت بلا قصد حلق میں پانی اُتر گیا۔

---

(۱) در مختار و شامي:۲/ ۴۰۹-۴۱۰

(۲) در مختار و شامي:۲/ ۴۰۹-۴۱۰، مراقی الفلاح:۲۴۱

(۳) مراقی الفلاح:۲۴۱

(۴) بدائع الصنائع:۲/ ۹۹

(۵) مراقی الفلاح:۲۴۱، عمدة الرعایه علی هامش شرح الوقایة:۱/ ۲۴۶

(۳) قے ہوئی اور قصداً حلق میں لوٹا لی۔

(۴) قصداً منہ بھر کے قے کر ڈالی۔

(۵) کنکری یا پتھر کا ٹکڑا یا گٹھلی یا مٹی کا یا کاغذ کا ٹکڑا قصداً نگل لیا۔

(٦) دانتوں میں اٹکی ہوئی چیز کو زبان سے نکال کر نگل لیا، جب کہ وہ چنے کے دانے کے برابر یا اس سے زیادہ ہو اور اگر منہ سے باہر نکال کر پھر نگل لیا تو چاہے چنے سے کم ہو یا زیادہ ہر صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۷) کان میں تیل ڈالا۔

(۸) ناس لیا۔

(۹) دانتوں میں سے نکلے ہوئے خون کو نگل لیا، جب کہ خون تھوک پر غالب ہو۔

(۱۰) بھولے سے کچھ کھا پی لیا اور یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا پھر قصداً کھایا پیا۔

(۱۱) یہ سمجھ کر کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی سحری کھالی، پھر معلوم ہوا کہ صبح صادق ہو چکی تھی۔

(۱۲) رمضان شریف کے سوا اور دنوں میں کوئی روزہ قصداً توڑ ڈالا۔

(۱۳) ابر یا غبار کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا روزہ افطار کر لیا، حالاں کہ دن ابھی باقی تھا۔

ان سب صورتوں میں صرف ان روزوں کی قضا رکھنی پڑے گی، جن میں ان باتوں میں سے کوئی پیش آئی ہے اور کفارہ ان میں واجب نہیں۔ (۱)

کن چیزوں سے روزہ مکروہ ہوتا ہے؟

روزہ میں بعض چیزیں مکروہ ہیں، ان کے ارتکاب سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں؛ مگر

(۱) مراقی الفلاح: ۲۴۴-۲۴۷، بدائع الصنائع: ۲/ ۹۹-۱۰۱، عالمگیری: ۱/ ۲۰۲-۲۰۵

اس میں نقص و کمی آجاتی ہے، لہذا ان باتوں سے بھی بچنے کی کوشش کرنا چاہیے، وہ چیزیں یہ ہیں:

(۱) گوند یا کوئی اور چیز منہ میں ڈالے رکھنا یا چبانا اور اسی میں کوئلہ یا منجن یا پیسٹ سے دانت صاف کرنا بھی داخل ہے۔

(۲) کوئی چیز مثلاً سالن وغیرہ چکھنا، البتہ جس عورت کا خاوند سخت اور بدمزاج ہو اسے زبان کی نوک سے سالن کا نمک چکھ لینا درست ہے۔

(۳) استنجے میں زیادہ پاؤں پھیلا کر بیٹھنا یا دھونے میں مبالغہ کرنا۔

(۴) کلی یا ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرنا۔

(۵) منہ میں تھوک جمع کر کے نگلنا۔

(۶) بے قراری و گھبراہٹ ظاہر کرنا۔ (یعنی روزے کی وجہ سے)

(۷) بیوی سے بغل گیر ہونا یا بوسہ لینا بشرطے کہ انزال کا خوف ہو۔

(۸) ایسا کام کرنا جس سے کم زوری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، جس کی بنا پر روزہ توڑ ڈالنا پڑے، مثلاً کھیل کود، یا گھومنا پھرنا وغیرہ، اسی طرح روٹی وغیرہ پکانے والے کا اپنے اس کام میں اس طرح لگنا جس سے روزہ توڑنے تک نوبت پہنچے، یہ جائز نہیں۔(۱)

اسی طرح یہ باتیں بھی روزے میں مکروہ ہیں:

(۱) غیبت کرنا (۲) جھوٹ بولنا (۳) گالی گلوچ کرنا (۴) لڑائی جھگڑا کرنا (۵) گانا، بجانا، گانا سننا، خواہ ریڈیو کے ذریعہ ہو یا T.V. کے ذریعہ یا کسی آدمی سے۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے، کیوں کہ اوپر ذکر کردہ احادیث سے معلوم ہوا کہ گناہ کے کام سے روزہ میں فرق آجاتا ہے۔

---

(۱) عالمگیری:۱/۱۹۹-۲۰۰،مراقی الفلاح:۲۴۸-۲۴۹در مختار مع الشامی:۲/۴۱۶-۴۱۹،بحر الرائق:۲/۳۰۳-۳۰۴

وہ چیزیں جو روزے میں مکروہ نہیں ہیں

بعض باتیں ایسی ہیں جو روزے میں جائز ہیں، مکروہ بھی نہیں، اور وہ یہ ہیں:

(۱) سرمہ لگانا۔

(۲) مسواک کرنا، خواہ تر ہو یا سوکھی ہو؛ بل کہ مسواک کرنا روزے میں بھی سنت ہے۔

(۳) بدن پر یا سر میں تیل ڈالنا یا ملنا۔

(۴) ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنا یا کپڑا اتر کر کے سر پر باندھنا۔

(۵) خوش بو لگانا یا خوش بو سونگھنا۔

(۶) بھول کر کچھ کھا پی لینا۔

(۷) خود بخود قے ہو جانا۔

(۸) جمع کیے بغیر ویسے ہی اپنا تھوک نگلنا۔

(۹) بلا قصد مکھی یا دھویں کا حلق سے اُتر جانا۔

(۱۰) احتلام ہو جانا۔(۱)

روزے کے چند جدید مسائل

نئے حالات و نئے دور میں فقہیات کا باب بھی وسیع ہوتا جاتا ہے، اور اس کے دامن میں نئے نئے مسائل کو جگہ لینی پڑتی ہے، چناں چہ روزہ کے سلسلہ میں بھی متعدد نئے مسائل پیدا ہو گئے، جن کا جواب فقہا کی ذمے داری ہے، یہاں ہم اہم اہم چند مسائل کا ذکر کرتے ہیں، اس سلسلہ میں احقر کی کتاب ''رمضان اور جدید مسائل'' کی طرف مراجعت کی جائے۔

---

(۱) المراقی: ۳۴۹، البحر: ۲/ ۲۰۱-۲۰۲، عالمگیری: ۱/ ۱۹۹-۲۰۱، در مختار و شامی: ۲/ ۳۹۶

(۱) روزہ میں انجکشن کا کیا حکم ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگر عام قسم کی بیماریوں کا انجکشن لیا جائے، جو رگوں کے ذریعہ دیا جاتا ہے، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور اگر ایسا انجکشن لیا جائے جو بلا واسطہ گوشت میں دیا جاتا ہو یا اور کسی منفذ اصلی سے پہنچایا جاتا ہو، تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، جیسے ذیابیطس کے لئے انسولین اور کتا کاٹنے پر دیا جانے والا انجکشن گوشت میں دیا جاتا ہے۔

(۲) روزہ کی حالت میں بدن میں خون یا گلوکوز چڑھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن بلا کسی سخت ضرورت کے ایسا نہیں کرنا چاہئے، ورنہ روزہ مکروہ ہوگا۔

(۳) اگر عورت روزہ کی حالت میں اپنی شرم گاہ میں لوپ داخل کرے، تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر لوپ پہلے داخل کر چکی ہو اور پھر روزہ رکھے تو اس سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آئے گی۔

(۴) روزہ کی حالت میں بدن سے خون نکالنا جائز ہے، بشرطے کہ اس کی وجہ سے ایسی کم زوری پیدا نہ ہو، جو روزہ توڑنے پر مجبور کردے۔

(۵) روزہ میں اگر داڑھ یا دانت نکلوائے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن چوں کہ اس سے کم زوری پیدا ہوسکتی ہے اس لیے بلا ضرورت نکلوانے سے احتیاط کرنا چاہئے اور اگر اس موقعہ پر خون نکل کر حلق میں چلا جائے، تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(٦) روزہ کی حالت میں مصنوعی دانتوں کا استعمال جائز ہے، اس میں کوئی کراہت بھی نہیں۔

(۷) بیڑی، سگریٹ، حقہ کا استعمال روزہ کو فاسد کردیتا ہے، کیوں کہ اس کا دھواں معدے میں بہ راہ راست پہنچتا ہے۔

(۸) اگربتی، عود، موٹروں اور چولھے وغیرہ کا دھواں اگر منہ میں چلا جائے تو

اس سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے، بشرطے کہ اس سے بچنا ممکن ہو اور اگر اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۹) روزہ میں نسوار، ویکس، امرتجن وغیرہ سونگھی جانے والی دوائیاں اگر سونگھے اور اس کی تیزی ناک کے ذریعہ اندر محسوس ہو تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور ویکس انہیلر کا بھی احتیاطاً یہی حکم ہے، کیوں کہ اس سے اندر جانے والی دوا اگرچہ ڈاکٹروں کے بہ قول پھیپڑوں میں پہنچتی ہے؛ مگر کچھ اجزاء کا معدہ میں چلے جانے کا بھی امکان ہے۔

(۱۰) منجن اور ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، مکروہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں ایک قسم کا مزہ ہوتا ہے اور مزہ رکھنے والی چیز کا منہ میں رکھنا روزہ میں مکروہ ہے اور روزہ نہ ٹوٹنا اس وقت ہے جب کہ یہ حلق میں نہ جائے اور اگر حلق میں چلا گیا تو اور چیزوں کی طرح یہ بھی روزہ کو توڑ دیتا ہے۔(۱)

(۱۱) روزہ دار اگر آنکھوں میں دوائی ڈالے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس دوا کا اثر کبھی حلق میں بھی محسوس ہو۔

(۱۲) گیس کے اندر پہنچ جانے سے روزہ فاسد ہو جائے گا، جیسے دھواں پہنچ جانے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، ہاں! اگر اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔

قضا و کفارے کے احکام

(۱) قضا جس قدر جلدی ہو سکے رکھ لینا چاہئے تاخیر نہ کرے، قرآن میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

(۲) قضا روزے کا وقت رمضان کے بعد عید الفطر کا دن اور ایام تشریق (۱۰/ ذی الحجہ سے ۱۳/ ذی الحجہ) کے علاوہ پورا سال ہے۔(۲)

---

(۱) بدائع:۲/۱۰۳

(۲) بدائع:۲/۱۰۳

(۲) اگر کئی روزے قضا ہوں تو لگا تار رکھنا ضروری نہیں؛ بل کہ وقتاً فوقتاً ایک ایک، دو دو بھی رکھ سکتے ہیں۔(۱)

(۳) اگر ایک رمضان کے کچھ یا پورے روزے قضا ہو گئے اور ان کی قضا رکھنے سے پہلے دوسرا رمضان آ گیا، تو اب پہلے اس رمضان کے ادا روزے رکھے، پھر رمضان کے بعد پہلے رمضان کی قضا کرے۔(۲)

(۴) روزے کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے؛ لیکن ان ملکوں میں غلام نہیں ہیں، اس لیے یہاں صرف دو صورتوں سے کفارہ دیا جا سکتا ہے، ایک یہ کہ دو مہینے یعنی ساٹھ دن لگا تار روزے رکھے، دوسرے یہ کہ اگر دو مہینے کے روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو، تو ساٹھ مسکینوں (غریبوں) کو دونوں وقت (صبح و شام) پیٹ بھر کر کھانا کھلائے، یا ساٹھ مسکینوں کو فی کس پونے دو سیر گیہوں یا ان کی قیمت یا اس قیمت کے برابر چاول، باجرہ، جوار دیدے۔(۳)

(۵) یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی کو کفارے میں ساٹھ روزے رکھنے کی طاقت ہو، تو اس کو مسکینوں کو کھانا کھلا دینا کافی نہ ہوگا، یہ صرف اس کے لیے ہے جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔(۴)

(٦) اگر کسی نے ایک ہی رمضان کے کئی روزے توڑ دیے تو صرف ایک کفارہ لازم ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے پہلا روزہ اور اکیسواں روزہ توڑ دیا تو یہ دو روزے قضا رکھے اور ساٹھ روزے کفارے کے رکھ لے، یہ اس کے لیے کافی ہے۔(۵)

(۱) عالمگیري:۱/ ۲۱۵
(۲) عالمگیري:۱/ ۲۰۸،در مختار وشامي:/۴۲۳
(۳) مراقي الفلاح:۲۴۳،تاتر خانیه:۳/ ۱۳۹،عالمگیري:۱/ ۲۱۵
(۴) مراقي الفلاح:۲۴۳،عالمگیري:۱/ ۲۱۵
(۵) بدائع:۲/ ۱۰۱،عالمگیري:۱/ ۲۱۵

(۷) اگر ایک فقیر و مسکین کو ساٹھ دنوں تک ہر روز ایک دن کا غلہ (پونے دو سیر گیہوں) دے دیا جائے یا اسے ساٹھ دن تک دونوں وقت کھانا کھلا دیا جائے، تو جائز ہے، یعنی ساٹھ مسکینوں کے بہ جائے ایک ہی کو اوپر کی صورت کے مطابق دیا جا سکتا ہے؛ لیکن اگر ایک مسکین کو ایک دن میں ایک دن سے زیادہ کا غلہ یا اس کی قیمت دی جائے، تو ایک دن کا کفارہ صحیح ہوگا اور زیادہ کا کفارے میں شمار نہ ہوگا۔(۱)

(۸) ایک فقیر کو ایک دن کے غلہ کی مقدار سے کم دینا بھی درست نہیں۔(۲)

فدیہ کے احکام

(۱) اگر کوئی اتنا بوڑھا ہوگیا ہے کہ روزے رکھنے کی طاقت نہیں اور آئندہ بھی طاقت آنے کی امید نہیں ہے، تو اس کو روزوں کا فدیہ دینا چاہیے۔(۳)

(۲) اگر کوئی ایسا بیمار ہے کہ صحت پانے کی امید نہیں اور اس کا مرض بڑھتے بڑھتے موت تک دراز ہوگیا، تو اس پر قضا نہیں ہے اور نہ فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہے، ہاں! اگر وہ وصیت کر جائے کہ میرے روزوں کا فدیہ دیے دو، تو اس کی یہ وصیت درست ہے اور اس کے مال کے تہائی میں سے اس کو پورا کیا جائے گا۔(۴)

(۳) اور اگر بیمار آدمی اپنی بیماری سے صحت یاب ہوگیا اور اسے اپنے چھوٹے ہوئے روزوں کو قضا کرنے کی مدت بھی ملی، تو اس پر قضا لازم ہے، اگر اس نے قضا نہیں کی اور موت کا وقت آگیا، تو اس پر فدیہ دینے کی وصیت کرنا لازم ہے، اگر

---

(۱) تاتارخانیہ:۳/۱۴۱۱البحر الرائق:۴/۱۰۹

(۲) البحر الرائق:۴/۱۱۰

(۳) عالمگیری:۱/۲۰۷،البحر الرائق:۲/۳۰۸

(۴) عالمگیری:۱/۲۰۷،در مختار مع شامی:۲/۴۷

اس نے وصیت نہیں کی اور اس کے وارثین اس کی طرف سے فدیہ دے دیں تو جائز ہے؛ مگر ان پر واجب نہیں۔(۱)

(۴) ایک شخص کے ذمے روزے قضا تھے، اس کا انتقال ہوگیا، تو اس کی طرف سے کوئی دوسرا شخص اس کے روزے نہیں رکھ سکتا؛ بل کہ چاہے تو اس کا وارث فدیہ دے سکتا ہے۔(۲)

(۵) اور فدیہ یہ ہے کہ ہر روزے کے بدلے میں پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو، یا ان میں سے کسی کی قیمت یا ان کی قیمت کے برابر کوئی غلہ مثلاً چاول وغیرہ دے دیا جائے۔(۳)

(٦) فدیہ میں ہر روزے کے بدلہ میں ایک مسکین کو صبح و شام کھانا پیٹ بھر کر کھلا دینا بھی جائز ہے اور فدیہ کے غلے کو اگر بانٹ کر کئی مسکینوں کو دے دے، تو بھی درست ہے۔(۴)

(۷) فدیہ اگر شروع رمضان ہی میں ایک مشت دے دیا، تو بھی جائز ہے اور اگر اخیر میں یک مشت دے دیا تو بھی جائز ہے۔(۵)

یہ چند اہم مسائل ہیں جو روزے کے احکام سے متعلق یہاں پیش کیے گئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں، ضرورت پر حضرات علما سے پوچھ لینا چاہئے۔

---

(۱) مراقی الفلاح:۱۷۰، عالمگیری:۱/ ۲۰۷
(۲) مراقی الفلاح:۱۷۰، بدایة المبتدي:۴۱، عالمگیري:۱/ ۲۰۷
(۳) بدایة المبتدي:۴۱، البحر الرائق:۲/ ۳۰۸، عالمگیري:۱/ ۲۰۷
(۴) در مختار مع شامي:۲/ ۴۲۸، البحر الرائق:۲/ ۳۰۸
(۵) عالمگیري:۱/ ۲۰۷، البحر الرائق:۲/ ۳۰۸

نمازِ تراویح کا بیان

رمضان کے خاص اعمال میں سے ایک نہایت اہم عمل نماز تراویح ہے، احادیث میں اس کی اہمیت وفضیلت بہت واضح انداز میں بیان ہوئی ہے، ہماری کوتاہیوں کی فہرست میں یہ بھی ہے کہ عام طور پر ہم لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں، بہت سے لوگ رمضان میں افطاری کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگتے ہیں اور بعض لوگ عشا کی نماز کے فوراً بعد سو جاتے ہیں، اور بعض دوستوں میں اول فول بکواس کرتے بیٹھتے ہیں اور تراویح نہیں پڑھتے، حالاں کہ -جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا- تراویح نہایت اہمیت کی چیز ہے اور اس میں کوتاہی کرنا بری بات ہے، ہم یہاں پہلے اس کی فضیلت وثواب، پھر اس کے متعلق احکام ومسائل بیان کریں گے۔

نماز تراویح کی فضیلت

نماز تراویح کی فضیلت میں چند احادیث پیش کرتا ہوں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه. » (۱)

---

(۱) البخاری:۳۶،نسائی:۲۱۷۰،احمد:۸۹۲۰

(جوشخص رمضان میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے قیام کرے، (یعنی نماز پڑھے) اس کے تمام گذشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«من صام رمضان وقامه ايمانا واحتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه.» (۱)

(جوشخص رمضان میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے روزے رکھے گا اور قیام کرے گا، (یعنی نماز پڑھے گا) اس کے تمام گذشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔)

اس حدیث میں گناہوں سے کون سے گناہ مراد ہیں؟ اس میں دونوں قول ہیں: بعض نے کہا کہ اس سے مراد صغیرہ و کبیرہ دونوں گناہ ہیں، علامہ ابن المنذر رحمہ اللہ نے اسی پر جزم کیا ہے اور علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشہور یہ ہے کہ یہ معافی صغیرہ گناہوں کے ساتھ خاص ہے، امام الحرمین رحمہ اللہ نے اسی پر جزم کیا ہے اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس قول کو اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ اگر کسی کے چھوٹے گناہ نہ ہوں تو اس کے بڑے گناہ معاف ہوں گے۔(۲)

ان روایات میں صرف پچھلے گناہوں کا بخشا جانا مذکور ہے، مگر بعض روایتوں میں ''وماتأخر'' بھی آیا ہے، یعنی اگلے گناہ بھی بخش دیئے جائیں گے جیسا کہ ابن حجر

---

(۱) ترمذي:۶۱۹، احمد:۱۰۱۳۳

(۲) فتح الباري:۴/۲۵۱

رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں ان روایات کونقل کیا ہے۔(۱)

اوراگلے گناہوں کے بخشے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچالیں گے،لہذا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تراویح پڑھنے کے بعد گناہ کرنے سے اس کا وبال نہ آئے گا؟اور یہ گناہوں سے بچنا بھی اضطراری نہیں؛بل کہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے اسباب مہیا فرمادیں گے کہ انسان کوگناہوں سے بچنا آسان ہوجائے گا۔(فافہم)

(۳) حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ان اللہ تبارک وتعالیٰ فرض صیام رمضان علیکم وسننت لکم قیامه،فمن صامه وقامه ایماناواحتسابا خرج من ذنوبه کیوم ولدته امه.» (۲)

(اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے اور میں نے اس کے قیام یعنی تراویح کی نماز کوسنت قرار دیا ہے،پس جوشخص رمضان کے روزے اور اس کی نماز ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے ادا کرتا ہے وہ گناہوں سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔)

(۴) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک طویل حدیث میں رسول اللہ

---

(۱) فتح الباري:۴/۲۵۱

(۲) نسائي:۲۱۸۰،ابن ماجه:۱۳۱۸، احمد: ۱۵۶۹، ابن خزیمه: ۳/۳۳۵، مسند طیالسي:۱/۳۰،مسندابویعلی:۲/۱۷۰

صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جملے بھی نقل فرمائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا:

« فانی أشهدكم یاملا ئكتی! انی قدجعلت ثوابهم من صیامهم شهررمضان وقیامه رضائی و مغفرتی. » (۱)

(اے میرے ملائکہ! تم گواہ رہنا کہ میں نے میرے بندوں کے رمضان کے روزوں اوراس کے قیام یعنی تراویح کی نماز کا ثواب میری رضا اور بخشش کو ٹھہرایا۔)

ان سب احادیث میں قیام رمضان یعنی تراویح کی فضیلت وبزرگی کا بیان ہے۔

(۱) شعب الایمان:۳/۳۳۵

تراویح کے احکام ومسائل

(۱) رمضان المبارک میں نماز تراویح مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے سنت مؤکدہ ہے۔ (۱)

نوٹ: یاد رکھنا چاہیے کہ تراویح روزے سے الگ عبادت ہے، لہذا جو لوگ کسی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں، ان کو بھی تراویح پڑھنا چاہیے۔

(۲) نماز تراویح کا وقت عشا کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر صبح صادق تک رہتا ہے، لہذا عشا سے پہلے تراویح نہ ہوگی۔ (۲)

(۳) وتر کی نماز تراویح کے بعد پڑھنا افضل ہے، اگر پہلے پڑھ لے تو بھی ہو جائے گی۔ (۳)

(۴) نماز تراویح تہائی رات کے بعد افضل ہے اور نصف شب کے بعد خلاف اولیٰ ہے۔ (۴)

(۵) تراویح کی ہر دو رکعت پر الگ الگ نیت کرنا چاہئے، ایک دم بیس رکعت کی نیت کر لینا بھی بعض فقہا کے نزدیک جائز ہے؛ لیکن احتیاط اسی میں ہے الگ الگ نیت کی جائے۔ (۵)

---

(۱) مراقی الفلاح:۱۵۹، تاتارخانیہ:۱/۴۱۰، البحر الرائق:۲/۶۶

(۲) تاتارخانیہ:۱/۴۱۳

(۳) تاتارخانیہ:۱/۴۱۳

(۴) تاتارخانیہ:۱/۴۱۴

(۵) شامی:۲/۴۴

(۶)تراویح کی نماز کا جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنا سنت کفایہ ہے،لہذا مسجد کی جماعت کے علاوہ کسی اور جگہ بھی تراویح پڑھنا درست ہے،جب کہ محلّہ کی مسجد میں بھی جماعت کا انتظام ہو۔(۱)

(۷)تراویح کی بیس رکعات اس طرح پڑھنا چاہئے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیر دے اور ہر چار رکعت کے بعد تھوڑی دیر آرام کرے۔(۲)

(۸) ہر چار رکعت کے بعد جب بیٹھے تو اس میں خواہ خاموش رہے یا نفل پڑھے یا ذکر کرے یا تلاوت کرے یا دعا مانگے،سب اختیار ہے۔(۳)

(۹) بعض علاقوں میں تراویح کی دعا کے نام سے جو دعائیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ناموں پر مشتمل رائج ہیں اور ہر دو یا چار رکعتوں پر تمام لوگ مل کر یا کوئی ایک مقرر آدمی زور زور سے پڑھتا ہے،شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور بدعت میں داخل ہے۔ اسی طرح جو دعا ''سبحان الملک القدوس الخ'' کے الفاظ سے پڑھی جاتی ہے،اس کا بھی احادیث سے ثبوت نہیں،لہذا اس کو ضروری سمجھنا اور امام یا مقتدیوں پر اس کے پڑھنے کو لازم کرنا بدعت ہے،ہاں اور دعاؤں کی طرح بلا التزام پڑھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔(دیکھو احقر کا رسالہ ''منکرات رمضان'')

(۱۰) اگر عشا کی نماز جماعت سے نہیں پڑھا تو تراویح کی نماز بھی جماعت سے نہ پڑھے؛لیکن اگر کوئی شخص عشا کی جماعت میں شریک نہ تھا،دوسرے لوگوں نے عشا جماعت سے پڑھی تو یہ ان لوگوں کے ساتھ تراویح جماعت سے پڑھ سکتا ہے،جو جماعت سے عشا پڑھ چکے ہوں۔(۴)

---

(۱) البحر الرائق:۲/۶۸،شامي:۲/۴۵
(۲) تاتارخانیه:۱/۴۱۲
(۳) تاتارخانیه:۱/۴۱۲،البحر الرائق:۲/۶۹
(۴) البحر الرائق:۲/۷۰،شامي:۲/۴۸

(۱۱)اور اگر کوئی شخص تراویح کی نماز جماعت سے نہیں پڑھا،تو وہ وتر کی نماز میں امام کے ساتھ شریک ہوسکتا ہے۔(۱)

(۱۲)اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچا کہ عشا کی نماز ہوچکی ہو،تو اسے چاہئے کہ پہلے عشا کی نماز پڑھے پھر تراویح میں شریک ہو اور جو رکعتیں تراویح کی چھوٹ جائیں ان کو وتر کے بعد پڑھے،یا ترویحہ کے موقعہ پر پڑھ لے۔(۲)

(۱۳)مہینہ میں ایک مرتبہ قرآن مجید کا ترتیب وار تراویح میں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔(۳)

(۱۴)تراویح میں ایک مرتبہ کسی بھی سورت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' بلند آواز سے پڑھ لینا چاہیے ورنہ سننے والوں کا قرآن مکمل نہ ہوگا۔

(۱۵)بعض لوگ تراویح میں ''قل ھو اللہ احد'' کو تین بار پڑھتے ہیں،یہ مکروہ ہے۔

(۱۶)تراویح میں قرآن سنانے کی اجرت لینا ناجائز ہے،اگر کوئی بلا اجرت حافظ نہ ملے تو ''الم ترکیف'' سے پڑھ لیں۔(تفصیل کے لیے ''منکرات رمضان'' اور ''رمضان اور جدید مسائل'' دیکھیں۔)

تراویح کی بیس رکعت کا ثبوت

نماز تراویح میں کتنی رکعات ہیں؟اس میں جمہور امت کا جواب یہ ہے کہ بیس رکعات ہیں اور غیر مقلدین نے بارہ سو سال کے بعد اس مسئلہ سے اختلاف کیا

(۱) درمختار مع شامي:۲/ ۴۸

(۲) درمختار مع شامي:۲/۴۴

(۳) مراقي الفلاح:۱۶۰،شامي:۲/ ۴۶،البحر الرائق:۲/۴۷

اور یہ دعویٰ کیا کہ تراویح میں آٹھ رکعتیں ہیں۔

چوں کہ یہ مسئلہ آج کل نزاع کا باعث بنتا جارہا ہے، اور عوام الناس پریشان ہوتے ہیں، اس لیے ہم یہاں صرف جمہور امت کی تائید میں چند دلائل کا ذکر کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ ان لوگوں کو جو تذبذب کا شکار ہیں تشفی ہوسکے، باقی کسی سے بحث مباحثہ مقصود نہیں۔

لہذا عرض ہے کہ تراویح میں بیس رکعت ہونے کا ثبوت حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی ہوتا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اس کے مطابق ہونا بعض روایات میں آیا ہے۔

(۱) یحییٰ بن سعید انصاری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

« ان عمرابن الخطاب رضی اللہ عنہ أمررجلاً أن يصلي بهم عشرين ركعة . » (۱)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔)

یہ روایت منقطع ہے، کیوں کہ یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا؛ مگر اولاً تو احناف کے نزدیک تابعین کے قرن کا انقطاع جرح نہیں، پھر اس روایت کی تائید دوسری روایتوں سے ہوتی ہے جیسے کہ آگے مذکور ہے۔

(۲) سائب بن یزید کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس رکعات پڑھتے تھے۔ (۲)

(۳) سائب بن یزید ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے:

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/۱۶۳

(۲) آثار السنن: ۲/۵۵

« كانوا يقومون على عهدعمرابن الخطاب رضی اللہ عنہ في شهررمضان بعشرين ركعة .» (۱)

(لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے۔)

علامہ نیموی رحمۃ اللہ "آثار السنن" میں کہتے ہیں کہ اس کو بیہقی نے "معرفہ" میں روایت کیا ہے اور علامہ سبکی رحمۃ اللہ نے "شرح منهاج" میں اس کو صحیح قرار دیا ہے۔اوراسی روایت کے ایک طریق میں یوں آیا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں رمضان میں بیس رکعات پڑھتے تھے،اس کو علامہ نووی رحمۃ اللہ نے "خلاصۃ" میں اور ابن العراقی رحمۃ اللہ نے "شرح تقریب" میں اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے "مصابیح" میں صحیح قرار دیا ہے۔(۲)

(۳) یزید بن رومان کہتے ہیں کہ:

« كان الناس يقومون في زمان عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ في رمضان ثلاث وعشرين ركعة .» (۳)

(لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان میں تیئیس رکعت پڑھتے تھے۔)

(۴) عبدالعزیز بن رفیع رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

« كان ابى ابن كعب رضی اللہ عنہ يصلى بالناس في رمضان بالمدينة عشرين ركعة ويوتر بثلاث .» (۴)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۳

(۲) آثار السنن:۲/۵۵

(۳) مؤطاامام مالک:۱۱۵،شعب الایمان:۳/۱۷۷، سنن بیهقی :۲/۴۹۶

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۳،سنن بیهقی:۲/۴۹۷

(حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو رمضان میں مدینہ میں بیس رکعت پڑھاتے تھے اور تین رکعت وتر۔)

(۵) ابوالحسناء رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«ان علیا أمر رجلاًان یصلی بھم عشرین رکعة .»(۱)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔)

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے حضرت شتیر بن شکل رحمہ اللہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن قیس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے۔(۲)

(۷) مشہور تابعی امام حضرت عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں:

« أدرکت الناس وھم یصلون ثلاثة وعشرین رکعة بالوتر .»(۳)

(میں نے لوگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ وتر کے ساتھ تیئیس رکعت پڑھتے تھے۔)

(۸) حضرت نافع بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«کان ابن ابی ملیکة رضی اللہ عنہ یصلی بنافی رمضان عشرین رکعة .»(۴)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۳،سنن بیهقي:۲/۴۹۷

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۳،سنن بیهقي:۲/۴۹۶

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۳

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۳

(حضرت ابن ابی ملیکہ صحابی رضی اللہ عنہ ہمیں رمضان میں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔)

(۹) حضرت ابوالخصیب رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

« كان يؤمناسويد بن غفلة رضي الله عنه في رمضان فيصلي خمس ترويحات عشرين ركعة. »(۱)

(حضرت سوید بن غفلہ صحابی رضی اللہ عنہ رمضان میں ہماری امامت فرماتے تھے، پس پانچ ترویحات سے بیس رکعت پڑھاتے تھے۔)

ان سب روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کیجئے کہ حاصل کیا نکلتا ہے؟ ان میں سے بعض روایات منقطع وضعیف سہی؛ مگر حکم مجموعہ روایات پر ہوتا ہے، پھر دوسری روایت تو بالکل صحیح ہے، اساطین علم نے اس کی تصحیح کی ہے، جیسا کہ نقل کیا جاچکا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا عمل اختیار نہیں کر سکتے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے خلاف ہو، لہذا اس کو اس لحاظ سے حکماً مرفوع بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ رکعت کی تعداد قیاسی واجتہادی چیز نہیں اور جو امر خلاف قیاس ہو، اور صحابہ سے اگر منقول ہو، تو حکم میں مرفوع کے ہوتا ہے، چناں چہ اس کی تائید ایک مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے۔

(۱۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي فی رمضان عشرين ركعة والوتر . »(۲)

---

(۱) سنن بیهقی:۲/۴۹۶

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۶۴، معجم کبیر:۱۱/۳۹۳، معجم اوسط:۲۴۳، سنن بیهقي: ۲/۴۹۶ مسند عبد ابن حميد:۱/۲۱۸

(رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔)

ابن ابی شیبہ کی روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، سوائے ایک کے جن کا نام ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ہے اور اگر چہ ان کے متعلق اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ ضعیف ہیں؛ مگر ان کے بارے میں محدثین میں سے بعض اچھی رائے بھی رکھتے ہیں، چناں چہ حافظ ابن حجر رَحِمَهُ اللهُ نے ''تہذیب التہذیب'' میں نقل کیا ہے کہ ابن عدی رَحِمَهُ اللهُ نے کہا کہ ان کی احادیث صالحہ ہیں اور یہ ابراہیم بن ابی حیہ سے اچھے ہیں۔(۱)

ابن عدی رَحِمَهُ اللهُ نے ان کو ابراہیم بن ابی حیہ سے بہتر قرار دیا ہے اور ابراہیم بن ابی حیہ کے بارے میں امام عثمان الدارمی رَحِمَهُ اللهُ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن معین رَحِمَهُ اللهُ نے کہا کہ: ''شيخ ثقة كبير'' (یہ قابل اعتماد شیخ کبیر ہیں۔)(۲)

علامہ ظفر احمد عثمانی رَحِمَهُ اللهُ فرماتے ہیں کہ ابراہیم ابن ابی حیہ کے بارے میں اختلاف ہے اور وہ حسن الحدیث ہیں، عثمان الدارمی رَحِمَهُ اللهُ نے یحییٰ ابن معین سے نقل کیا ہے کہ یہ شیخ ثقہ کبیر ہیں، پس جو ان ابراہیم سے بھی بہتر اور اچھا ہوگا وہ مختلف فیہ اور حسن الحدیث ہونے سے کم نہ ہوگا۔(۳)

بہ ہر حال یہ روایت بھی حسن ہوگی اور پھر صحابہ رَضِيَ اللهُ عَنْهُم کا عمل بھی اس کا مؤید ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ بیس رکعت تراویح جیسے صحابہ کا عمل ہے، رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا بھی معمول رہا ہے۔

---

(۱) تهذيب التهذيب:۱/۱۳۵

(۲) لسان الميزان:۱/۵۲

(۳) اعلاء السنن:۷/۷۱

آٹھ رکعت کی حدیث کا جواب

اب ذرا ان لوگوں کی دلیل کا جائزہ بھی لیجیے جو یہ کہتے ہیں کہ تراویح صرف آٹھ رکعت ہے۔ ان لوگوں نے اس پر ایک حدیث سے استدلال کیا ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

« کیف کان صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم في رمضان ؟»

(رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟)

اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

« ماکان یزید في رمضان ولا في غیرہ علیٰ احدیٰ عشرۃ رکعۃ ، یصلي اربعا فلا تسأل عن حسنھن وطولھن، ثم یصلي اربعا فلا تسأل عن حسنھن وطولھن ،ثم یصلي ثلا ثا . »(۱)

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان وغیر رمضان میں آٹھ رکعات سے زائد نہ پڑھتے تھے، چار رکعتیں ایسی پڑھتے کہ ان کی خوب صورتی اور ان کا طول نہ پوچھو، پھر چار رکعتیں ایسی پڑھتے کہ ان کی خوب صورتی اور ان کا طول نہ پوچھو، پھر تین رکعت پڑھتے تھے۔)

---

(۱) البخاري :۱۸۷۴، مسلم ،۱۲۱۹، ترمذي :۴۰۷، نسائي:۱۶۷۹، ابوداود: ۱۱۴۳، احمد:۲۲۹۴۴

اس حدیث سے ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تراویح بھی آٹھ ہی رکعت پڑھتے تھے؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ آپ رمضان وغیر رمضان میں آٹھ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے؛ مگر یہ بات صحیح نہیں؛ کیوں کہ خود بخاری و مسلم کی روایات سے اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ آپ تیرہ رکعات پڑھتے تھے۔(۱)

لہذا بات یہ ہے کہ یہ حدیث درحقیقت تراویح کے بارے میں نہیں ہے؛ بل کہ تہجد کے متعلق ہے، جو آپ اکثر گیارہ رکعات پڑھتے تھے اور کبھی تیرہ بھی پڑھتے تھے، دوسرے یہ دیکھئے کہ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس نماز کا ذکر کیا ہے، جو رمضان وغیر رمضان ہر وقت پڑھی جاتی تھی اور یہ سب کو معلوم ہے کہ تراویح کی نماز رمضان میں پڑھی جاتی ہے نہ کہ رمضان کے علاوہ دوسرے اوقات میں، لہذا اس حدیث کو رمضان کی خاص نماز تراویح سے کوئی تعلق نہیں، اس کو تراویح کی آٹھ رکعات کے ثبوت میں پیش کرنا صحیح نہیں۔

اور مؤطا امام مالک میں جو آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آٹھ رکعت پڑھانے کا حکم دیا، یہ روایت مضطرب ہے؛ کیوں کہ اس کے متعدد طرق ہیں اور ان میں متعدد باتیں بیان ہوئی ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" میں نقل کیا ہے۔(۱)

اور یہ کہنا کہ "یہ مختلف احوال پر محمول ہے" صحیح نہیں؛ کیوں کہ مخرج ایک ہے، اس میں مختلف احوال کی بات کیسے پیدا ہوگئی؟

---

(۱) البخاري:۱۰۹۴، مسلم:۱۲۲۰

(۲) فتح الباري:۴/۳۵۳، تفصیل کے لیے دیکھئے: "رکعات تراویح" از مولانا حبیب الرحمن اعظمی

بہ ہر حال آٹھ رکعت کے بہ جائے بیس رکعت پڑھنا چاہیے؛ تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے موافقت ہو جائے اور نیز امت کا اس پر اجماع بھی ہے، اس کے خلاف لازم نہ آئے۔

یہاں ہم نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے کہ یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں ہے اور ہم نے اس مسئلے پر دوسرے موقعہ پر تفصیل سے لکھا ہے، چناں چہ ہم نے ہمارے ایک رسالے ''دلیل نماز'' میں مفصل کلام کیا ہے جو ہم نے مولانا عبد المتین صاحب جونا گڑھی کی کتاب ''حدیث نماز'' کے رد میں لکھا ہے۔

اعتکاف -فضائل واحکام

تمہید

اعتکاف اسلامی عبادات میں سے ایک اہم عبادت ہے، اس کا درجہ ومقام بڑا اونچا ہےاوراس کے فضائل بے شمار ہیں؛لیکن اکثرلوگ اس کی حقیقت سے ناواقف، اس کے فضائل سے بے خبراوراس کے مسائل واحکام سے نابلد ہیں، اس لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس اہم ترین عبادت اسلام کی حقیقت واہمیت کواجاگراوراس کے فضائل ومسائل کوواضح کیا جائے۔

اعتکاف کی تعریف

اعتکاف کے معنی لغت میں کسی چیز کولازم پکڑ لینے اورمحبوس ہوجانے کے ہیں، مثلاًکسی نے اپنے رہنے کے لیے کسی خاص مکان کاانتخاب کرکےاس کولازم پکڑلیایا کسی نے تجارت کواپنالازمی پیشہ بنالیاتو یہ لغت میں اعتکاف کہلاتا ہے اورشرعی اصطلاح میں مخصوص عبادت کومخصوص وقت میں مخصوص شرائط پرمخصوص جگہ میں لازم کر لینےکواعتکاف کہتے ہیں۔(۱)

اورعلامہ جرجانی رحمۃ اللہ نے اعتکاف کی شرعی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

”وفي الشرع لبث صائم في مسجد جماعة بنية و تفريغ القلب عن شغل الدنيا و تسليم النفس إلى المولى“

(روزہ دارکانیت کے ساتھ ایسی مسجد میں قیام کرنا جہاں جماعت

(۱) تفسیر قرطبی:۲/۳۳۲

ہوتی ہو اور دنیا کے مشاغل سے اپنے دل کو خالی کر لینا اور اپنا نفس مولیٰ کے حوالے کر دینا۔)(۱)

اعتکاف کی ضرورت

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں اعتکاف کی ضرورت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بعض اوقات انسان اپنی باطنی سمجھ کی بہ دولت یہ معلوم کر لیتا ہے کہ امور معاش میں اس کے لیے توغل کرنا (یعنی حد سے زیادہ منہمک ہونا) سخت مضر ہے، اسی طرح اگر اس کے حواس خمسہ (ظاہرہ) بیرونی واقعات کا اثر قبول کرتے رہیں، تو اس سے اس کا آئینہ قلب سخت مکدر ہوتا ہے، اس سے خلاصی پانے کی تدبیر اس کو یہ سوجھتی ہے کہ تمام اشغال کو چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں بیٹھ جائے اور اپنے تمام اوقاتِ عزیز کو اللہ عزوجل کی یاد اور اس کی عبادت میں صرف کر لے؛ لیکن اس پر مداومت کرنا اس کو ناممکن نظر آتا ہے، فوراً اس کے ذہن میں اصول آجاتا ہے کہ "مَا لایُدرَکُ کُلُّہ لایُترَکُ کُلُّہ" کہ جس چیز کو پورے طور پر حاصل نہ کیا جا سکے اس کو پورے طور پر چھوڑنا بھی نہ چاہئے، اس لیے وہ اپنے اشغال سے وقت فرصت نکال کر تدبیر مذکور کو جزوی طور پر عمل میں لاتا ہے، اسی کا نام شرع میں اعتکاف ہے۔"(۲)

---

(۱) التعریفات للجرجانی: ۴۷

(۲) حجۃ اللہ البالغہ

حاصل یہ ہے کہ دنیوی علائق اور مصروفیات کی وجہ سے انسانی قلب پر جو کدورت و میل آ جاتا ہے اور اس کو دھونے اور صاف کرنے کے کی ضرورت ہر صاحب عقل وبصیرت محسوس کرتا ہے،لہذا اس کے لیے ایک آسان تدبیر یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ان دنیوی علائق سے خود کو آزاد کرلیا جائے اور اللہ کی یاد میں خود کو لگایا جائے ،اور بہ زبان حال یوں گویا ہوتا ہے کہ اے اللہ! جب تک تو مجھ سے راضی نہ ہوگا میں واپس نہیں لوٹوں گا،اسی کا نام اعتکاف ہے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ نے اسی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

”إن مثل المعتكف مثل المحرم ألقى نفسه بين يدى الرحمن فقال: والله لا أبرح حتى ترحمني“

(اعتکاف کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے احرام پہننے والا حاجی کہ وہ رحمٰن کے سامنے اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس وقت تک نہیں لوٹوں گا جب تک کہ تو مجھ پر رحم نہ کردے۔)(۱)

اعتکاف کی حکمتیں

اعتکاف کی حکمتیں علما نے بہت سی بیان فرمائی ہیں،من جملہ ان کے یہ بھی ہیں:

(۱) چوں کہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے اس لیے مسجد میں رہنے کی وجہ سے ہر وقت نماز کا جماعت سے ادا کرنا آسان ہوگا۔

(۲) بہت سی لغو وگناہ کی باتوں سے وہ بچا رہے گا، کیوں کہ مسجد میں وہ کام نہیں ہوسکتے۔

(۳) ذہنی انتشار وقلبی اضطراب سے محفوظ رہے گا، کیوں کہ یکسوئی کی جگہ میں

(۱) شعب الایمان:۳/۴۲۶

یکسوئی حاصل ہوا کرتی ہے۔

(۴) سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو ہر وقت ثواب ملتا رہے گا اور اللہ کا قرب ورضا حاصل ہوگی۔

ایک شبہ کا جواب

بعض لوگ اعتکاف پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا عبادت ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں بیٹھ جائیں اور اس پر ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں : ’’لَا رَهْبَانِيَّةَ فِيْ اِلْاسْلَامِ‘‘ کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حدیث میں ’’لَا رَهْبَانِيَّةَ فِيْ اِلْاسْلَامِ‘‘ آیا ہے، اسی طرح حدیث میں اعتکاف کے فضائل بھی وارد ہوئے ہیں، تو تم ایک حدیث کو لیتے ہو اور دوسری کو چھوڑتے ہو؟ اسلام کا اقرار کرنے والا ایسا نہیں کرسکتا، پھر بھی اگر کرتا ہے، تو وہ ہم پر نہیں اسلام پر اعتراض کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ اعتکاف کو رہبانیت قرار دینا بالکل غلط ہے؛ اس لیے کہ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیوی علائق سے بے تعلق ہو کر رہ جائے اور اعتکاف میں اس طرح نہیں ہوتا،؛ بل کہ اس میں ہر طرح کا صحیح تعلق قائم رکھا جاتا ہے۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے در پر رہنے کو اپنے لیے فضیلت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

اعتکاف کی فضیلت

اعتکاف کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، یہاں چند ایک نقل کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا:

”هُوَ يَعْكِفُ الذُّنُوْبَ وَيُجْرٰى لَهُ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا“

(اعتکاف کرنے والا گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے لیے نیکیاں اتنی ہی لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کے لیے)(۱)

فائدہ: اس میں اعتکاف کرنے والے کے لیے اتنی نیکیوں کی بشارت سنائی گئی ہے جتنی کہ کرنے والے کے لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتکاف کرنے والا اعتکاف کی وجہ سے بعض نیک اعمال نہیں کرسکتا، مثلاً مریض کی عیادت، جنازہ میں شرکت وغیرہ، ایسے اعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اعتکاف کرنے والا اگرچہ عمل نہیں کرتا؛ مگر اس کو اتنا ہی ثواب دیا جاتا ہے جتنا کہ کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کرتے ہیں:

”مَنِ اعْتَكَفَ يَوْماً ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ جَعَلَ اللّٰهُ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ النَّارِ ثَلَاثَ خَنَادِقَ كُلُّ خَنْدَقٍ أَبْعَدُ مِمَّا بَيْنَ الْخَافِقَيْنِ“

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایک دن کا بھی اعتکاف اللہ کی رضا کے واسطے کرتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں آڑ فرمادیتے ہیں جن کی مسافت آسمان اور زمین کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔) (۲)

---

(۱) ابن ماجہ:۱۷۷۱، شعب الایمان:۳/۴۲۴

(۲) المعجم الاوسط:۷/۲۲۰، شعب الایمان:/۴۲۴،

(۳) حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ اعْتَكَفَ عَشْراً فِيْ رَمَضَانَ كَانَ كَحَجَّتَيْنِ وَ عُمْرَتَيْنِ"

(جو شخص عشرۂ رمضان کا اعتکاف کرے، اس کو دو حج اور دو عمروں کا اجر ہے۔)(۱)

اعتکاف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اعتکاف کی اسی فضیلت و اہمیت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خاص اہتمام فرماتے تھے، چناں چہ حدیثوں میں آپ کا طرزِ عمل اس طرح بیان کیا گیا ہے:

(۱) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ "

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔)(۲)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

" أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ " (۳)

---

(۱) شعب الایمان:۳/۴۲۵

(۲) البخاری:۱۸۸۵،مسلم:۲۰۰۲،ابو داؤد:۲۱۰۹،ابن ماجہ:۱۷۶۳،احمد:۵۷۹۶

(۳) البخاری:۱۸۸۶،مسلم:۲۰۰۶،ترمذی:۷۲۰،ابو داؤد:۲۱۰۶،احمد:۲۳۴۶۲

(اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دنوں کا اعتکاف کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دے دی۔

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَعْتَكِفُ فِيْ كُلِّ رَمَضَانَ عَشَرَةَ أَيَّامٍ ، فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الَّذِيْ قُبِضَ فِيْهِ اعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ يَوْمًا "(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس دن اعتکاف کرتے تھے، لیکن جو آپ کی وفات کا سال تھا تو آپ نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔)

علما نے لکھا ہے کہ آپ نے بیس دن کا اعتکاف اس لیے فرمایا تھا کہ آپ کو منکشف ہو گیا تھا کہ یہ آپ کا آخری رمضان ہے، آپ نے چاہا کہ اعمال خیر میں کثرت کی جائے؛ تا کہ امت کو عمل خیر میں جدو جہد کرنا ظاہر ہو جائے اور بعض نے کہا کہ یہ بیس دن کا اعتکاف اس لیے تھا کہ آپ نے اس سے پہلے سال رمضان میں سفر ہو جانے کی بنا پر اعتکاف نہیں کیا تھا، اس لیے اس سال بیس دن کا اعتکاف دس دن کا اسی سال کا ادائی اور دس دن گزشتہ سال کی قضا کے طور پر کیا تھا۔ بہ ہر حال اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی نظر میں یہ اہم چیز تھی۔

اعتکاف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ

---

(۱) البخاری:۱۹۰۳،ابو داؤد:۲۱۱۰، ابن ماجہ:۱۷۵۹،احمد:۸۰۸۱،دارمی:۱۷۱۳

مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثم اعتكف أزواجه من بعده‘‘(۱)

(اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ رمضان کے آخری دنوں کا اعتکاف کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو وفات دیدی، پھر آپ کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے اعتکاف کرنے کی اجازت چاہی، آپ نے ان کو اجازت دی، تو انہوں نے ایک چادر ڈال لی، جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک چادر ڈال لی، پھر جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو انہوں نے ایک چادر ڈال لی، پس جب رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے یہ چادریں دیکھی تو کہا یہ کیا ہے؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ کیا ہے۔ (آپ نے اس کو منع کر دیا کہ دکھاوا ہوگا)۔ (۲)

اس سے حضرات صحابہ کا اعتکاف کے لیے جد و جہد، شوق معلوم ہوتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اوپر کی تقریر سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ازواج مطہرات اعتکاف کیا کرتی تھیں اور اس کا بڑا ان کو شوق وجذبہ بھی تھا، یہی حال وہ دوسرے اور صحابہ کا بھی ہے، مگر حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اعتکاف کے بارے میں غور کیا اور اس میں بھی کہ صحابہ نے اس

(۱) البخاري:۱۸۸۶، مسلم:۲۰۰۶، ابو داوٗد:۲۱۰۶، احمد:۲۳۴۶۲

(۲) البخاري:۱۹۰۰، مسلم:۲۰۰۷، نسائي:۲۰۷، ابو داوٗد:۲۱۰۸، ابن ماجة:۱۷۶۱، احمد:۲۳۴۰۴

کو کیوں ترک کر دیا تھا جب کہ وہ لوگ شدت کے ساتھ اتباع سنت کرتے تھے، پس میرے جی میں یہ بات آئی کہ یہ صوم وصال کی طرح ہے اور صحابہ نے اس کو سخت ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا تھا۔حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ نے اس سنت کو اپنایا نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ نے غالباً کسی خاص طریقہ پر اعتکاف کرنے کے بارے میں یہ بات فرمائی ہوگی، ورنہ حضرات صحابہ سے روایات میں اعتکاف کرنا منقول ہے۔ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے ”فتح الباری“ میں کہا کہ ہم سے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اعتکاف کرنا بیان کیا گیا ہے۔(۱)

اعتکاف کی قسمیں

جاننا چاہیے کہ علمائے احناف کے نزدیک اعتکاف کی تین قسمیں ہیں:

(۱)واجب (۲) سنت موکدہ (۳) مستحب۔

(۱)اعتکاف صرف اسی صورت میں واجب ہوتا ہے جب کہ اس کی نذر کی جائے، جیسے کسی نے کہا کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے، تو میں اتنے دن اعتکاف کروں گا یا ویسے ہی کہا کہ میں اتنے دن اعتکاف کروں گا، تو یہ اعتکاف واجب ہوتا ہے۔

(۲) سنت مؤکدہ وہ رمضان میں اخیر عشرہ کا اعتکاف ہے، اس عشرہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالالتزام اعتکاف کرنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

(۳) مستحب وہ اعتکاف ہے جو نذر اور رمضان کے اخیر عشرہ کے سوا کسی بھی وقت کیا جائے۔(۲)

---

(۱) فتح الباري:۴/۲۷۲

(۲) البحر الرائق:۲/۳۲۲،در مختار مع شامي:۲/۴۴۱

اعتکاف کے احکام ومسائل

اعتکاف کے احکام ومسائل بہت سے ہیں، ہم یہاں ان میں سے چند ضروری اور اہم مسائل بیان کرتے ہیں، تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

اعتکاف کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

(۱) ایک یہ کہ مرد مسجد میں ٹھہرے، خواہ اس مسجد میں پانچوں وقت نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اور بعض فقہا نے مسجد جماعت ہونا شرط قرار دیا ہے اور بعض نے یہ کہا کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں جائز ہے جہاں جمعہ ہوتا ہو؛ مگر اول قول پر ہی فتویٰ ہے۔ ہاں! عورت اپنے گھر میں ایک جگہ مقرر کر لے اور اسی میں اعتکاف کرے۔ (۱)

(۲) دوسری یہ کہ اعتکاف کی نیت سے ٹھہرے، اگر بغیر ارادہ ونیت مسجد میں ٹھہر جائے، تو یہ اعتکاف نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کی شرط نہیں پائی گئی۔ (۲)

(۳) تیسری یہ کہ اعتکاف کرنے والا مرد جنابت سے پاک ہو اور عورت ہو، تو حیض ونفاس اور جنابت سے پاک وخالی ہو۔

مگر اس مسئلے کی ذرا تفصیل ہے اس کو یہاں عرض کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ جس اعتکاف میں روزہ شرط ہے اس میں حیض ونفاس سے خالی ہونا شرط صحت ہے، یعنی اگر حیض ونفاس جاری ہو، تو یہ اعتکاف صحیح نہیں ہوتا اور جس اعتکاف میں روزہ شرط نہیں اس میں حیض ونفاس سے خالی ہونا شرط صحت تو نہیں ہے، شرط حلت ہے، یعنی اگر حیض ونفاس جاری ہو، تو اعتکاف صحیح تو ہو جاتا ہے، البتہ ایسا کرنا حلال وجائز نہیں،

---

(۱) البحر الرائق:۲/۳۲۲در مختار مع شامي:۲/۴۴۰

(۲) در مختار مع شامي:۲/۴۴۱،البحر الرائق:۲/۳۲۲

اور حیض ونفاس سے اور جنابت سے پاک ہونا کسی اعتکاف کے لیے بھی شرط صحت نہیں، یعنی حیض ونفاس وجنابت کا غسل کرکے پاک ہونا شرط صحت نہیں ہے؛ بل کہ شرط حلت ہے۔(۱)

سب سے افضل وہ اعتکاف ہے جو مسجد حرام میں کیا جائے، پھر وہ جو مسجد نبوی میں کیا جائے، پھر وہ جو مسجد اقصیٰ میں ہو، اس کے بعد جامع مسجد میں، پھر محلّہ کی مسجد میں اور عورتیں اپنے گھر میں کسی جگہ مسجد بنالیں اور اسی میں اعتکاف کریں۔(۲)

نذر کے اعتکاف میں روزہ شرط ہے اور اعتکاف مسنون میں روزہ شرط ہے یا نہیں؟ اس میں ابن نجیم رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس میں روزہ شرط نہیں؛ مگر شامی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور روزہ کو اس میں بھی شرط قرار دیا ہے، لہذا اگر کوئی بیماری کی وجہ سے روزہ نہ سکے، تو وہ ابن نجیم کی رائے کے مطابق اعتکاف بغیر روزہ کے کرسکتا ہے اور شامی کی رائے کے مطابق یہ اعتکاف مسنون نہیں کرسکتا، ہاں! اس کو نفل اعتکاف کا ثواب مل جائے گا اور اعتکاف مستحب میں روزہ شرط نہیں ہے۔(۳)

اعتکافِ واجب کم سے کم ایک دن کا ہوتا ہے اور زیادہ جس قدر نیت کرے اور اعتکاف مسنون ایک عشرہ کا- جو رمضان کی اکیسویں شب سے شروع ہوکر عید کا چاند نظر آنے تک ہے- ہوتا ہے اور اعتکاف مستحب کے لیے کوئی مقدار نہیں، وہ ایک منٹ کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔(۴)

---

(۱) در مختار مع شامی:۲/۴۴۱،البحر الرائق:۲/۳۲۲

(۲) البحر الرائق:۲/۳۲۴،شامي:۲/۴۴۱

(۳) البحر الرائق:۲/۳۲۳،شامي:۲/۴۴۲

(۴) در مختار مع شامی:۲/۴۴۳،البحر الرائق:۲/۳۲۲

اعتکاف میں ممنوع اعمال

اعتکاف میں دوقسم کی باتیں حرام ہیں، یعنی اگر اعتکاف واجب ہے یا سنت تو ان کے ارتکاب سے اعتکاف فاسد ہوجائے گا اوراس کی پھر قضا کرنا ہوگا اوراگر اعتکاف مستحب تھا تو ختم ہوجائے گا۔

(۱) معتکف (اعتکاف کی جگہ) سے بے ضرورت باہر نکلنا خواہ عمداً ہو یا بھول کر ہو۔

(۲) جماع وغیرہ کرنا خواہ قصداً کیا جائے یا بھول کر۔

ان دونوں کے متعلق بعض تفصیلات ہیں، ان کو ہم نیچے درج کرتے ہیں:

(۱) اعتکاف کی جگہ سے باہر نکلنے سے اعتکاف اس وقت فاسد ہوگا جب کہ یہ نکلنا بلاضرورت ہو، اوراگر ضرورت ہوتو نہیں ٹوٹے گا اورضرورت عام ہے خواہ طبعی ہو یا شرعی، جیسے پیشاب، پاخانہ، غسل جنابت اورکھانا لانے والا نہ ہو، تو کھانے کے لیے اورشرعی ضرورت جیسے جمعہ یا عیدین کی نماز کے لیے جانا۔(۱)

(۲) اگرضرورت سے باہر جانا ہو، تو ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد فوراً واپس آجائے۔(۲)

(۳) مریض کی عیادت یا نماز جنازہ کے لیے بھی باہر نکلنا درست نہیں، البتہ کسی ضرورت سے نکلا تھا، راستہ میں مریض کی عیادت کرلیا یا نماز جنازہ میں شریک ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔(۳)

---

(۱) در مختار مع شامی:۲/ ۴۴۵، البحر الرائق:۲/ ۳۲۵، الولو الجیہ:۱/ ۲۴۱

(۲) در مختار مع شامی:۲/ ۴۴۷، البحر الرائق:۲/ ۳۲۵

(۳) البحر الرائق:۲/ ۳۲۵، الولو الجیہ:۱/ ۲۴۱

(۴) اگرکوئی شخص زبردستی معتکف سے باہرنکال دیاجائے تب بھی اس کا اعتکاف نہ رہے گا۔

(۵) جماع کرنے سے اعتکاف فاسد ہوجائے گا، خواہ بھول کرکیاہویاقصداً، اسی طرح مسجد میں کیاہویامسجد کے باہر۔(۱)

(۶) جوکام غالباًجماع کاباعث ہوتے ہیں جیسے بوسہ لینا، وغیرہ تو یہ بھی اعتکاف میں ناجائز ہوجاتے ہیں؛ مگران سے اعتکاف فاسدنہیں ہوتا، البتہ ان چیزوں سے منی نکل جائے تواعتکاف ٹوٹ جائے گا۔(۲)

مکروہات اعتکاف

(۱) اعتکاف میں بےضرورت کسی دنیوی کام میں مشغول ہونامکروہ تحریمی ہے، مثلاً بےضرورت خریدوفروخت کرناوغیرہ، ہاں! اگرکوئی کام نہایت ضروری ہواورگھر میں کوئی دوسرانہ ہو، توایسی ضرورت میں دنیوی کام بھی کرسکتا ہے۔(۳)

(۲) حالت اعتکاف میں خاموش بیٹھنا کوئی عبادت نہیں، خاموشی کوعبادت سمجھ کر خاموش بیٹھنامکروہ ہے؛ بل کہ کوئی عبادت یامباح کام یاکلام کرنادرست ہے۔(۴)

(۳) خریدوفروخت کاسامان مسجد میں لانابھی مکروہ ہے، اگرچہ ضرورت کے لیے اعتکاف کرنے والےکوخریدنے بیچنے کی اجازت ہے۔(۵)

---

(۱) در مختار مع شامی:۲/ ۴۵۰، البحر الرائق:۲/ ۳۲۸

(۲) در مختار مع شامی:۲/ ۴۵۰، البحر الرائق:۲/ ۳۲۵

(۳) در مختار مع شامی:۲/ ۴۴۹، البحر الرائق:۲/ ۳۲۵

(۴) در مختار مع شامی:۲/ ۴۴۹، البحر الرائق:۲/ ۳۲۵

(۵) در مختار مع شامی:۲/ ۴۴۹، البحر الرائق:۲/ ۳۲۷

تنبیہ

یاد رہے کہ مسجد صرف اس حصہ کو کہتے ہیں جو نماز پڑھنے کے لیے بنایا گیا ہو، خواہ وہاں چھت ہو یا نہ ہو، خواہ وہاں نماز ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو اور اس حصے کے علاوہ جو جگہ مسجد کے اطراف و اکناف میں ہوتی ہے، وہ مسجد میں داخل نہیں اور اس جگہ جا کر بلا ضرورت بیٹھنے اٹھنے سے بھی؛ بل کہ محض اس جگہ جانے سے بھی اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

تلاوتِ قرآن

رمضان سے خصوصیت سے تعلق رکھنے والے اعمال میں سے ایک قرآن پاک کی تلاوت بھی ہے، وجہ یہ ہے کہ رمضان مبارک کا مہینہ دراصل قرآن کے نزول کا مہینہ بھی ہے۔

جیسا کہ قرآن نے خود ہی کہا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ :۱۸۵)

(کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔)

اس لیے گویا یہ مہینہ قرآن کی ولادت کا مہینہ ہے؛ اس لیے اس ماہ میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تلاوت کرنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اوقات سے زیادہ رمضان میں سخی ہوجاتے تھے، جب جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے اور جبرئیل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملتے تھے، یہاں تک کہ رمضان گذر جاتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قرآن سنایا کرتے تھے۔غرض جب جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے، تو آپ تیز ہوا سے بھی زیادہ نیکی میں سخی ہوجاتے تھے۔(۱)

اورابن ماجہ نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک

---

(۱) بخاری:۱۷۶۹، مسلم :۴۲۶۸،نسائی:۲۰۶۸،احمد:۳۲۵۰،ابن خزیمة :۱۹۳/۳، ابن حبان:۲۲۵/۸

مرتبہ جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سناتے تھے؛ لیکن اس سال جس میں آپ نے وفات پائی، آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔(۱)

بہ ہر حال رمضان میں چاہیے کہ ہم کثرت کے ساتھ تلاوت کلام اللہ کیا کریں۔

حضرات اولیاء اللہ کے یہاں بھی یہ معمول ہے کہ وہ رمضان میں اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ کا معمول تھا کہ رمضان میں روزانہ ایک قرآن اور کچھ پارے پڑھ لیا کرتے تھے اور پورے رمضان میں چالیس قرآن ختم کیا کرتے تھے۔

مگر یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تلاوت اس کے آداب کے ساتھ کرنا ضروری ہے اور اس کے آداب بہت ہیں، مختصراً چند اہم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) وضو کے ساتھ باادب واحترام تلاوت کرے۔

(۲) خشوع واخلاص کے ساتھ تلاوت کرے۔

(۳) قرآن کو صحیح پڑھنے کا اہتمام کرے، (اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی عالم وقاری سے سیکھے)

(۴) قرآن میں غور وفکر کرتے ہوئے پڑھے، غفلت کے ساتھ نہ پڑھے۔

(۵) یہ سوچتے ہوئے پڑھے کہ اللہ تعالیٰ میرا یہ پڑھنا سنتے ہیں، اس سے اللہ کی طرف دھیان رہے گا اور غفلت دور ہوگی۔

(۶) عذاب کی آیتوں پر رو کر پناہ مانگے اور ثواب وبشارت کی آیتوں پر خوش ہو کر اللہ سے مانگے۔

(۷) سجدے کی آیت آئے تو سجدہ کرے۔

---

(۱) ابن ماجہ:۱۷۵۹

(۸) تلاوت کے شروع میں اعوذ باللہ و بسم اللہ پڑھے۔

(۹) اگر ریا کا اندیشہ نہ ہو، تو زور سے پڑھے ورنہ آہستہ۔

(۱۰) قرآن کو اچھی آواز سے اچھے لہجے میں پڑھے، بھونڈے انداز سے نہ پڑھے۔

عبادات میں کثرت

رمضان کی ایک سنت یہ ہے کہ اس میں ہر نیکی اور بھلائی کے کام میں اضافہ کرنا چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، اوپر بہ حوالہ ابن خزیمہ وبیہقی یہ حدیث ہم نے ذکر کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ شَدَّ مِئْزَرَهُ ثُمَّ لَمْ يَأْتِ فِرَاشَهُ حَتّٰى يَنْسَلِخَ. »

(جب رمضان داخل ہوجاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازار کو سخت باندھتے، پھر جب تک رمضان گذر نہ جاتا آپ بستر پر نہ آتے تھے۔)

اسی طرح یہ حدیث بھی ہم نے بہ حوالہ شعب الایمان اوپر ذکر کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ:

« إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَ كَثُرَتْ صَلٰوتُهُ وَ ابْتَهَلَ فِي الدُّعَاءِ وَأَشْفَقَ مِنْهُ. »

(جب رمضان آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہوجاتی اور آپ دعا میں گڑگڑاتے اور رمضان کی حرص کرتے۔)

نیز حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرات تو ہمیشہ ہی کرتے تھے؛ مگر رمضان میں اس کثرت کے ساتھ کرتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ آپ رمضان میں اللہ کی طرف سے جو رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں، ان سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔(۱)

ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے رحمت کی ہوا ہر اچھے اور برے سب پر یکساں چلتی اور ان کو فائدہ دیتی ہے، اسی طرح آپ بھی ہر کس و ناکس کو اپنی سخاوت سے فیض یاب کرتے تھے۔

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ خبر دے کر کہ رمضان میں ایک فرض ستر فرضوں کے برابر اور نفل فرض کے برابر ثواب کا مستحق ہوتا ہے، رمضان میں نیکی میں اضافے کی طرف ترغیب دی ہے۔

پھر احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رمضان مبارک کا ورود مسعود ہی اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں نیکی کر کے آدمی اپنی مغفرت کا سامان تیار کر لے، چناں چہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منبر کے قریب ہو جاؤ، وہ کہتے ہیں کہ ہم منبر کے قریب ہو گئے، جب آپ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا تو آمین کہا جب دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو آمین کہا اور جب تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو آمین کہا، حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آپ منبر سے بعد خطبہ اترے تو ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آج ہم نے آپ سے ایک ایسی بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی؟ آپ نے فرمایا کہ اس وقت

---

(۱) بخاری:۱۷۶۹، مسلم:۴۲۶۸، نسائی:۲۰۶۸، احمد:۳۲۵۰، ابن خزیمۃ:۱۹۳/۳، ابن حبان:۲۲۵/۸

جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ وہ شخص خیر سے محروم ہوجائے جس نے رمضان کو پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہیں ہوئی، اس پر میں نے آمین کہی، اور جب میں نے دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا کہ وہ شخص خیر سے محروم ہوجائے جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ بھیجے، اس پر میں نے آمین کہی، اور جب میں نے تیسرے درجہ پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا کہ وہ شخص خیر سے محروم ہوجائے جس نے اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو ان کے بڑھاپے میں پائے پھر بھی وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائیں، اس پر میں نے آمین کہی۔ (۱)

الغرض ہر نیکی رمضان میں کثرت کے ساتھ ہونا چاہئے؛ تاکہ مغفرت کا سامان بن جائے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے رمضان ہمیں عطا فرماتے ہیں۔

ہم نے اس سلسلہ میں اس رسالے کی ابتدا میں احادیث نقل کردی ہیں، ان کو دوبارہ پڑھ لیا جائے۔

لیلۃ القدر کا بیان

ماہ رمضان المبارک میں ایک رات آتی ہے جسے قرآن کریم نے ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا ہے اور اس کو لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ اس رات کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ رمضان میں آتی ہے اور یہ کہ قرآن نے اس کا ذکر بڑے اونچے الفاظ میں کیا ہے اور اس کو ایک ہزار مہینوں سے افضل و بہتر قرار دیا ہے۔

---

(۱) مستدرک: ۴/۱۷۰، معجم کبیر: ۱۹/۱۴۴، شعب الایمان: ۲/۲۱۵، حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے۔

چناں چہ فرمایا گیا:

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ. وَمَا أَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ. تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ. سَلَامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴾

(القدر: ۳۰)

(ہم نے اس (قرآن) کو اتار الیلۃ القدر میں اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے؟ لیلۃ القدر ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس (رات) میں فرشتے اور روح (جبرئیل) اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں ہر کام پر، سلامتی ہے یہ رات صبح کے نکلنے تک۔)

یہاں چند اہم امور کی طرف نشان دہی کی جاتی ہے، جن کا تعلق لیلۃ القدر سے ہے:

(۱) حضرات مفسرین نے اس کی شان نزول میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر کا یہ عطیہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، کسی اور امت کو اس سے مشرف نہیں کیا گیا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ابن ابی حاتم نے حضرت علی وعروۃ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن بنی اسرائیل کے بزرگوں کا ذکر کیا، جنہوں نے اسّی برس تک اللہ کی اس طرح عبادت کی کہ پلک جھپکنے کے برابر بھی کوئی گناہ نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں کا نام بتایا کہ وہ حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت حزقیل بن العجوز اور حضرت یوشع بن نون علیہم السلام تھے، اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی امت ان افراد کی عبادت پر تعجب کر رہی ہے کہ انہوں نے

اسّی برس عبادت کی، اللہ تعالیٰ نے آپ پر اس سے بھی بہتر چیز نازل کی ہے، پھر سورہ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ پڑھی، پھر فرمایا کہ یہ لیلۃ القدر اس سے افضل ہے جس پر آپ نے اور آپ کی امت نے تعجب کیا تھا۔ یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت مسرور ہوئے۔(۱)

یہ عظیم ومبارک رات کب آتی ہے؟ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس بارے میں چھیالیس (۴۶) اقوال اوران کے دلائل کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جمہور علما نے اس سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں ہوتی ہے، اوراس میں بھی طاق راتوں میں ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

« تحروا ليلة القدر في الوتر من العشر الاواخر من رمضان. »(۲)

''لیلۃ القدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو۔''

اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«التمسوها في العشر الاواخر من رمضان ليلة القدر في تاسعة تبقى في سابعة تبقى في خامسة تبقى .»(۳)

(لیلۃ القدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو، وہ نویں رات

---

(۱) درمنثور:۸/۵۶۸، روح المعانی:۳۰/۲۲۲،قرطبی:۲۰/۱۳۲

(۲) بخاری:۱۸۷۸،مسلم:۱۹۹۸،ترمذی:۷۲۳، احمد:۲۳۱۵۷

(۳) بخاری:۱۸۸۱،ابو داؤد:۱۱۷۳، احمد:۱۹۴۸

میں جو بچ جائے، ساتویں رات میں جو بچ جائے، پانچویں رات میں
جو بچ جائے نویں دن......"۔)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرۂ رمضان میں آتی ہے، نیز یہ بھی وارد ہوا ہے کہ آخری عشرہ میں بھی وتر یعنی طاق راتوں میں زیادہ امکان ہے۔

پھر بعض روایات میں ستائیس رمضان کی شب میں لیلۃ القدر ہونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ چناں چہ ابو داؤد نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے لیلۃ القدر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

«لیلة القدر لیلة سبع و عشرین.» (۱)

(لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہے۔)

اسی طرح بعض صحابہ سے بھی مروی ہے، چناں چہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ جانتے ہیں کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہوتی ہے اور رمضان کے اخیر عشرۂ میں ہوتی ہے اور یہ کہ وہ ستائیسویں رات میں ہوتی ہے، پھر خود قسم کھا کر فرمایا کہ وہ بلا استثنا و بلا تخلف ستائیسویں میں ہوتی ہے۔ (۲)

مگر چوں کہ دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ستائیسویں ہی میں یہ متعین نہیں ہے، چناں چہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بخاری میں ایک قول ستائیسویں کا اور دوسرا چوبیسویں کا مروی ہے، پھر علما نے ان کے اقوال کی توجیہ و تطبیق میں بھی لمبا کلام کیا ہے، پھر مسلم میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے دیکھا کہ لیلۃ القدر ستائیسویں میں ہے،

(۱) ابو داؤد :۱۱۷۸ (اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)
(۲) مسلم :۱۲۷۲، ابو داؤد :۱۱۷۰، ترمذی :۷۲۳

اس پر اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ مجھے بھی تمہاری طرح دکھایا گیا ہے،لہذا تم آخری عشرہ میں سے طاق راتوں میں اس کو تلاش کرو۔(۱)

اس میں اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ تسلیم کر کے کہ ستائیسویں میں لیلۃ القدر ہوئی، پھر بھی فرمایا کہ آخری عشرہَ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ معلوم ہوا کہ دوسری راتوں میں ہونے کا بھی امکان ہے،لہذا آخری عشرہَ میں تلاش جاری رکھنا چاہئے۔

(۳) روایات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس عطیۂ خداوندی سے مقصود یہ ہے کہ امتِ محمدیہ اس رات محض اللہ کی عبادت واطاعت میں لگی رہے اور ایک رات کے اس عمل سے پچھلی اُمتوں کے ان حضرات کا ثواب حاصل کرلے جنھوں نے اسّی اسّی برس اللہ کی عبادت واطاعت میں زندگی بسر کی ہے۔

اور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ترغیبات وتلقینات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس رات اللہ کی عبادت میں اشتغال وانہماک ہونا چاہئے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« من قام ليلة القدر ايمانا و احتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه. » (۲)

جو شخص لیلۃ القدر میں قیام کرے گا ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے،اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر میں قیام یعنی نماز،سب سے افضل عبادت ہے؛

---

(۱) مسلم:۱۹۸۷

(۲) بخاری:۳۴،مسلم:۱۲۶۸،ترمذی:۶۱۹،نسائی:۲۱۷۳،ابو داؤد:۱۱۶۵،احمد:۶۹۷۹

لیکن اگر کوئی دوسری عبادت میں بھی لگا رہے تو بھی مضائقہ نہیں۔

اس حدیث سے لیلۃ القدر میں عبادت واطاعت کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رغبت اسی لیے دلائی جاتی ہے کہ یہ کام اس موقع پر کرنے کا ہوتا ہے۔معلوم ہوا کہ یہ عبادت واطاعت کی رات ہے۔

اس کے علاوہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں لیلۃ القدر کو پاؤں تو اس میں کیا کہوں؟ فرمایا کہ یہ دعا کرو:

« اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا. » (۱)

اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے، لہذا ہم کو معاف فرما۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر میں ایک کام اللہ سے دعا مانگنا بھی ہے، جس میں عاجزی وانکساری، انابت وتوجہ الی اللہ کے عناصر شامل ہوں، ان مقاصد کے لیے ہمیں لیلۃ القدر عطا فرمائی گئی ہے۔

(۴) اس رات میں عبادت کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے جتنا اس کو ملتا ہے جو ہزار ماہ عبادت کرتا رہا۔ایک ہزار مہینے کے ۸۳ر برس اور چار ماہ ہوتے ہیں؛ مگر معلوم ہونا چاہئے کہ اس رات میں جس طرح نیکی کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، گناہ پر عذاب بھی زیادہ ہوتا ہے، بعض لوگ اس رات میں تفریح وہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں، بعض لوگ پوری رات خرید وفروخت کرکے گذار دیتے ہیں، یہ بڑی بری بات ہے۔

(۵) غنیۃ الطالبین میں ایک لمبی حدیث نقل کی گئی ہے:

(۱) ترمذی: ۳۴۳۵، ابن ماجہ: ۳۸۴۰، احمد: ۲۴۲۱۵

لیلۃ القدر میں اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام سدرۃ المنتہی کے ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ زمین پر آتے ہیں اور ان سب کے ہاتھوں میں نور کی جھنڈیاں ہوتی ہیں یہ فرشتے ان جھنڈیوں کو چار مقامات پر گاڑ دیتے ہیں، کعبۃ اللہ کے پاس، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس، بیت المقدس کے پاس اور کوہِ طور کے پاس، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام حکم دیتے ہیں کہ زمین پر منتشر ہو جاؤ، پس یہ فرشتے منتشر ہو جاتے ہیں اور ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔کوئی گھر کوئی پتھر، کوئی کشتی نہیں چھوڑتے جہاں کوئی مومن بندہ یا مومنہ بندی ہو۔سب جگہ چلے جاتے ہیں؛ مگر اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا خنزیر ہو، یا شراب ہو یا زنا کر کے کوئی ناپاک آدمی ہو یا جان دار کی تصویر ہو، یہ فرشتے اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کرتے اور امت محمدیہ کے لیے استغفار کرتے ہیں، جب صبح ہو جاتی ہے تو آسمانوں کی طرف چلے جاتے ہیں، (پھر آگے چل کر ہے) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے امت محمدیہ کے لیے میرے پاس ایسی چیزیں رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب پر اس کا خطرہ گذرا۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں جہاں ہوتی ہیں وہاں فرشتے نہیں آتے، اور اس عظیم رات میں بھی وہ گھر جہاں یہ چیزیں ہوں فرشتوں سے محروم ہوتا ہے اور وہاں کے لوگ ان کی دعاؤں سے محروم ہوتے ہیں۔

---

(۱) بہ حوالہ روح المعانی:۳۰/۲۲۵

عید وصدقۂ فطر

رمضان کے ختم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل اسلام کو ’’عید الفطر‘‘ کے عظیم وخصوصی تحفہ وعطیہ سے نوازا جاتا ہے، جو درحقیقت ان کے رمضان کے روزوں اور دیگر عبادات کے انعام کے طور پر ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

’’جب عید کی صبح ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیجتے ہیں اور فرشتے اتر کر تمام گلیوں اور راستوں پر کھڑے ہو جاتے اور پکار کر کہتے ہیں کہ اے امتِ محمد یہ اس کریم رب کی درگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے بڑے قصور معاف فرما دینے والا ہے، پھر جب لوگ عیدگاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ اس مزدور کا کیا بدلہ ہے جس نے پورا کام کیا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس کا بدلہ یہ ہے کہ اس کی پوری مزدوری دے دی جائے، اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے فرشتو! گواہ رہو کہ میں نے رمضان کے روزے اور تراویح کے بدلہ ان لوگوں کو اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی، پھر آخر حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے فرماتے ہیں کہ اب تم بخشے بخشائے لوٹ جاؤ، میں تم سے راضی ہو گیا‘‘۔(۱)

ایک اور حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور وہاں کے لوگوں کے نزدیک دو دن ایسے

(۱) مشکاۃ المصابیح:۱۸۱،شعب الایمان:۳/۳۳۵

تھے جن میں وہ کھیل کود کرتے تھے، آپ نے ان سے معلوم کیا کہ یہ دو دن کیا ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ان دو دنوں میں ہم زمانۂ جاہلیت سے کھیلتے آرہے ہیں، (یعنی عید مناتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهما يوم الاضحى ويوم الفطر.» (۱)

(اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان دو دنوں کے بدلہ ان سے بہتر دو دن عطا کئے ہیں، یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر۔)

اس سے معلوم ہوا کہ غیروں کی عید میں اور ہماری عید میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری عید اللہ کی جانب سے مقرر کی ہوئی ہے، اور غیروں کی عید ان کی اپنی ایجاد ہے۔

عید کے چند احکام وآداب

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن لال چادر پہنتے تھے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ عید کے دن زینت و تجمل کا اختیار کرنا سنت ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن لال چادر کا اہتمام فرماتے تھے، اور اس لال چادر سے مراد ایسی چادر ہے جس میں لال لال دھاریاں ہوں، پوری لال اس سے مراد نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں بیان فرمایا ہے۔

بہ ہر حال حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ عید کے دن زیب و زینت کا اہتمام کرنا

(۱) ابو داؤد:۱/۱۶۱، نسائی:۱/۲۳۱، اس کی سند صحیح ہے، بلوغ المرام:۳۵

(۲) مجمع الزوائد:۱/۲۲۱

چاہئے؛ مگراس میں غلو نہ کرے کہ صرف کپڑوں اور جوتوں کی فکر میں پڑا رہے؛ بل کہ اپنے کپڑوں میں سے جو عمدہ ہیں ان کو استعمال کرے جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا معمول امام بیہقی نے بہ سند صحیح نقل کیا ہے کہ وہ عیدین میں اپنے سب سے عمدہ و بہتر کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔(۱)

(۲) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر و عید الاضحیٰ میں غسل فرمایا کرتے تھے۔(۲)

اور حضرت فاکہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر و عید الاضحیٰ اور عرفہ کے دنوں میں غسل فرمایا کرتے تھے۔(۳)

فقہائے کرام نے بھی لکھا ہے کہ عید کے دن غسل کرنا مستحب ہے، اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن غسل فرماتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح جمعہ کے دن اجتماع ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے احادیث میں غسل کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، اسی طرح عید میں بھی اجتماع ہوتا ہے تو عید کے دن بھی اس کی بنا پر پاکی صفائی کا اہتمام پسندیدہ ہے۔(۴)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن نہیں جاتے تھے جب تک کہ کھجور نہ کھاتے تھے۔)(۵)

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر

---

(۱) فتح الباری:۲/۴۳۹

(۲) ابن ماجہ:۱۳۰۵

(۳) ابن ماجہ:۱۳۰۶،احمد:۱۶۱۲۱

(۴) قالہ صاحب الھدایہ:۱/۱۵۳

(۵) بخاری:۹۰۰،ترمذی:۴۹۸،ابن ماجہ:۱۷۴۴،احمد:۱۱۸۲۰

کے دن نہیں نکلتے تھے جب تک کہ نہ کھا لیتے اور عید الاضحیٰ میں کھاتے نہیں تھے جب تک کہ عید کی نماز نہ پڑھ لیتے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عید الفطر میں عید گاہ جانے سے قبل کچھ کھا لینا سنت ہے، بہتر یہ ہے کہ کھجور کھائیں اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین، پانچ یا سات کھجور کھاتے تھے یا اس سے کم یا زیادہ؛ مگر طاق عدد استعمال فرماتے تھے۔(۲)

لہٰذا طاق عدد کھجور استعمال کیے جائیں اور بعض علما نے مطلق میٹھی چیز کو مستحب قرار دیا ہے، ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بعض تابعین نے کسی بھی میٹھی چیز جیسے شہد کھانے کو پسند کیا ہے، اور ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن قرۃ اور ابن سیرین وغیرہ سے اس کو روایت کیا ہے۔(۳)

اور عید الفطر میں کھا کر جانے کی حکمت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ عید کی نماز تک روزہ لازم ہے، اور بعض نے یہ فرمایا کہ اس میں یہ حکمت ہے کہ روزوں کے بعد جب عید کے دن روزہ نہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا تو یہ بات مستحب قرار پائی کہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں جلدی کرتے ہوئے کچھ کھا لے۔(واللہ اعلم)

انتباہ: عید الفطر کی صبح عوام میں سویاں (شیر خورما) پکانے کا رواج ہے، اس کو ضروری خیال کرنا، اور عید کے دن اس کی تخصیص والتزام کرنا غلط ہے، حدیث سے تو کھجور کا ثبوت خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے، اگر میسر نہ آئے تو کسی اور میٹھی چیز کو استعمال

---

(۱) احمد:۱۱۸۲۰، ترمذی:۴۹۷، ابن ماجہ:۱۷۴۶

(۲) فتح الباری:۲/۴۴۷

(۳) فتح الباری:۲/۴۴۷

کیا جاسکتا ہے خواہ وہ شیر خورما ہو یا کچھ اور؛ مگر شیر خورما ہی کو مخصوص طور پر اہتمام والتزام کے ساتھ پکانا من گھڑت بات ہے، احقر نے اس مسئلہ پر اپنے رسالہ ’’منکرات رمضان‘‘ میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔

(۴) حضرت زہری سے مرسلاً روایت ہے کہ نبی کریم عید الفطر میں نکلتے تھے اور اپنے گھر سے نکلنے کے وقت سے پہلے عید گاہ جانے تک تکبیر پڑھتے تھے۔(۱)

ائمہ احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ عید گاہ کے راستے میں تکبیر کہتے ہوئے جانا چاہئے۔اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی تھا جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ نے بہ روایت دار قطنی و بیہقی نقل فرمایا ہے۔(۲)

(۵) حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ لوگوں کے ساتھ عید گاہ تشریف لے گئے عید الفطر یا عید الاضحیٰ کا موقعہ تھا، امام نے تاخیر کردی، تو فرمایا کہ ہم تو اس وقت تک فارغ ہو جایا کرتے تھے، اور یہ تسبیح (یعنی نفل نماز) کا وقت تھا۔(۳)

علما نے لکھا ہے کہ عید الاضحیٰ میں عید الفطر کی بہ نسبت جلدی جانا چاہیے، عید الفطر میں اس وقت جائے جب کہ سورج دو نیزے کی بہ قدر بلند ہو جائے اور عید الاضحیٰ میں اس وقت جب کہ سورج ایک نیزہ بلند ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے علاقوں میں جو عام طور پر عید الفطر کی نماز بہت تاخیر سے پڑھتے ہیں، یہ اچھا نہیں ہے اور عید الاضحیٰ کو تاخیر سے پڑھنا تو اور بُرا ہے۔

(۶) اصحاب صحاح اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

---

(۱) تلخیص الحبیر:۱/۴۳

(۲) الدرایہ مع الھدایہ:۱/۱۵۳

(۳) ابو داؤد:۹۶۰،ابن ماجہ:۱۳۰۷

"رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے عید کے دن دو رکعتیں (عید کی) پڑھیں اور ان سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھی اور نہ بعد میں پڑھی"۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عیدگاہ میں صرف دو رکعت عید کی نماز پڑھی جائے گی، کوئی اور نماز نہ اس سے پہلے ہے نہ اس کے بعد۔

(۷) حضرت ابوسعید خدری رَضِیَ اللهُ عَنْهُ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن عیدگاہ کی طرف نکلتے تھے الخ۔(۲)

ابن حجر رَحِمَهُ اللهُ نے فرمایا کہ اس حدیث سے عیدگاہ جانے کے استحباب پر استدلال کیا گیا ہے، اور اس پر کہ عید کی نماز عیدگاہ میں جا کر پڑھنا، مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔(۳)

البتہ کوئی عذر ہو تو مسجد میں بھی عید کی نماز ادا کی جاسکتی ہے جیسے حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ سے مروی ہے:

ایک دفعہ بارش ہوگئی تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے عید کی نماز مسجد میں پڑھائی۔(۴)

(۸) حضرت علی رَضِیَ اللهُ عَنْهُ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ عید کے لیے پیدل جائے اور جانے سے پہلے کچھ کھالے۔(۵)

اسی طرح حضرت سعد رَضِیَ اللهُ عَنْهُ، حضرت ابن عمر رَضِیَ اللهُ عَنْهُ وغیرہ سے بھی روایت ہے

---

(۱) بلوغ المرام:۳۵
(۲) بخاری:۱۳۶۹،نسائی:۱۵۵۸
(۳) فتح الباری:۲/۴۵۰
(۴) ابوداود:۹۸۰،ابن ماجہ:۱۳۰۳
(۵) ترمذی:۴۸۷

کہ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عید کے لیے پیدل جایا کرتے تھے۔(۱)

(۹) حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عید گاہ کو ایک راستہ سے جاتے اور دوسرے راستہ سے واپس ہوتے۔(۲)

اس میں کیا حکمت ہے؟ ابن حجر رَحِمَہُ اللہُ نے علما سے بیس سے زائد اقوال اس سلسلہ میں ذکر کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل اسلام کی شان وشوکت بتانے کے لیے ایسا فرمایا کہ لوگ جب دیکھیں گے کہ مسلمان ادھر کے راستہ پر بھی تھے، اب یہاں بھی ہیں تو کثرت سے مرعوب ہوں گے، ایک حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ راستہ گواہ بن جائے، جہاں جہاں سے اللہ کے لیے گذرنا ہوگا وہ راستہ چلنے والے کے حق میں گواہی دے گا۔(واللہ اعلم)

(۱۰) ابن حجر رَحِمَہُ اللہُ نے حضرت جبیر بن نفیر سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ عَنْہُم جب عید کے دن ملاقات کرتے تو آپس میں ایک دوسرے کو یوں کہتے ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْکَ''، یعنی اللہ ہمارے اور تمہارے اعمال کو قبول کرے۔(۳)

امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ ادھم جو حضرت امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز کے غلام تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز کو عیدین کے موقعہ پر ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْکَ یَاأَمِیْرَ الْمُؤمِنِیْنَ'' کہتے تھے اور آپ یہی جملہ ہم کو جواب میں کہتے اور اس پر نکیر نہ کرتے تھے۔

معلوم ہوا کہ عیدین کے موقعہ پر صحابہ اور ہمارے اسلاف آپس میں اس طرح

---

(۱) ابن ماجه:۱۲۸۴

(۲) بخاری:۹۳۳، ترمذی:۴۹۶، ابن ماجه:۱۲۹۱، احمد:۸۱۰۰

(۳) فتح الباری:۲/۴۴۶، یہ روایت حسن ہے۔

ایک دوسرے کو دعا دیتے تھے، لہذا ہمیں بھی اسی کو اختیار کرنا چاہئے یہی بڑی مبارک بادی ہے، اور کوئی عید مبارک کہتا ہے تو اس کا بھی حاصل یہی ہے؛ لیکن اسلاف کے الفاظ میں بھی برکت ہوتی ہے۔

صدقۂ فطر

رمضان جب ختم ہوتا ہے اور عید کا دن آتا ہے، تو رمضان کے شکریہ میں عید گاہ جانے سے پہلے صدقہ فطر بھی ادا کرنا ضروری ہے۔ پہلے چند حدیثیں ملاحظہ کیجئے:

(۱) حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

"فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم زَكَاةَ الفِطْر صَاعاً مِن تَمرٍ أو صَاعاً مِن شَعِيرٍ عَلَى العَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالأُنْثٰى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِير مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَمَرَ بهَا أَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلاةِ "(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو کو مسلمانوں میں سے ہر غلام و آزاد، مرد و عورت، بچے اور بوڑھے پر صدقۂ فطر میں دینا فرض قرار دیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ لوگوں کے عید کی نماز کو نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔)

(۲) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین قسم کی چیزوں سے صدقۂ فطر ہر چھوٹے اور بڑے، آزاد و غلام کی

(۱) بخاری: ۱/۲۰۴، رقم: ۱۴۳۲، مسلم: ۱/۳۱۷، رقم: ۹۸۴، و ۹۸۶، ابو داود: ۱۶۱۱، نسائی: ۲۵۰۴، صحیح ابن خزیمہ: ۴/۸۷ وغیرہ

طرف سے نکالتے تھے، ایک صاع کھجور، ایک صاع پنیر اور ایک صاع جو، ہم اسی طرح نکالتے تھے یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گیہوں کا آدھا صاع کھجور کے ایک صاع کے برابر ہے، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں پہلے جیسا نکالتا تھا ویسا ہی نکالوں گا۔ (۱)

فوائد ومسائل

(۱) پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ گھر کے ہر چھوٹے بڑے، غلام وآزاد پر صدقۂ فطر ہے، البتہ نابالغ اولاد کی طرف سے خود ان کے مال سے یا اپنے مال سے جب کہ ان کا مال نہ ہو، باپ ادا کرے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کھجور یا جو کے حساب سے ایک صاع صدقۂ فطر میں دینا چاہیئے اور دوسری حدیث سے بھی اس کا علم ہوا۔

اور دوسری حدیث سے مزید یہ معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام طور پر صرف تین چیزوں سے صدقۂ فطر نکالا جاتا تھا، کھجور، پنیر اور جو، مگر بعد میں جب گیہوں کا عام رواج ہوگیا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کھجور کے ایک صاع کا مقابلہ گیہوں کے آدھے صاع سے ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ گیہوں مہنگی ہے، لہذا اکثر صحابہ وتابعین نے اسی کو اختیار فرمایا، البتہ بعض صحابہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا، اور فرمایا کہ نہیں ہم گیہوں سے بھی ایک ہی صاع دیں گے، لہذا یہ اختلافی مسئلہ ہے، احناف نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل اختیار فرمایا ہے، لہذا گیہوں نصف صاع یا اس کی قیمت صدقۂ فطر میں دینا چاہئے۔

---

(۱) بخاری:۱۴۱۲، مسلم:۱۶۴۱، نسائی:۲۴۶۵، ابو داؤد:۱۳۷۷، ترمذی:۶۰۹، ابن ماجہ:۱۸۱۹، احمد:۱۱۴۹۶

اب رہی یہ بات کہ نصفِ صاع آج کے حساب سے کتنے کلو ہوتے ہیں؟ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہ نے اپنے رسالہ ’’اوزان شرعیہ‘‘ میں اس کی تحقیق کر کے بتایا ہے کہ نصفِ صاع پونے دوسیر کے برابر ہوتا ہے اور اس کو اگر کلو، گرام کے حساب میں تبدیل کریں تو پونے دوکلو سے کچھ کم ہوتے ہیں، اور احتیاطاً پونے دوکلو دے دینا چاہئے، جیسا کہ میرے استاذ حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب زید مجدہ نے اپنے رسالہ ’’امدادالاوزان‘‘ میں تحقیق فرمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو بعض چارٹ میں صدقۂ فطر کی مقدار سوا دوکلو یا ڈھائی کلو لکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے، البتہ کوئی اپنی خوشی سے زیادہ دے دے، تو درست ہے؛ مگر وجوب صرف پونے دوکلو کا ہوگا۔

(۲) نیز اس پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر نماز عید کو جانے سے پہلے ادا کرنا چاہئے۔ایک حدیث میں ہے کہ جس نے صدقہ فطر نماز عید سے پہلے ادا کیا تو وہ صدقہ مقبولہ ہے، اور جو بعد نماز ادا کرے ،تو وہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہے۔(۱)

لہذا عیدگاہ جانے قبل صدقہ دینا چاہئے ،اگر کسی نے عیدگاہ جانے سے قبل ادا نہ کیا تو اس سے یہ معاف نہ ہوگا؛ بل کہ بعد میں دینا پڑے گا۔(۲)

اگر صدقۂ فطر عید سے دوتین دن پہلے ہی دے دیں تو اور اچھا ہے، کیوں کہ اس میں مساکین وفقرا کے لیے سہولت ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا پہلے سے انتظام کر سکیں گے، اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ ایک دودن پہلے صدقۂ فطر ادا کر دیتے تھے۔

(۱) ابو داود:۱۳۷۱،ابن ماجہ:۱۸۱۷

(۲) ھدایہ:۱/۱۹۱

چناں چہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت نافع سے نقل کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں صدقۂ فطر ایک دودن پہلے دے دیا جاتا تھا۔(۱)

فتح الباری میں ہے کہ ابن خزیمہ کی روایت میں آیا ہے کہ ایوب رضی اللہ عنہ نے نافع سے پوچھا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ صدقۂ فطر کب تک ادا کرتے تھے، نافع نے فرمایا کہ جب صدقہ وصول کرنے والا عامل وصولی بند کرتا اس وقت تک ادا کردیتے، پوچھا کہ عامل کب بند کرتا تھا، بتایا کہ عید سے ایک یا دودن پہلے۔(۲)

اور امام مالک رحمہ اللہ کی موطا میں یہ روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ وصول کرنے والوں کے پاس صدقۂ فطر عید سے دوتین دن قبل بھیج دیتے تھے۔(۳)

(۳)صدقۂ فطر ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو آزاد ہو اور حاجت اصلیہ سے زائد نصاب کا مالک ہو اور نصاب وہی ہے جو زکاۃ کا ہے یعنی ساڑھے سات تولے (یعنی ۸۷ گرام، ۴۷۹ ملی گرام) سونا یا ساڑھے باون تولے (یعنی ۶۱۲ گرام، ۳۵ ملی گرام) چاندی ہو یا اس کے برابر روپیہ پیسہ ہو، یا زائد از ضرورت مال سامان ہو، تو اس پر صدقۂ فطر واجب ہے، اگرچہ اس پر ایک سال نہ گزرا ہو، اور اگر چہ وہ مال تجارت کا بھی نہ ہو۔(۴)

(۴)اگر کسی کے پاس زکاۃ کے مال کے برابر مال واسباب ہے؛ لیکن وہ اس کی ضرورت کا ہے، زائد نہیں، تو اس پر صدقہ فطر واجب نہیں۔(۵)

---

(۱) بخاری:۱/ ۲۰۵
(۲) فتح الباری:۳/ ۳۷۶
(۳) فتح الباری:۳/ ۳۷۶
(۴) البحر الرائق:۲/ ۲۷۱،درمختار مع شامی:۲/ ۲۶۰
(۵) البحر الرائق:۲/ ۲۷۱،درمختار مع شامی:۲/ ۲۶۰

(۵) اگر کوئی قرض دار ہے تو قرض کے علاوہ جو مال ہے وہ اگر زکاۃ کے مال کے برابر ہے، تو صدقہ فطر واجب ہے، ورنہ نہیں۔(۱)

(٦) بہتر ہے کہ عید گاہ جانے سے پہلے صدقہ دے دے، اگر پہلے نہ دیا تو بعد میں دے دے، یہ معاف نہیں، کبھی نہ کبھی اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔

(۷) صدقہ فطر اپنی طرف سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے دینا واجب ہے، بالغ اولاد کی طرف سے دینا واجب نہیں؛ بل کہ وہ خود اگر مال دار ہیں تو اس پر واجب ہے، البتہ بالغ اولاد میں کوئی پاگل ہو تو باپ اس کا بھی صدقہ فطر نکالے گا۔(۲)

(۸) کسی نے رمضان میں صدقہ فطر دے دیا تو بھی ادا ہو گیا، دوبارہ دینا واجب نہیں۔(۳)

(۹) جو رمضان کے روزے نہ رکھ سکا، اس پر بھی یہ صدقۂ فطر واجب ہے۔(۴)

(۱۰) صدقہ فطر میں پونے دو سیر گیہوں یا گیہوں کا آٹا یا ستو یا ستو کا آٹا دینا چاہئے، یا اتنی قیمت دینا چاہئے؛ بل کہ یہی بہتر ہے، (اس کی تحقیق اوپر گذر چکی ہے)

(۱۱) صدقہ فطر ان لوگوں کو دینا چاہئے جن کو زکاۃ دینا درست ہے، یعنی فقیر، مسکین، مسافر وغیرہ، اور جو سید ہوں یا مال دار ہوں ان کو جس طرح زکاۃ دینا جائز نہیں اسی طرح ان کو صدقہ فطر دینا جائز نہیں، اسی طرح ماں باپ کو، اولاد کو میاں بیوی کو، دینا بھی جائز نہیں، ہاں! کافر کو صدقہ فطر دینا بعض کے نزدیک جائز ہے، اور بعض

---

(۱) البحر الرائق:۲/ ۲۷۱، درمختار مع شامی:۲/ ۲٦۰

(۲) البحر الرائق:۲/ ۲۷۱، درمختار مع شامی:۲/ ۲٦۱

(۳) البحر الرائق:۲/ ۲۷۵

(۴) درمختار مع شامی:۲/ ۳٦۱

کے نزدیک ناجائز ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ ان کو نہ دیا جائے۔(۱)

(۱۲) ایک آدمی کا صدقہ فطر ایک فقیر کو دینا یا تھوڑا تھوڑا کئی فقیروں کو دینا یا کئی آدمیوں کا صدقہ فطر ایک ہی فقیر کو دینا سب درست ہے؛ لیکن کئی آدمیوں کا صدقہ مل کر اتنا نہ ہو جائے جو نصابِ فطر یا نصابِ زکاۃ کے برابر ہو۔(۲)

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

(۱) درمختار مع شامی:۲/۳۶۹

(۲) البحر الرائق:۲/۲۷۵